یہ سنت کے سوشل اصولوں کی کتاب ہے۔ مذہبی کتاب نہیں ہے

اُسوۂ حسنہ

رحمت اللعالمین ﷺ کا رول ماڈل

آئیے ان سنتوں پر بھی عمل کریں جن کو ہم سنت ہی نہیں سمجھتے

- نبی کریم ﷺ سے محبت کیسے کی جانی چاہیے؟
- کیا ہم کلمہ شہادت کی گواہی پر سچے اترتے ہیں؟
- غور و فکر بہت ہی اہم سنت ہے
- آہستہ آہستہ عادات کی تبدیلی یا احکام کا نفاذ سنت ہے۔
- لگاتار دینی اور دنیاوی ترقی کرنا بھی سنت ہے
- جفاکشی سنت ہے۔
- امانت اور دیانت۔
- ملک کے ساتھ محبت کرنا سنت ہے
- حضور اکرم ﷺ کا مشن کیا تھا؟
- جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے کرو، یہ بھی سنت ہے۔
- سب سے آسان حل تلاش کرنا بھی سنت ہے
- عادات اور اعمال میں استقلال رکھنا اہم سنت ہے
- عملیت پسندی یا پریکٹیکل ہونا بھی آپ کی سنت ہے
- سچ ...... سب سے اہم سوشل سنت۔
- وعدہ نبھانا بھی اہم سنت ہے۔
- ملک کے باشندوں سے محبت بھی سنت ہے

گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی

سچ کی تلاش

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے سیرت النبیؐ کی طرف رجوع کی ضرورت

اُسوۂ حسنہ

رحمت اللعالمین ﷺ کا رول ماڈل

﴿ آیئے ان سنتوں پر بھی عمل کریں جن کو ہم سنت ہی نہیں سمجھتے ﴾

یہ سنت کے سوشل اصولوں کی کتاب ہے۔ مذہبی کتاب نہیں ہے۔

گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی

میٹرکس پبلی کیشنز

اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

فون: 051-5555820,Cell:0300-5211201

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول کریمؐ پر درود و سلام کے بعد اللہ تعالیٰ سے

ہدایت و رہنمائی کے ساتھ کتاب شروع کرتا ہوں۔

نام کتاب	:	اُسوۂ حسنہ، رحمۃ للعالمینؐ کا رول ماڈل (آیئے بھولی ہوئی سنتوں پر عمل کریں)
مصنف	:	گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی
ڈسٹری بیوٹر	:	پاک بک ہاؤس، پلازہ نمبر ۶۷، کمرشل ۲، مین روڈ، گلشن آباد اڈیالہ روڈ، راولپنڈی، 051-2314102
ای مارکیٹنگ	:	kitabidunya.com.pk
ای مارکیٹنگ	:	kutab.com.pk
تعداد	:	500
موسمِ اشاعت	:	مارچ 2018
مطبع	:	محمود برادرز، گوالمنڈی، راولپنڈی
قیمت	:	**600** روپے

ISBN:978-969-9247-14-9

کتاب ملنے کے پتے:

راولپنڈی:
- ☆ اشرف بک ایجنسی، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
- ☆ احمد بک کارپوریشن، عالم بزنس سنٹر، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
- ☆ کتاب گھر، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
- ☆ رائل بک ایجنسی، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
- ☆ رمیل پبلی کیشنز، اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

اسلام آباد
- ☆ ملت پبلی کیشنز، فیصل مسجد، اسلام آباد

لاہور:
- ☆ مکتبہ تعمیر انسانیت، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

ملتان:
- ☆ بک مارک بک کلب، ۱۰۳ گولڈ کریسنٹ پلازہ، عظمت واسطی روڈ، ملتان

خوبصورت اور معیاری کتاب ارزاں نرخوں پر چھپوانے کیلئے ہم سے رابطہ کریں۔ 0300-5211201

جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ادارہ)

نوجوان نسل کے نام

جن کے اوپر پاکستان، کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار ہے
اور نشاۃِ ثانیہ کردار اور اخلاق سے شروع ہوتی ہے۔

حسنِ کردار سے نورِ مجسم ہو جا
کہ ابلیس بھی تجھے دیکھے تو مسلمان ہو جائے

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی
میں

یہ کتاب

☆ ہمیں بہترین انسان اور مسلمان بننے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

☆ گڈ گورنس اور بہترین ایڈمنسٹریٹر اور منیجر بننے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔

☆ انسانی تعلقات کو بہترین بنانے اور ہر فیلڈ میں اخلاقی ترقی کا نسخہ ہے۔

☆ قیامت میں اعمال گنے نہیں جائیں گے بلکہ تولے جائیں گے اور سب سے وزنی اعمال اخلاق والے اعمال ہوں گے: **"ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی۔"** اگر قیامت میں حساب کے دن اپنے تول بھاری کرنے ہیں تو پھر کردار اور اخلاق پر زور دیں۔ اسی میں اپنا بھلا ہوگا۔

☆ ہم نے ترجیحات غلط کر دی ہیں جبکہ عبادت اور غور و فکر کی نسبتاً اہمیت اور وزن دیکھیں: تفکر ساعہ خیر من عبادۃ ستینہ "یعنی ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

☆ یہ کتاب دوست احباب کے لیے بہترین تحفہ بن سکتی ہے۔

ترتیب

☆...... تعارف 09

☆...... حرف حرف خوشبو 11

☆...... پیش لفظ 15

☆...... افتتاحیہ 16

☆...... سیرت کی کتاب کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ 27

۱۔ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر محبت کس طرح کرنی ہے اس کی سمجھ نہیں آ رہی۔ 29

۲۔ نبی کریم ﷺ سے محبت کیسے کی جانی چاہئے؟ 31

۳۔ حضور اکرم ﷺ کا مشن کیا تھا؟ 34

۴۔ کیا ہم کلمہ شہادت کی گواہی پر سچے اترتے ہیں؟ 39

۵۔ نقل ہی سیکھنے کا فطری طریقہ ہے۔ 45

۶۔ معلم بن کر سکھانا ہی سنت ہے۔ 53

۷۔ اسلامی تہذیب اور کلچر کی بنیاد بچپن کی تربیت سے رکھی جاتی ہے۔ بڑے ہو کر نہیں 60

۸۔ معلم بن کر مسلمانوں کی دنیا سنوارنے کی تعلیم اور تربیت دینا سنت ہے۔ 70

۹۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے کرو۔ یہ بھی سنت ہے۔ 75

۱۰۔ غور و فکر بہت ہی اہم سنت ہے **80**

۱۱۔ علم میرا ہتھیار ہے، صفات نبوی کی سنت ہے۔

Knowledge is my arms 87

۱۲۔	سب سے آسان حل تلاش کرنا بھی سنت ہے	93
۱۳۔	تدریج؛ آہستہ آہستہ عادات کی تبدیلی یا احکام کا نفاذ سنت ہے۔	98
۱۴۔	عادات اور اعمال میں استقلال رکھنا اہم سنت ہے	102
۱۵۔	اچھا مقصد کر عمل اور کسی مخالفت پر ردعمل ظاہر نہ کرنا سنت ہے۔	106
۱۶۔	لگاتار دینی اور دنیاوی ترقی کرنا بھی سنت ہے	108
۱۷۔	عملیت پسندی یا پریکٹیکل ہونا بھی آپؐ کی سنت ہے	111
۱۸۔	اللہ تعالیٰ ہر بندے کو کسی کام یا مقصد کے لیے پیدا کرتا ہے پھر اس کے مطابق اسے تیار کرتا ہے	115
۱۹۔	زندگی کے رول کو پوری ذمہ داری اور خلوص سے ادا کرنا بھی سنت ہے۔	118
۲۰۔	جفاکشی سنت ہے۔	121
۲۱۔	سچ......سب سے اہم سوشل سنت۔	125
۲۲۔	امانت اور دیانت۔	130
۲۳۔	وعدہ نبھانا بھی اہم سنت ہے۔	138
۲۴۔	سب سے بنیادی سنت انسانوں سے انسانیت کی بنا پر محبت اور رحمت بننا ہے۔	143
۲۵۔	انسانی مساوات پریکٹس کرنا بھی بہت اہم سنت ہے	150
۲۶۔	انصاف یا عدل بھی اہم معاشرتی سنت ہے	154
۲۷۔	انسانوں کے مختلف ہونے کو نفرت کا باعث نہیں بنایا جا سکتا۔	159
۲۸۔	ملک کے ساتھ محبت کرنا سنت ہے	163
۲۹۔	ملک کے باشندوں سے محبت بھی سنت ہے	173
۳۰۔	تواضع بھی بہت بڑی اہم سنت نبوی ہے	178
۳۱۔	تکبر یا دوسروں سے ممتاز بننے کی خواہش سنت کے خلاف ہے۔	184
۳۲۔	حکمت سیکھنا بھی سنت ہے	189

۳۳۔ سب مخلوقات کی خیر خواہی بھی سنت ہے 192

۳۴۔ ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزارنا بھی سنت ہے 196

۳۵۔ مرنے تک بھلائی کے کام کرتے رہنا بھی سنت ہے 198

۳۶۔ مال دار ہونے کے باوجود سادہ زندگی گزارنا یعنی رضا کارانہ فقر ہی سنت ہے 204

۳۷۔ لوگوں کو ان کے مراتب کے مطابق عزت دینا سنت ہے 207

۳۸۔ حقیقت پسندی اور اصول پرستی بھی بہت اہم سنت ہے 211

۳۹۔ صرف تین دفعہ دستک دینا یا گھنٹی بجانا سنت ہے 215

۴۰۔ برائی کو برائی سمجھتے رہنا بھی سنت ہے۔ 218

۴۱۔ صرف نیک کام کے سوچنے پر بھی ایک نیکی کا ثواب مل جاتا ہے۔ 221

۴۲۔ سٹینڈرڈ S.O.P procedures بنانا بھی سنت طریقہ ہے 225

۴۳۔ سسٹم بدلنا ہو تو پرانے سسٹم کو مت ختم کریں جب تک دوسرا سسٹم فنکشنل
نہ ہو جائے۔ یہ بھی سنت طریقہ ہے 230

۴۴۔ یادداشت پر مت بھروسہ کریں، ہر چیز لکھ لینا سنت ہے۔ 234

۴۵۔ خط کا جواب دینا سنت ہے 240

۴۶۔ وقت کی اہمیت اور پروگرام بنانا، یہ بھی سنت نبوی ہے 243

۴۷۔ فارغ وقت کا صحیح استعمال سنت بھی ہے اور اللہ کا حکم بھی 247

۴۸۔ صحت کے لیے وقت کا پروگرام بنانا بھی سنت ہے 254

۴۹۔ کھانے کے بعد پلیٹ صاف کرنے کی حکمت 260

۵۰۔ ہم اللہ کی نعمت پانی ضائع کرنے والی قوم بھی ہیں، اسکا بھی حساب ہوگا۔ 265

۵۱۔ احسان مندی 267

۵۲۔ مہربانی، شکریہ، اور سوری کہنا سنت ہے۔ 269

۵۳۔ ''صفائی نصف ایمان ہے'' (حدیث) 275

۵۴۔ ردعمل سے بچنا سنت ہے 279

۵۵۔ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا بھی سنت ہے۔ 282
۵۶۔ ہمہ وقت ہر ایک کو معاف کرتے رہنا ہی نبی کریمؐ کی بہت بڑی سنت ہے۔ 286
۵۷۔ مفت خوری کی اسلام میں اجازت نہیں۔ 331
۵۸۔ آداب سکھانا بھی سنت ہے۔ 335
۵۹۔ قبرستان کو ظاہری طور پر خوبصورت بنانا بھی سنت ہے 355
۶۰۔ سفر میں امیر بنانا سنت ہے 356
اختتامیہ 358

ضمیمہ جات

تحت الشعور کیسے کام کرتا ہے؟ 365
ہر ایک شعوری اور غیر شعوری فعل عمل کرتے ہیں 379
عادات کے قدرتی اصول 387
امریکہ کے لاء کالج میں میثاقِ مدینہ پر سبق کی پلاننگ 394
ریفرنس، حوالہ جات 398

تعارف

محترم جناب گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی صاحب نے پاک فضائیہ میں ایک عرصے تک ملازمت کے دوران جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوکر ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے محافظ بنے رہے۔وطن کی محبت کا اصل محرک دراصل وہ نظریہ تھا جوان کے قلب وذہن میں سرایت کیے ہوئے تھا اس لیے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وطن عزیز پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت پر کمر بستہ ہو گئے اور اسلام کے بنیادی موضوعات پر عام فہم انداز میں کتب مرتب کیں۔آپ کی محنت کا شاہکار ''تحریری وصیت نامہ'' تو دین کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے والی انتہائی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔

امتیاز علی صاحب نے حال ہی میں ایک اور تحقیقی کام بعنوان ''اُسوۂ حسنہ، رحمۃ للعالمین ؐ کا رول ماڈل'' (آئیے بھولی ہوئی سنتوں پر عمل کریں) کیا ہے جو کہ قابل ستائش ہے۔اہل علم سے درخواست ہے کہ سنت کو فقہی اصطلاح کے مفہوم میں مقید کرنے کی بجائے اسوۂ حسنہ کے وسیع مفہوم کو پیش نظر رکھ کر ان کی مرتب کردہ کتاب ''سیرت رحمۃ للعالمین۔آئیے بھولی ہوئی سنتوں پر عمل کریں'' کا مطالعہ کریں۔انہوں نے کتب احادیث اور سیرت سے ان سوچوں اور اعمال اور عادات کی نشاندہی کی ہے جن کو اختیار کرنے سے ایک طرف ہمارا تعلق نبی ﷺ سے مضبوط ہوگا اور دوسری طرف ہماری عملی زندگی میں عظیم انقلاب برپا ہوگا جو ہماری دنیا وآخرت سنوارنے کا ذریعہ بنے گا۔ان شاءاللہ۔

انہوں نے سیرت طیبہ پر کام کرنے کے حوالے سے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے اپنے شعبے میں رسول اللہ ﷺ کی فراہم کردہ رہنمائی کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیسی جامع ہدایات دی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''ہر مضمون کے عام مسلمان ماہرین سیرت پر مکمل ریسرچ کریں جیسے اساتذہ سنت کی روشنی میں تعلیم اور تربیت کے ماڈرن طریقے کا موازنہ کریں۔ڈپلومیٹ نبی کریم ﷺ کی کامیاب ڈپلومیسی کے اصول نکالیں اور شیئر کریں۔فوجی نبی کریم ﷺ کی جنگی حکمت عملی سے نتائج نکالیں،

سوشل سائینٹسٹ مسلمان معاشروں کی معاشرتی تنظیم نو کے اصول واضح کریں کیونکہ میرے خیال میں مسلمانوں کے زوال اور پھر ترقی نہ کر سکنے میں سوشل تنظیم کا سینس نہ ہونا بہت اہم وجہ ہے"

اس دور کا المیہ یہ ہے کہ انسانوں نے زندگی کے حصے بخرے کر لیے گئے ہیں۔ مثلاً نجی زندگی کے تین شعبے عقائد، عبادات اور سماجی رسومات انفرادی خانے میں رکھ دیے گئے ہیں اور انفرادی زندگی میں انسان آزاد ہے جو چاہے عقیدہ رکھے، جیسے چاہے عبادت کرے، ایک اللہ کو مانے یا سینکڑوں ہزاروں کو مانے یا کسی کو بھی نہ مانے۔ البتہ اجتماعی زندگی کے تینوں شعبوں معاشرت، معیشت اور سیاست میں کسی مذہب کی عمل داری کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسلام اس تقسیم کو مسترد کرتا ہے۔ نبی علیہ السلام کا کمال یہ ہے کہ آپ نے زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام شعبوں میں اپنا بہترین نمونہ عمل چھوڑا ہے۔

جہاں تک زندگی کے اخلاقی پہلو کا تعلق ہے وہ تو دراصل اسلامی احکام، چاہے انفرادی ہوں یا اجتماعی، پر عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو ہر سطح پر نظر آئے گا۔ اخلاقی پہلو سے اگر مسلمان کمزور نظر آئیں تو سمجھ لیا جائے کہ وہ شدید ضعف ایمانی کا شکار ہیں اور جب تک ان کی ایمانی کیفیت بہتر نہیں ہوتی اس وقت تک وہ اخلاقی اعتبار سے پست ہی رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کی تعلیمات کو اپنایا جائے جس طرح نبی ﷺ نے اپنے دور میں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ ایک ایسے معاشرے کی صورت میں ہمارے سامنے آئے گا کہ جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا مکمل طور پر اہتمام ہوگا اور زمین کے اوپر اس سے بہتر کوئی اور معاشرہ نظر نہیں آئے گا۔

محترم امتیاز علی صاحب کی سیرت مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے زیر نظر تالیف اسلامی معاشرت کو بروئے کار لانے میں ان شاء اللہ مفید ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مؤلف محترم کو بہترین صلہ عطا فرمائے اور سارے مسلمانوں کو نبی ﷺ کی سچی پیروی نصیب فرمائے اور اسلام کے جملہ احکام کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں اپنانے کی توفیق بخشے۔

اٰمین یا رب العلمین. فصلی الله علی رسوله رحمة اللعلمین

ونگ کمانڈر (R)

ڈاکٹر ضمیر اختر خان

سابق ڈائریکٹر موٹیویشن اینڈ ریلیجس افیئرز پاکستان، ایئر فورس

حرف حرف خوشبو

ایک دن نبی کریم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے ارد گرد صحابہ کرام کا جھرمٹ تھا۔ سب اپنے آقا کریم ﷺ کی میٹھی میٹھی باتیں سن رہے تھے کہ ایک یہودی کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے سوچا کیوں نا تھوڑی سی جاسوسی کرلوں کہ یہ محمد ﷺ اپنے صحابہ کو کیا بتا رہا ہے۔ یہودی چپکے سے بغیر آہٹ کیے مسجد کے دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس روز آقا کریم ﷺ اپنے ان پیاروں کو پانی پینے کے آداب بتا رہے تھے۔ صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی ان سنتوں کو بڑے غور سے سن کر ذہن نشین کر رہے تھے۔ یہودی نے کچھ باتیں سنی اور گھر چلا گیا۔ رات کے آخری پہر پیاس کی شدت نے ستایا تو اٹھ کر پانی پینے چلا. برتن میں پانی ڈالا اور پینے کے لیے منہ لگانے لگا تو یاد آیا کہ محمد ﷺ نے اپنے اصحاب کو فرمایا تھا پانی پینے سے قبل برتن اور پانی کو دیکھ لیں۔ کہ کیا دونوں صاف ہیں۔ چنانچہ وہ برتن کو روشنی کے قریب لے گیا اور غور سے برتن کو دیکھنے لگا۔ برتن میں ایک زہریلا کیڑا پانی میں تیر رہا تھا اس نے فوراً وہ برتن پھینکا اور کہنے لگا۔ محمد ﷺ سچا اور محمد ﷺ کا خدا بھی سچا۔ جس دین کی ایک بات سے زندگی بچ جائے اس کی باقی باتیں کتنی حسین ہونگیں۔ صبح ہوتے ہی وہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اپنی گستاخیوں کی معافی مانگ کر اسلام قبول کر لیا۔

جی ہاں! یہ وہی اسلام کی صداقت اور حقانیت ہے۔ اسلام آج سے پندرہ سو سال پہلے بھی ماڈرن تھا اور آج بھی ماڈرن ہے۔ جب لوگوں کو پانی پینے اور کھانا کھانے کا طریقہ تک نہ آتا تھا اس وقت اسلام نے جینا سیکھایا۔ آئیں ذرا اس واقعہ پر غور کریں۔ اگر ایک سنت سے زندگی بچ جاتی ہے تو باقی سنتوں سے زندگی کس قدر حسین ہو سکتی ہے۔

آج ہم لوگ احساس کم تری کا شکار ہیں اور اس قدر کہ دوسروں کے طرز زندگی کو اپنانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ درحقیقت امتیاز علی صاحب نے اسی زاویہ فکر پر کام کیا ہے اور انہوں نے اپنے آقا کریم ﷺ کی سنتوں کو اس ماڈرن سسٹم کے مطابق پیش کرنے کی لاجواب

کوشش کی ہے اور وہ اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مزید آپ کتاب کو دیکھ کر خود فیصلہ کر لیں گے۔ اس نوعیت کی کوشش پہلے بھی کئی رائیٹرز نے کی ہے مگر جس نہج پر آپ نے کام کیا ہے اس کا زاویہ ہی کچھ مختلف ہے۔ میرے خیال میں جدید خطوط پر مشتمل اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ مجھے حضرت حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی یہ نظم طلوع اسلام یاد آ گئی۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں سر تاج دارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

مگر وہ علم کے موتی ،کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

آج سے چودہ سو سال پہلے جب جراثیم کا تصور بھی نہیں تھا تب بھی اسلام نے برتن کی صفائی ،جسم کی طہارت کے اصول متعارف کروائے۔ اسلام تب بھی ماڈرن تھا آج بھی ماڈرن ہے۔ جب لوگوں کو پانی پینے کا طریقہ نہیں آتا تھا تب اسلام نے انہیں پانی پینے کے وہ اصول بتائے جو آج سائنس بتا رہی ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بے یقین لوگوں نے اسلام جیسے عظیم مذہب کو گھر کا مسئلہ بنا دیا۔ اس نظریہ سے اجتناب کریں۔ امید بھی ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ نظریہ بدل جائے گا۔ آپ اسلام کے معاشی ،معاشرتی ،سیاسی اور مالی ہر نظام سے اس حوالہ سے اتفاق کریں گے کہ یہ صرف ایک مذہب نہیں بلکہ جینے کا ایک مکمل نصاب ہے جس میں زندگی گزارنے کا ہر طور طریقہ ہے ہم ان اطوار کو اپنا لیں تو ہمیں کسی غیر سے متاثر نہیں ہونا پڑے گا۔

لیکن یہاں ایک بات اور خاص بات عرض کروں کسی شخص کے دینی معاملات میں

بے عملی یا سستی یا کوتاہی کو دیکھ کر اسلام کی تصویر مت بنالیں، اسلام نے تو چودہ سو سال پہلے بھی کہا تھا، کہ جھوٹ نہ بولو، آج بھی یہی کہہ رہا ہے۔ اگر آپ کے علاقے کا کوئی حاجی نمازی ایسا کر رہا ہے یا کسی عالم سے کوئی ناپسندیدہ فعل سرزد ہو گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام ایسا ہے۔ اسی طرح ایک برائی کسی دوسری برائی کا جواز نہیں۔ لہٰذا کسی بے عمل کو برے الفاظ میں یاد کرنے سے پہلے یہ بات بھی سوچ لیں دین ہر ایک کا برابر ہے۔ اگر کسی نے اس میں کوئی عمدہ کام نہیں کیا یا وہ اسلوب نہیں اپنایا جسے آپ نے اپنایا تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ یہ اچھی بات ہے کہ اللہ آپ سے ایسا عظیم کام لے رہا ہے جو کسی اور نے اب تک نہیں کیا۔ آپ کا بھی خدا اتنا ہی ہے جتنا ان کا ہے۔ اللہ نے اس کو ٹھیکہ نہیں دیا۔ ہر آدمی اپنے حصے کا دیا جلاتا ہے اور اس کی روشنی جتنی عمدہ اور نفیس ہو، اتنا ہی لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کسی سے متاثر نہ ہوں مگر ہر شخص کی خوبیوں کو تسلیم ضرور کریں۔ کسی کی برائی کو گالی سے یاد کر کے اپنی اچھائیاں بھی اس کے حصہ میں ڈال کر زیرو نا ہو جائیں۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ اور زاویہ فکر آپ کو جینے کی نئی سوچ ہی نہیں دے گا بلکہ راہ بھی دکھائے گا۔

اقبال کے اوپر کے اشعار پر غور و فکر کرنے کے بعد مجھے اس کتاب ''اُسوۂ حسنہ، رحمۃ للعالمین ﷺ کا رول ماڈل'' کے مطالعہ نے ایک بات کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ گروپ کیپٹن (ر) امتیاز علی صاحب اس دور میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا بیڑا اچلانے والے اور اس فکر پر کام کرنے والے کیپٹن بھی ہیں۔ آپ نے یہ پہلی کتاب نہیں لکھی بلکہ اس سے پہلے بھی کئی کتب کے خالق ہیں۔ آپ ان کی کسی بھی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیں ان سے اللہ نے نئے ہی انداز کا کام لیا ہے۔ نیا اسلوب، نئی فکر، نئی سوچ ان کی کتب کے خصائص ہیں۔ آپ کی کوئی بھی تحریر تحقیق کے عمدہ معیار پر بلا شبہ پرکھی جاسکتی ہے۔ یہی نہیں عالم اسلام کے کسی بھی بڑے عالم کو آپ کی کتاب پیش کی جائے تو وہ اس تحفہ کے مطالعہ کے بعد آپ کے ذوق انتخاب کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کتاب ہٰذا کو اگر سکول، کالجز کے طلباء کے لیے نصاب کا حصہ بنایا جائے تو یہ ہر طرح کے فائدہ سے بھرپور ہے۔ نا صرف درست تربیت ہو گی بلکہ بچوں میں اسلامی فکر اور عادات و اطوار بھی پیدا ہونگیں۔ آج نسلِ نو جس احساس کمتری کا شکار ہے اور عمل کی دنیا سے دور ہے۔ اس

کی ایک وجہ مشکل کتابیں بھی ہیں۔علماء میں سے اکثر نے بہت علمی کام کیا ہے مگران کا معیار بھی علماء کا ہی ہے۔ضرورت اس امر کی تھی کہ بچوں ،طلباءاور عام قارئین کی علمی سطح کے برابر کوئی کام ہو۔الحمدللہ اس کتاب میں ہر قسم کی فرقہ پرستی سے بالاتر ہوکر یہ کام کیا گیا ہے۔جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر امتی اس دولت لازوال کو پا کر آخرت کے حقیقی خزانوں کا مستحق بن جائے۔اللہ کریم اس کتاب کو احسان ملک ،آپ کے والدین،آپ کے اساتذہ اور ہر قاری کے لیے توشہ آخرت ثابت کرے۔نیز کتاب کی اشاعت پر ادارہ ہذا کے ایگزیکٹو کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس قدر عمدہ کام کو منظر عام پر لا رہے ہیں۔اللہ حرف حرف کو اپنے حبیب ﷺ کے صدقے قبول فرمائے۔

امین۔بجاہ النبی الکریم ﷺ

ڈاکٹر محمد اعظم رضا تبسم

(فاضل بھیرہ شریف)

فروری ۲۰۱۸ اسلام آباد

پیش لفظ

میرے لیے یہ احادیث مشعل راہ بنیں اور ان کی روشنی میں ہی یہ سٹڈی کی گئی ہے۔

حدیث: رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: ''جس شخص کو موت اس حالت میں آئے کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لیے علم حاصل کر رہا ہو تو جنت میں اور اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔''

(دارمی، ابن سنی)، (ریفرنس احیاء العلوم، امام غزالی، جلد اوّل، صفحہ 43)

حدیث: ''علم خزانہ ہے اس کی کنجیاں سوال ہیں۔ علم کے بارے پوچھتے رہا کرو اس لیے کہ ایک سوال کرنے سے چار آدمیوں کو ثواب ملتا ہے سائل کو، عالم کو، سننے والے کو اور جوان سے محبت کرتا ہے۔''

(ابونعیم۔ ریفرنس احیاء العلوم، امام غزالی، جلد اول، صفحہ 43)

حدیث: ''ایک جاہل کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اپنے جہل کے باوجود خاموش رہے اور نہ عالم کے لیے مناسب ہے کہ وہ علم کے باوجود چپ رہے۔ طبرانی، ابن مردویہ، ابن سنی، ابونعیم۔'' (ریفرنس احیاء العلوم، امام غزالی، جلد اول، صفحہ ۴۳)

حدیث: اگر قیامت برپا ہونے لگے اور تم ایک درخت لگا رہے ہو تو اسے لگاتے رہو۔

(مسند احمد 12491۔ البانی)

میرے خیال میں اس حدیث کے الفاظ سے بہتر اور خوبصورت کوئی الفاظ ہو ہی نہیں سکتے جو کہہ رہے ہوں کہ موت تک دنیا کی زندگی کو جنت بنانے میں کوشش کرتے رہو۔

افتتاحیہ

سیرتِ النبیؐ پر لکھنا ہر مسلمان کے لیے اعزاز، اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی نشانی ہے۔ 1995ء سے میری بھی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی۔ اِس پر مواد اکٹھا بھی کیا۔ نوٹس بھی بنائے۔ مگر شروع کرنے میں التواء ہوتا رہا۔ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس طرز پر لکھا جائے۔ فیصلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے مختلف طریقوں سے کام شروع کرتا رہا اور چھوڑتا رہا جب تک کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی رہنمائی ان کتابوں کی صورت میں میسر نہ آئی۔

مولانا وحید الدین خان، الرسالہ، دہلی کی کتب ''مطالعہ سیرت''، اور ''تعمیرِ حیات''، سیارہ ڈائجسٹ کی کتاب ''عکس سیرت'' جو کہ رومانیہ کے کونسٹن ورجیل کی سیرت النبیؐ پر کتاب، جس کا نام ہے،'' محمد جنہیں دوبارہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔''۔ حضرت بلالؓ کی سوانح عمر کا انگریزی ترجمہ، ان کتابوں سے مجھے اپنے آئیڈیا کی تلاش کی تعبیر اور تصدیق مل گئی اور ذہن بن گیا کہ سیرت کو نئے سرے سے سمجھنے اور اس سے نئے اصول اخذ کرنے کی ضرورت ہے تو پھر اللہ کا نام لے کر اس اہم ذمہ داری کے کام کو اس کی ہدایت، رہنمائی اور مدد کی دعا کے ساتھ شروع کر رہا ہوں۔

> مولانا صاحب کے مطابق: ''سیرت یا اسوہ کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ کتابوں میں علماء نے جو سنتیں لکھ دی ہیں انہی کو لوگ سنتیں سمجھتے ہیں۔ باقی احادیث یا سنتوں کو سنت ہی نہیں سمجھتے۔ یہ سنت کا محدود تصور مسلمانوں میں آ گیا ہے ان کے علاوہ زیادہ اہم اور ضروری

باتوں کو سنت سمجھتے ہی نہیں۔'' (''مطالعہ سیرت، ص ۲۰'') مثلاً آسان حل ڈھونڈنا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب کرتے'' یعنی مشکل حل چننا غیر مسنون فعل ہے جبکہ آسان حل سنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مشکل حل پر عمل کر رہے ہیں اور اسے عین اسلام سمجھتے ہیں صرف اس لیے کہ آسان حل استعمال کرنا سنت گناہی نہیں جاتا جبکہ اللہ کا بھی یہی حکم ہے کہ اللہ آسانیاں چاہتا ہے۔ (سورہ حج)

دوسرا سبق: ''اسی طرح مناسب وقت کے انتظار میں مکہ میں آپ نے بتوں کی موجودگی کو برداشت کیا اور توڑنے کی کوشش نہیں کی، اور صرف توحید کا سبق دیتے رہے اور مناسب وقت کا صبر سے انتظار کیا۔ اسی کو اسٹیٹس کو status quo کہتے ہیں: ''یہ بھی سنت ہے، نہ کہ کمزور ہونے کے باوجود دشمن کو چیلنج کر لینا جو کہ مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔'' (مطالعہ سیرت)

آسان بول چال اردو میں لکھنا:

دوسری ایک حقیقت سامنے آئی کہ آج کل پاکستان کے انگلش میڈیم سکولوں کے علاوہ اردو میڈیم کی بھی اردو بہت کمزور ہے۔ **اس لیے سیرت کی کتابوں کو آسان اور بول چال کی اردو میں لکھنے کی ضرورت تھی اس لیے اس کتاب میں اردو کو لٹریری سٹینڈرڈ سے چیک نہ کریں۔**

مجھے یہ تجربہ تب ہوا جب ایک دن ایک ریڈر نے ایک گاؤں سے مجھے کال کر کے کہا۔ ''میں نے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ٹیلیفون کیا ہے کہ آپ نے انسانی فطرت پر کتاب اتنی آسان اردو میں لکھی ہے کہ مجھ جیسا کم پڑھا لکھا بھی سمجھ سکتا ہے۔''

چونکہ دنیا کے تمام کلچرز، مذاہب پر مبنی ہیں، اور قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی بھیجا ہے کیونکہ خدا کا ہی اپنا اصول ہے کہ جب تک میں نبی بھیج کر تعلیم نہیں دیتا تب تک میں کسی کو سزا نہیں دیتا۔

17-15 (And We never punish until We have sent a Messenger (to give warning).

اس لیے ہر کلچر میں اخلاقی اصول ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان سنتوں کو چنا ہے، جو کہ ہر مذہب کی اخلاقی تعلیم میں یکساں ہیں۔ میری بعض باتوں، آراء یا ریما کس سے قارئین اختلاف کریں گے، جو ان کا حق ہے، مگر ان کے لکھنے کا مقصد آپ کو ہر عادت پر خود مزید سوچنے اور تحقیق کرنے پر ابھارنا ہے، نہ کہ کسی پر اعتراض کرنا، کیونکہ مولانا وحیدالدین یہ بھی صحیح کہتے ہیں کہ:

''جب تک کوئی بات اپنی فکری دریافت نہ ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ جب کوئی سوچی سمجھی رائے ہو جس سے ہٹنا ممکن نہ ہو تو صرف وہی عمل بنتی ہے، سنی سنائی کو بیان کر دینے سے ذاتی عمل نہیں بنتا۔ تحریر میں یا تقریر میں لفظی طور بول دینا اور بات ہے اور کسی چیز کو شعوری طور سوچ کر فیصلہ کر کے پانا دوسری بات ہوتی ہے۔ کوئی حقیقت اس وقت ذہن کا حصہ بنتی ہے جب اس کو شعوری طور پر پایا جائے اور کوئی حقیقت آدمی کے عمل میں اس وقت شامل ہوتی ہے جب وہ اسے شعوری طور پر خود دریافت کرے، فیصلہ کرے اور عادت بنائے۔'' (مطالعہ سیرت)

اسی لیے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول غور و فکر پر زور دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنی آیات پر بھی اندھے بن کر فوراً عمل کرنے سے منع کرتا ہے۔

ان کے پاس ذہن اور دماغ ہیں مگر اس سے سوچتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ یہ جانوروں کی طرح ہیں، نہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر۔ (۷۔۱۷۹)

'Have minds wherewith they understand not, eyes

wherewith they see not. They are like cattle, nay more confused, for they are neglectful (7:179).

مولانا عبیداللہ سندھی بھی کہتے ہیں کہ ''جب کوئی تعلیم محض علم کے درجے سے نکل کر عمل کے ذریعے سوسائٹی میں بطور رسم پختہ ہو جاتی ہے تو وہ مضبوط ہو جاتی ہے (یعنی جب علم سوشل رسم، عادت، پریکٹس میں بدل جائے تو وہ علم محفوظ، مستحکم اور مضبوط ہو جاتا ہے)۔'' ہمیں بھی ان سنتوں کو عادات میں تبدیل کرنا ہوگا۔

مولانا وحیدالدین خان، الرسالہ، دہلی اپنی کتاب مطالعہ سیرت میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ''کتابیں تجزیہ کر کے بھی نہیں لکھی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کا موضوع علمی اور فکری ارتقاء کا ذریعہ بھی نہیں بن سکا بلکہ صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین یا فخر و مباہات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ غلط رویوں نے جنم لیا جیسے کہ جذباتیت، علمی فکری بددیانتی، علمی فکری نقطہ نظر پیدا نہ ہونا، حقیقت پسند قوم نہ بن سکنا، بلکہ کسی بھی حقیقت کو علمی فکری تاریخی حیثیت سے سمجھنے کی عادت اور قابلیت پیدا نہ ہونا، تعصب کے تحت لکھنا، سائینسی اصطلاحات میں نہ سوچنا، سائینسی طرز پر بے لاگ تحقیق نہ کر سکنا ہے۔ '' قاری کو صرف فخر یا تقدس کی غذا ملتی ہے، عملی سبق کوئی نہیں ملتا۔ جبکہ گورے objective اعتبار سے لکھتے ہیں اور بڑے نکتے نکالتے ہیں جو کہ سبق سیکھنے کے لیے ہوتے ہیں جو ہمارے سیرت نگار سمجھنے سے قاصر ہیں مثلاً kellet لکھتا ہے۔

"He faced adversity with the determination to wring out success out of failure."

میں مولانا کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو چونکہ نبی نہیں مانتے بلکہ صرف ایک بہت بڑا انسان سمجھتے ہیں اس لیے ان کی انسانی عظمت کو دریافت کرتے ہیں۔ اور ان کی سوچ کو دنیاوی، انسانی، عاشرتی، لحاظ سے دیکھتے ہیں، جبکہ ہم ان کی عظمت کو صرف مذہبی لحاظ سے عقیدت سے دیکھتے اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اور جہاں عقیدت آ جائے تو پھر ذہنی غلامی آ جاتی ہے، ذہن

سوچنا، دیکھنا، سمجھنا، سوال کرنا، نتائج نکالنا بند کر دیتا ہے۔

ایک نومسلم، برائنٹ، سی، مچل، Bryant C. Mitchell نے جب مندرجہ ذیل حدیث پڑھی، تو اس نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا اور لکھا کہ ''آپ ﷺ نے، اپنی ان سوچوں پر مبنی، اسوۂ حسنہ کے رول ماڈل سے دکھا کر ہی، ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی تھی جو صدیوں تک دنیا کی سوچوں پر حاوی رہ کر رہنمائی کرتی رہی۔''

حضرت علیؓ کے مطابق آپ ﷺ نے خود اپنی سنت کے طور بیان فرمایا ہے:

۱۔ معرفت میرا راس المال یا سرمایہ زندگی ہے۔
۲۔ عقل میرے دین کی اصل ہے۔
۳۔ محبت میری بنیاد ہے۔
۴۔ شوق میرا مرکب یا سواری ہے۔
۵۔ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے۔
۶۔ اعتماد میرا خزانہ ہے۔
۷۔ غم میرا رفیق ہے۔
۸۔ علم میرا ہتھیار ہے۔
۹۔ صبر میرا لباس ہے۔
۱۰۔ رضا میرا مالِ غنیمت ہے۔
۱۱۔ فقر میرا فخر ہے۔
۱۲۔ زہد میرا پیشہ ہے۔
۱۳۔ یقین میری قوت ہے۔
۱۴۔ صدق میرا حامی اور سفارشی ہے۔
۱۵۔ طاعت میری کفایت کرنے والی ہے۔
۱۶۔ جہاد میرا خلق ہے۔

۱۷۔ اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

(پیغمبر اول و آخر، ڈاکٹر نصیر احمد)

جبکہ ہم روایتی مسلمان اس حدیث کو اس نظر سے کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کیونکہ ہم اس حدیث کو سوشل نقطہ نظر سے سٹڈی ہی نہیں کرتے، صرف مذہبی نظر سے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں مغربی تہذیب کی بنیاد بھی اس حدیث کے زیادہ تر سوشل اصولوں پر ہی رکھی گئی ہے۔

مائیکل ہارٹ نے بھی اپنی کتاب، ''دنیا کے سو بڑے آدمی، جنہوں نے دنیا کو متاثر کیا ہے'' میں انسانی عظمت کو ہی سامنے رکھ کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو پہلے نمبر پر رکھا ہے جبکہ دوسرے پر نیوٹن، تیسرے پر حضرت عیسیٰؑ کو رکھا ہے، اور حضرت عمر فاروقؓ کو باون نمبر پر رکھا ہے۔ اس نے کوئی مذہبی تعصب نہیں دکھایا۔ **مجھے کسی نے بتایا ہے کہ چین کے چیئرمین ماؤزے تنگ کا آئیڈیل بھی حضرت عمر فاروقؓ ہی تھے۔**

ہمیں بھی چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے سوشل، پولیٹیکل، معاشی، ڈپلومیٹک، سفارت کاری، دُوررس پلاننگ، نئے آئیڈیاز سے دشمن پر برتری حاصل کرنے، کمزوری میں ٹکراؤ سے بچنے اور اپنی افرادی قوت کو بچانے کی حکمت عملی اپنانے وغیرہ کے سوشل اصولوں کو پہچانیں اور استعمال کریں۔

رومانیہ کے کونسٹن ورجیل نے سعودی عرب میں رہ کر نبی کریم ﷺ سے کسی بھی طرح تعلق رکھنے والے تمام قبائل میں رہ کر عملی تجربہ کر کے سیرت النبیؐ پر کتاب لکھی ہے اور جس کا بہت ہی مناسب نام بھی رکھا ہے، **''محمد (ﷺ) جنہیں دوبارہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔''** میرے خیال میں ہمیں بھی نبی کریم ﷺ کے اسوہ کو ہر زاویہ سے واقعی نئے سرے سے دریافت کرنے کی ضرورت ہے تبھی ہم بھی تمام دنیا کے انسانوں کے لیے رحمت بن سکیں گے۔

کونسٹن ورجیل کی بات کو ہی کیرن آرمسٹرانگ نے اپنی کتاب۔

"Muhammad Prophet For Our Time" میں دہرایا ہے کہ محمد ﷺ زمان ومکان کی قید سے آزاد شخصیت کا نام ہے۔

''جتنی ضرورت ساتویں صدی کی دنیا کو محمد ﷺ کی تھی، اتنی ہی ضرورت محمد ﷺ کی آج کی دنیا کو بھی ہے۔''

اس لیے پاکستان کو ایسی شخصیت، ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو ان راستوں پر چلنے کی کوشش کرے جن پر آپ ﷺ چلے تھے، اور خلفائے راشدین نے چل کر دکھایا تھا۔

اس لیے آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس چیز کی اشد ضرورت ہے کہ ہر مضمون کے عام مسلمان ماہرین سیرت پر مکمل ریسرچ کریں، جیسے اساتذہ سنت کی روشنی میں تعلیم اور تربیت کے ماڈرن طریقے کا موازنہ کریں۔ ڈپلومیٹ نبی کریم ﷺ کی کامیاب ڈپلومیسی کے اصول نکالیں اور شیئر کریں۔ فوجی نبی کریم ﷺ کی جنگی حکمت عملی سے نتائج نکالیں، سوشل سائینٹسٹ مسلمان معاشروں کی معاشرتی تنظیم نو کے اصول واضح کریں تاکہ ہم انہیں اپنا کر، استعمال کر کے ترقی کی راہ اپنا سکیں۔ یہ عام مسلمانوں کا فرض بنتا ہے۔

میرے خیال میں اپنے ملک کی موجودہ حالت دیکھتے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ہر لحاظ سے خصوصا اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے دور جاہلیت میں داخل ہو گئے ہیں۔ دورِ جاہلیت کیا ہے؟ دیکھئے مغربی مصنفہ کیرن آرمسڑانگ اپنی کتاب "Muhammad Prophet For Our Time"- میں کہتی ہیں۔

''انہوں نے قبل از نبوت کے عہد کو دورِ جاہلیہ کہا تھا۔ اس کا مطلب عام طور پر دورِ جاہلیت لیا جاتا ہے۔ مگر آج کی تحقیق بتاتی ہے کہ اس اصطلاح کا تعلق تاریخ کے کسی دور سے نہیں، بلکہ اس ذہنی حالت سے تھا جو قتل و غارت، ظلم وجبر اور وحشت و بربریت کی وجہ بنی ہوئی تھی۔ ساتویں صدی کے عرب میں جو واقعات رُونما ہوئے تھے، ان کی مماثلت مجھے آج کے

دور میں نظر آتی ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آج کی دنیا، مغرب ہو یا مشرق، اسی حالت کا شکار ہے۔''

یعنی دورِ جاہلیت اپنی مرضی کرنے اور کسی اصول، قانون کو نہ ماننے اور اس پر عمل نہ کرنے کے دور کو کہتے ہیں اور اس سے نکلنے کا طریقہ بھی وہی ہو گا جو کہ نبی کریم ﷺ نے اپنایا تھا۔

''محمد ﷺ کوئی مذہبی عقیدہ نافذ نہیں کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کے دل و دماغ تبدیل کر رہے تھے۔''

کیرن دراصل یہ کہہ رہی ہے۔ کہ آپ ﷺ نے زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فرمائی ہے۔ ہمیں بھی ہر شعبے میں اسوۂ حسنہ پر عمل اور دنیا کی ہر قوم سے حکمت کی باتیں سیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تمام دنیا ہماری خیالی برتری کے دعوؤں، باتوں، نمازوں اور عبادت سے متاثر نہیں ہوگی بلکہ صرف ہمارے کردار، اخلاق، معاملات میں دیانت داری، ہر فیلڈ میں ترقی، پرفارمنس سے متاثر ہوں گے۔ یہ مقابلے کی دنیا ہے اور مقابلے میں جیتنے سے ہی برتری ثابت ہوتی ہے۔ جیسے ہم ان کی انہی وجوہات سے تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے نزدیک اخلاق، کردار، حقوق العباد اور بہترین معاملات سیکنڈری چیزیں ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق کا ہمیں پتہ ہی نہیں تو ان کو پریکٹس کیسے کریں گے۔ ان کا ذکر جمعہ کے خطبات میں بھی نہیں کیا جاتا۔ صرف نماز روزہ اور عبادات پر وعظ کرنا رسم بن گئی ہے جو کہ ذاتی افعال ہیں ان کا دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ لوگ اس بات کی تعریف کرتے ہیں جس سے انہیں فائدہ پہنچے۔ آخرت کی تیاری بھی ہر ایک کا ذاتی فعل ہے۔

میرے خیال میں پاکستان میں ہماری ترقی اور مقابلہ نہ کر سکنے میں اعمال و افعال

میں ترجیحات کا غلط انتخاب اور ملک کی ماڈرن سوشل تنظیم کا نہ ہونا بہت اہم وجہ ہیں۔ ہم تو ہر چیز کو صرف مذہبی زاوییئے سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ ہم مذہبی مخلوق ہیں نہ کہ انسانی سوشل مخلوق۔ جبکہ ہم میں مذہبی باتوں اور معاشرتی، مالی، نفسیاتی معاملات میں فرق کرنے کی حس موجود ہونی چاہئے۔ سوشل سینس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں باقی قوموں کے درمیان زندگی کیسے گزارنی ہے اور مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ ہمارا اور ہماری نسلوں کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکستان سے ہماری پہچان ہے۔ اس لیے ہماری وفاداری پاکستان کے ساتھ ہونی چاہئے۔ اس کو سوچ کر ہی میں نے سوشل کتاب کی طرز پر لکھی ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پاکستان ہم سب کے مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس لیے اسے ہر لحاظ سے طاقتور بنانے میں اپنا اپنا حصہ ڈالنا ہوگا مگر خصوصا انسان سازی اور معاشی لحاظ سے یہ کام سب نے مل کر کرنا ہے۔ ہر ایک کو اپنے پیشے میں اور اخلاق میں نمایاں بننا ہے۔ اسی کو علامہ اقبال 'ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ' کہتے ہیں یعنی ہر پاکستانی کو اخلاقی لحاظ سے پہلے اور پھر جس پیشے، فیلڈ میں بھی ہو outstanding بننے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ قوم کے لیے بلاتفریق مذہب، ہر چھوٹا بڑا، عورت، مرد، بڑا کام کرسکتا ہے۔ یہ صرف خواص کے لیے مخصوص نہیں ہوا کرتا۔ اصل performers عوام ہی ہوتے ہیں۔

''اصلاح کا کام انسان سازی سے شروع کرنا ہوگا'' امام مالکؒ کا قول ہے کہ آئندہ جب بھی امت کی اصلاح کا کام شروع کرنا ہو تو مکی دور سے ہی شروع کرنا ہوگا یعنی پہلے انسان سازی پر محنت کرنی ہوگی اور احکامات پر زور نہیں دیا جائے گا۔ ہیومن ڈیویلپمنٹ کوئی آسان کام نہیں ہوتا، چاہے ذاتی لیول پر ہو یا اجتماعی اور نیشنل لیول پر ہو۔ اس کے لیے پہلے واضح مقصد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر مقصد کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر علم، غور و فکر، ریسرچ اور لگاتار محنت اور لیڈرشپ کو مثال قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے

انسانی کردار سازی جب لیڈر کے ذریعے ہوتی ہے تو وہ اپنی مثال اور آئیڈیاز کے ذریعے سے بہت جلد اجتماعی تبدیلی لے آتا ہے۔اور ایسے ماحول میں ذاتی اصلاح بہت آسان کام ہوتا ہے۔مگر ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈر شپ میں کوئی لیڈر نظر نہیں آتا جو اپنی ذاتی کردار کی مضبوطی کی مثال سے اجتماعی رہنمائی کر سکے۔اس لیے ہر ایک کو ذاتی اصلاح کے پروگرام پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے لیے وہ ایک لیڈر پیدا نہیں کر دیتا۔جیسے کہ قائیداعظم تھے۔

اس لیے ہر ایک کو یہ کتاب پڑھنے کے بعد اپنے اور گھر والوں کے لیے یہ پروگرام شروع کر دینا چاہیے کیونکہ اللہ کے رسول کا حکم ہے کہ اپنے گھر والوں کو بھی آگ سے بچاؤ کیونکہ تم راعی ہو اور تم سے گھر والوں کے بارے پوچھا جائے گا۔

الا کلهم راع و کلهم مسئول عن رعیية

تم سب نگران و ذمہ دار ہو اور تم سے ماتحت افراد کے بارے پوچھا جائے گا۔

چونکہ یہ کتاب معاشرتی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اس لیے احادیث کے ریفرنس مختلف کتابوں، رسالوں، نیوز پیپرز کے مضامین، انٹرنیٹ کے مضامین اور احادیث سے لے کر ان سے اسوۂ رسول کریم ﷺ سے اسباق اور اصول اخذ کئے گئے ہیں۔اس لیے ان کا ہی ریفرنس دیا گیا۔احادیث کی کتابوں سے ریفرنس چیک کر کے نہیں دیئے گئے۔یہ سب مشہور حدیثیں ہیں۔بعض جگہ جہاں پر کسی حدیث بارے اختلاف ہے کہ کسی کا قول ہے یا حدیث،مگر بات حقیقت پر مبنی ہے، میں نے اس کو بھی استعمال کرلیا ہے۔میں نے اس حصے میں کوئی خاص ترتیب بھی نہیں رکھی کیونکہ میرا مقصد تھا کہ یہ پہلا حصہ جلد مکمل ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور مجھے اس پر ریڈرز کی فیڈ بیک سے دوسرے حصوں کو بہتر بنانے کی تجاوز اور مشورے مل جائیں۔میں اُمید کروں گا کہ مجھے ہر قاری اپنا فرض سمجھ کر کال ضرور کرے گا۔

میں ان تمام اصحاب کا ممنون ہوں جن کی کتب، یا مضامین سے مَیں نے استفادہ

کیا ہے۔اپنے پبلشر محترم کی رہنمائی اور مارکیٹنگ کے تمام مراحل میں معاونت پر مشکور ہوں۔اپنے بھائی بریگیڈیئر اصغر علی کا پروف ریڈنگ کے لیے اور اپنے مرحوم دوست ونگ کمانڈر حشمت خواجہ صاحب کا بھی کہ کتابیں چھپوانے کی ہمت انہوں نے ہی دلائی اور مالی شرکت بھی کی۔اپنے بچوں کا بھی جنہوں نے صدقہ جاریہ کے طور پر ہر کتاب میں اپنا حصہ ڈالنے پر اصرار کیا۔اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا نظرِ کرم فرمائے اور اجر عطا فرمائے، آمین۔ میری درخواست ہے کہ مجھے دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں گے۔

راولپنڈی (پاکستان)/کینیڈا

امتیاز علی

www.ch.imtiazali@gmail.com
www.askallah.com.pk

051-5571398, 0345-5366081

سیرت النبی ﷺ کی کتاب کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

چونکہ ہم تو سیرت کو انفارمیشن کیلئے پڑھتے ہیں اور اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا مقصد ہی نہیں تو حضور ﷺ کی سیرت کے وہ پہلو جو غیر مسلم حضرات کو بھی متاثر کر سکیں وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ ''اللہ سبحانہ تعالیٰ لوگوں کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ نہ بدلیں جو دلوں میں ہے۔'' (سورہ رعد۔۱۳۔۱۱) زندگی کا اصول یہ ہے کہ ارادہ اور نیت کئے بغیر کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے خلوص دل سے نیت اور پکا ارادہ کریں کہ اسوہ حسنہ کو اپنانے، اپنی عادات کو اس کے مطابق تبدیل کرنے اور اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے یہ کتاب پڑھ رہے ہیں۔ پڑھیں اس طرح جیسے امتحان کے لیے ٹیکسٹ بک پڑھتے، نوٹس بناتے اور غور و فکر کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں سمجھ نہ آئے تو کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ سے مدد کے لیے حضور اکرم ﷺ کی دعا کا بھی ورد کریں:

''میرے رب! سب سے اچھے اخلاق کی طرف میری رہنمائی فرما، تیرے سوا اچھے اخلاق کی راہ کوئی نہیں دکھا سکتا۔ بُرے اخلاق کو مجھ سے دُور کر دے اور انہیں تیرے سوا کوئی دُور نہیں کر سکتا۔''

مجوزہ طریقہ کار

پہلی بار آپ اس کتاب کو الف سے ی تک صرف پڑھ جائیں۔ تا کہ اس کے مندرجات کا علم ہو جائے۔ پھر دوسری بار اس کتاب کو اُونچی آواز سے سوچ سمجھ کر کے پڑھیں اور اس پر غور و فکر کریں پھر تیسری بار اس کتاب میں سے صرف ایک آسان، اپنی پسند کی عادت، سنت، عمل کو اپنی عادت بنانے کے لیے چُن لیں اور اس پر غور و فکر کریں

کہ اس کے دنیاوی فوائد کیا ہیں۔ نہ کرنے سے ذاتی نقصانات کیا کیا ہیں۔ اجتماعی نقصانات کتنے زیادہ ہیں۔ عادت کیسے بدلوں گا۔ کیا رکاوٹ پیش آسکتی ہے۔ خیالات کو دوسرے دوستوں سے شیئر کریں۔ ڈسکس کریں۔ اور پھر اپنانے کا پروگرام بنائیں۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کام ایک دن کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ زندگی بھر کا جاری کام ہے۔ ایک عادت بدلنے کیلئے کم ازکم چالیس دن کا عرصہ چاہیئے۔ اس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے اس کو پریکٹس کرتے رہیں جب تک کہ آپ کی فطرت نہ بن جائے۔ کبھی عادت ٹوٹ بھی جائے تو اس کو نوٹ کریں اس پر افسوس کریں یا اپنے لیے کوئی ہلکی پھلکی سزا خود تجویز کرلیں کیونکہ سزا سے ہی انسان ٹھیک رہتا ہے۔ جیسے ایک انگریز نے لیٹ آنے پر اپنے آپ کو دھوپ میں آدھ گھنٹہ کھڑے رہنے کی وہی سزا دی تھی جو وہ دوسروں کو دیتا تھا۔ یا سزا کے طور اتنے پیسے اللہ کی راہ میں دوں گا۔ یا جسمانی سزا کہ گھنٹہ بھر کھڑا رہوں گا، جیسے کلاس میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

جب تک عادت پختہ نہ ہو جائے تو اپنے آپ کو بار بار کہیں اور یاد دلائیں کہ میں اب یہ عادت اختیار کررہا ہوں یا فلاں بری عادت کو چھوڑ رہا ہوں۔

اس حدیث کے مطابق کہ بلغوا عنی ولو آیہ دوسروں تک میری بات پہنچا دو چاہے وہ چھوٹی بات ہی ہو۔ اپنے گھر والوں، قریبی اقارب، دوستوں، ماتحتوں کے ساتھ یہ کریکٹر بلڈنگ پروگرام شیئر کریں تاکہ وہ بھی آپ کے عادت بدلنے کے پروگرام میں مدد کرسکیں اور خود بھی شامل ہو جائیں۔ اسلام کے اصول کے مطابق آسان سے مشکل کی طرف بتدریج ترقی کریں۔ ایک عادت اپنانے کے بعد پھر دوسری آسان عادت چُن لیں اور اس پر کام شروع کر دیں۔ اسی لیے میں نے ہر باب میں اپنی رائے بھی دے دی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسے اپنانا کتنا آسان یا مشکل ہے۔

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اسوۂ حسنہ پر عمل کی نصیحت کی ہے اور بڑوں کی نصیحت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے ہر گھر میں روزانہ قرآن مجید کے ساتھ اخلاقیات پر سیرت کی کتاب بھی پڑھی جانی چاہیے۔

۱۔ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر محبت کس طرح کرنی ہے اسکی سمجھ نہیں آ رہی

پروفیسر احمد رفیق اختر نے بڑے خوبصورت طریقے سے اس کی وجہ کی نشان دہی کی ہے وہ کہتے ہیں:

''حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا اظہار ہے، جان دینے کے لیے تیار ہیں مگر ان سے سیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ اسوۂ حسنہ پر عمل نہیں کرنا۔داڑھی اور مسواک کی سنت یاد کراتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ سچ بولنا بھی سنت ہے، امانت بھی سنت ہے، وعدہ نبھانا بھی سنت ہے۔غور وفکر بھی سنت ہے۔''

سید سرفراز احمد شاہ صاحب اپنی کتاب ''کہے فقیر'' میں بھی یہی کہتے ہیں کہ:

''پوری دنیا نے جب نبی کریم ﷺ کو دنیا کی اول ترین شخصیت کا درجہ دیا ہے تو آپ کے اخلاق اور کردار کی بنا پر دیا ہے، لباس وغیرہ ظاہری شکل سے نہیں دیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم مشابہت کے لیے ظاہری باتوں کی بجائے ان خصوصیات کو اپنائیں جن کی بنا پر آپ کے دشمنوں کی نظر میں دنیا کی عظیم ترین ہستی بن گئے ہیں۔ خوبصورت زندگی وہ ہے جو آپؐ نے گزاری تھی۔ یعنی وہ زندگی جو دوسروں کے لیے گزاری جائے۔ اسی لیے غیر مسلم بھی آپ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔''

سید سرفراز احمد شاہ صاحب شاہ اپنی کتاب ''فقیر رنگ'' میں یہ بھی فرماتے ہیں۔''میرے خیال میں اسلام مذہب سے زیادہ کلچر ہے۔'' (ص ۲۸۳)۔

میں نے اس کتاب میں اسلامی کلچر اور تہذیب کی اخلاقیات ہی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

سبق

تمام دنیا کے لوگ اپنی زندگیاں مذہب کی بجائے کلچر کی رسومات اور عادات کے تحت گزارتے ہیں۔ ہم بھی وہی کرتے ہیں جو ہم اپنے گھر اور معاشرے سے سیکھتے ہیں۔ اس لیے ہمیں سچ بولنا، وعدہ نبھانا معاشرے کی ضرورت کے تحت عادت کے طور اپنانا ہوگا۔ جب عادت بن جائے تو پھر یاد بھی نہیں رہتا کہ کیوں کر رہے ہیں، یہی کلچر بن جاتا ہے۔ تو آیئے شروع تو اسلام، اللہ، اسوہ رسول کریم ﷺ کی تابعداری کی نیت سے اچھی اجتماعی، معاشرتی عادات سیکھنے کو مقصد بنا کر کریں۔ بسم اللہ کر لیں، پہلا قدم اٹھالیں تو پھر منزل تک پہنچ ہی جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

عبادات کی سنتیں ذاتی روحانی ترقی کے لیے ہوتی ہیں، ان سے مسلمان اور غیر مسلم متاثر نہیں ہو سکتے۔ جبکہ اجتماعی اور معاشرتی اسوۂ حسنہ کی سنتیں غیر مسلموں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اس لیے وہ انہی سے متاثر ہونگے جن میں ہمیں اخلاق، کردار، بنیادی انسانی حقوق، معاملات والی سنتوں کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے جن کو ہم اہم ہی نہیں سمجھتے۔

اس خامی کو دور کرنے کے لیے ہمیں بچوں کو بچپن سے ہی سچ بولنا، وعدہ نبھانا، انسانی مساوات اور انسانی عزت، خیر خواہی، انسانوں سے محبت، اور رحمت بننے کی تعلیم اور تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

اس کتاب کے ہر باب کی سنت کو عادت میں بدل دینا شروع کر لیں۔ پھر دیکھیں دنیا پاکستانیوں کی کیسے تعریف کرنے لگے گی۔

☆......☆......☆

۲۔ نبی کریم ﷺ سے محبت کیسے کی جانی چاہیے؟

اس کا جواب بھی رسول کریم ﷺ ہی کی زبانی سنیے

ایک روز بہت بڑا جذباتی ماحول تھا۔ نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا: صحابہ کرام آپ ﷺ کے وضو کا استعمال شدہ پانی لے کر اپنے جسموں میں مل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا بس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں ایسا کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو یہ خواہش ہو کہ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت حاصل ہو تو وہ ان تین باتوں کا اہتمام کرے:

(۱) بات کرے تو سچی کرے۔

(۲) امانت میں خیانت نہ کرے۔

(۳) اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔'' (معجم کبیر، طبرانی)

رسول کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی بات سے خوش ہونے کی بجائے ان کی سوچوں کی تصحیح کیوں فرمائی؟

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو صحابہ کرامؓ کو جذباتی سوچ والے بننے کی جگہ حقیقت پسند اور پختہ بنیاد والے اعمال اپنانے کی سوچ پیدا کرنے اور اس کی تعلیم اور تربیت دینے والے بنانے کی زیادہ فکر تھی۔ محبت کے اس اظہار پر ظاہری خوشی بھی نہیں دکھائی۔ اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ جہاں کہیں نقصان دہ عادات نظر آئیں تو ان کی فوری اصلاح کرنے کے لیے صحیح فعل کی نشان دہی کرنے سے جھجکنا نہیں چاہیے۔

اس لیے نبی کریم ﷺ نے یہ تین اہم اخلاقی باتیں بتا کر کردار سازی کی اہمیت واضح کر دی تھی۔ ہم بھی اگر کردار سازی کی طرف توجہ دیں گے تو تبھی آپ سے محبت کا

اصلی اور نفع بخش ثبوت ملے گا۔ جس سے دنیا بھی جنت بن جائے گی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل کی امید کی جاسکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا یہی تجربہ ہوگا کہ کسی انسان سے بھی محبت ہو، تو بار بار صرف زبانی کہنے سے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے، اس پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ جب تک ہم محبت کو عملی شکل نہ دیں اور عملی اظہار نہ کریں جیسے کہ اس کی عزت، اور ضروریات کا خیال نہ کریں، مناسب موقع پر تحفے تحائف نہ دیں، ہر بات پر تعریف نہ کریں۔ غلطیاں معاف نہ کریں۔ بچوں کو کھانے کی چیزیں اور کھلونے نہ لے کے دیں۔ اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ ذہن اور دل کے خیالات کے اظہار کے لیے مناسب بات چیت، الفاظ کا کہنا اور فزیکل چیزیں کرنا بہت ضروری ہوتا ہے تا کہ دوسرے کو پتہ چل جائے۔ جیسے مسلمان ہونے کا پریکٹیکل ثبوت فوراً نماز شروع کر دینے سے ہوتا ہے یعنی physical manifestat ہوتی ہے کہ سچے دل سے قبول کیا ہے۔ ملک سے محبت کا ثبوت ملک کے قوانین پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ انسانوں سے محبت ان کی ہر بات میں خیر خواہی ہوتی ہے۔ بڑوں کی عزت کا اظہار ان کی تابعداری سے ہوتا ہے۔

سبق

ہمیں اپنی سوچوں اور عادات کا تجزیہ کرنا چاہیے کہ آیا ہم انسانی فطرت اور رواج کے مطابق نبی کریم ﷺ سے جیسے کہ انہوں نے اس حدیث میں محبت کا ثبوت کہا ہے، اچھے اخلاق اور کردار سے محبت کا ثبوت دے رہے ہیں یا کہ نہیں۔

آپ ﷺ سے محبت کے دعوے ناپنے کا پیمانہ آپ ﷺ نے خود ہی مقرر فرما دیا ہے۔ اس لیے اپنے اعمال کا اس سے مقابلہ کر کے ہی ہم کہہ سکیں گے کہ ہمیں اپنے نبی سے واقعی پیار ہے۔ ظاہری شوشا سے وہ خوش نہیں ہوں گے کہ یہ عارضی اور جذباتی فعل ہوتا ہے۔ سوائے اپنی ذاتی خوشی اور دل کی تسلی کے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اپنے گھر والوں، دوستوں، محلے والوں، کام کے رفیق، ملکی ہم وطنوں، دنیا کے ہر انسانوں سے کیسے محبت کرنی ہے، اس کا اظہار کیسے کرنا چاہیے اس موضوع پر سوچیں، پڑھیں دوستوں سے تبادلہ خیالات کریں اور پھر اسے پریکٹس کریں

جیسے ماں باپ یا ملک وقوم کے نام کو روشن کرنا بچوں کا کام ہوتا ہے تو چونکہ اب اور کوئی نبی نہیں آنا تو ہمیں اگر آپ سے واقعی محبت ہے اور ہم اپنے نبی کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہی ان کے مشن کو لے کر چلنا ہوگا۔ آئے دیکھتے ہیں کہ ان کا مشن کیا تھا؟

☆......☆......☆

۳۔حضور اکرم ﷺ کا مشن کیا تھا؟

☆ **حدیث:** ”میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“ (یعنی کردار اور کریکٹر کی تکمیل) (کنز العمال۔3-16)

☆ **حدیث** ”میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں: **انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق** سورہ قلم۔4) ”اور بلاشبہ آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔“

☆ **حدیث**۔حضرت عائشہؓ: ”رسول اللہ کا خلق قرآن ہے۔“ (ابوداؤد۔مسلم) ”یعنی آپ کی ذات Quran Personified تھی۔“

☆ **حدیث**۔” اللہ کے بندوں میں سے اسے سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔“

میرے خیال میں اس سلسلے میں قائل کرنے والی، سب سے اہم حدیث، یہ ہے:

”ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی۔“

ہم نے غلطی سے سارا زور عبادات پر کر دیا ہے۔جبکہ عبادت کی نسبت صرف غور و فکر کی اہمیت اور وزن دیکھیں؛۔

تفکر ساعه خیر من عبادة ستین سنه

”یعنی ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے“

یوم آخرت میں اعمال گنے نہیں جائیں گے کہ کتنے نفل پڑھے یا کتنے لاکھ بار

ذکر کیا، بلکہ اعمال تولے جائیں گے۔اور ہر عمل کا وزن نیت کے خلوص پر منحصر ہوگا۔مثلاً ایک طوائف کے صرف ایک جانور کی جان بچانے کے ہمدردی کے جذبہ صادق اور گہرائی کا اتنا وزن تھا کہ اس کی گناہ گار زندگی پر بھاری بن کر اسے نجات دلا گیا۔اس لیے ہماری چوائس اوراچھا سودا وہ اعمال ہونے چاہئیں جن کا وزن زیادہ ہواور جب اخلاق کی weightage سب سے زیادہ ہوگی۔تو پھر بہترین اخلاق اپنائیں اور پریکٹس کریں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ آخرت میں نبی کریم ﷺ کے قریب تر ہوں تو پھر ہمیں اس حدیث پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوگا: ''تم میں سے میرا سب سے محبوب اور آخرت میں مجھ سے قریب تر وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں۔ اور مجھے ناپسندیدہ اور آخرت میں مجھ سے وہ دور ہونگے جو تم میں بدخلق ہیں۔'' اپنے اخلاق اور کردار پر محنت کرنی ہوگی۔

اچھے اخلاق اللہ کی نعمت اور عطا ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ حدیث ہے: **''لوگوں کو اللہ کی طرف سے جو کچھ عطا ہوا ہے اس میں سب سے بہتر اچھا اخلاق ہے۔''** ہم خود چیک کریں کہ آیا ہمیں اللہ نے نعمت سے نوازا ہے یا کہ نہیں۔اگر نہیں تو فکر لگ جانی چاہیے اور کوشش کر کے اچھے اخلاق اپنا کر اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اوپر دی گئی احادیث سے مسلمان کی پہچان صرف اور صرف اخلاق و کردار سے ہونی چاہیے کہ کوئی دیکھتے ہی کہہ سکے کہ یہ مسلمان لگتا ہے۔مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم نے اخلاقیات کو وہ اہمیت ہی نہیں دی جو ان کا حق ہے۔اسی لیے ہم پاکستانی اخلاق میں سب سے پیچھے ہیں اور مغربی دنیا سب سے آگے؟ اگر آپ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر کچھ تو کرنا پڑے گا۔

ہم اگر صفات نبوی کی ایک حدیث کو زندگی کا مقصد بنالیں تو بہترین انسان اور بہترین مسلمان بن جائیں گے؛

حضرت علیؓ کے مطابق آپ ﷺ نے خود اپنی سنت کو یوں فرمایا تھا:

۱۔معرفت میرا راس المال یا سرمایہ زندگی ہے۔ ۲۔عقل میرے دین کی اصل ہے۔
۳۔محبت میری بنیاد ہے۔ ۴۔شوق میرا مرکب یا سواری ہے۔
۵۔ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے۔ ۶۔اعتماد میرا خزانہ ہے۔
۷۔غم میرا رفیق ہے۔ ۸۔علم میرا ہتھیار ہے۔
۹۔صبر میرا لباس ہے۔ ۱۰۔رضا میرا مالِ غنیمت ہے۔
۱۱۔زہد میرا پیشہ ہے۔ ۱۲۔یقین میری قوت ہے۔
۱۳۔صدق میرا حامی اور سفارشی ہے۔
۱۴۔فرمانبرداری اور اطاعت میری کفایت کرنے والی ہے۔
۱۵۔جہاد میرا اخلق ہے۔
۱۶۔اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے (پیغمبر اوّل و آخر، ڈاکٹر نصیر)

کیا ہم نے اپنے نبی کریم ﷺ کے مشن کی کبھی بات بھی کی ہے۔ ذکر بھی کیا ہے؟ اس کے لیے کوشش بھی کی ہے۔؟ جواب نفی میں ہے۔

نیشن بلڈنگ بھی مقصد ہو، تو پہلی اینٹ کردار سازی ہی ہوگی اور بہترین اخلاق، حقوق العباد، بنیادی انسانی حقوق کی ادائیگی، معاملات میں سچائی اور امانت کو یقینی بنانا ہوگا، یہ سب اسوۂ حسنہ ہیں مگر ہم انہیں جب سنت ہی نہیں سمجھتے تو اہمیت کیوں دیں گے۔ سیاسی لیڈران ہوں، مذہبی حلقے یا عوام، ہم نے آج تک نیشن بلڈنگ میں انسان سازی کی تعلیم اور تربیت کی اہمیت کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہر ایک کی ذاتی ذمہ داری ہے جو کہ غلط سوچ ہے۔ یہ اجتماعی ضرورت ہوتی ہے، اسے اجتماعی کوشش اور پلاننگ اور عملی تربیت سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہر گھر، مسجد، مدرسے، سکول، کالج، حکومت اور محکمہ تعلیم کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

اخلاق میں ترقی صرف تبھی ممکن ہوسکتی ہے کہ گھر، سکول، کالج، مسجد، مدرسے سے اخلاق، کردار، حقوق العباد۔ معاملات، کا نظریہ سکھایا جائے، اور بار بار یاد دلایا جائے اور پریکٹس میں لایا جائے خصوصا اساتذہ اور بڑے لوگ اس کو پریکٹس کر کے عملی

نمونہ پیش کریں گے تو چھوٹے خود ہی سیکھ جائیں گے۔اسی لیے اسوۂ حسنہ کی نقل کرنے کی خدائی ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ **"ہر قوم کی طرف ہادی بھیجے گئے ہیں"** (۱۰۔۴۷)

"ہر امت یا قوم کے لیے ایک پیغامبر ہوتا ہے۔"

اس لیے ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ تمام ملکوں کے کلچرز کی بنیاد پیغمبروں کی تعلیم پر ہی مبنی ہے، انسانیت، اخلاقیات، کردار، حقوق العباد، کے اصول، تو ہمیشہ ہر جگہ، ہر مذہب، ہر قوم میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ایک ہی جیسے رکھے ہیں اور وہ ایک ہی جیسے رہتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت ایک جیسی ہے اور صدیوں سے ایک ہی جیسی ہے اور آئیندہ بھی رہے گی۔اس لیے دوسرے انسانوں اور قوموں سے مقابلہ بھی انہی مشترک عوامل میں ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔مذہب تو ہر ایک کا ذاتی کام ہے کیونکہ دنیا میں مذاہب اور مسالک کی بھرمار ہے۔اس لیے جو قوم بھی پروردگار کے ان دائمی انسانی اصولوں اور انٹرنیشنل اخلاقیات کے اصولوں پر عمل کرے گی وہی ترقی پائے گی۔مغربی کلچر کی برتری بنیادی طور پر انہی خصوصیات کی وجہ سے ہے۔علم، سائینس اور ٹیکنالوجی، ترقی، خوش حالی، تجارت، انسانی تعلقات کی خوشگواری، امن کا انحصار بھی ان کے کردار کی بلندی کا مرہون منت ہے۔اگر ہم ہر شعبے میں ان کے ہم پلہ آنا چاہتے ہیں تو کردار کی بلندی سے ہی آ سکتے ہیں۔

سبق:

اس لیے میرے خیال میں ہمیں اپنے نبی سے اگر واقعی سچی محبت ہے تو ہمیں ان کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہئے۔میرا ایمان ہے کہ یہ مشن یہ ہونا چاہیے

۱۔ کیونکہ کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اس لیے اسلام کا پیغام تمام قوموں تک پہنچانا ہر مسلمان عورت مرد کی زندگی کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔

۲۔ اس مقصد کی تیاری کے لیے ہمیں پہلے مکی دور کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہمیں

کردار کی بہترین مثال قائم کرنی ہوگی ۔جس سے لوگ متاثر ہوکر خود ہی اسلام کی حقانیت پر یقین لائیں گے۔جس کے لیے صفات نبوی والی سنتیں ہماری بھی بنیاد ہونی چاہیئے

۳۔ اس دنیا کی زندگی کو مثالی زندگی بنانے کے لیے حضورﷺ تشریف لائے تھے۔ جس کے لیے ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے ؛۔

1- تمام انسانوں اور مخلوقات کے لیے رحمت بننا۔اور رحمت بننا صرف بہترین اخلاق سے ممکن ہوسکتا ہے۔ 2- جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے چاہو اور کرو۔ 3- دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے۔

۴۔ ہمیں اسوۂ حسنہ کو مذہبی کی بجائے سوشل نظر سے دیکھنا چاہیئے۔تبھی ہم اسوۂ حسنہ سے صحیح سوشل اصول اور نتائج اخذ کرسکیں گے جن کو ہم اپنی دنیا بہتر بنانے کے لیے اپنا سکیں۔ جب سچ کو ہم سوشل اور نیشنل ضرورت کے تحت بولیں گے تو یہ اجتماعی ضرورت بن جائے گی۔ مذہب کی ضرورت سمجھیں تو ہر ایک کی مرضی ہے کہ عمل کرے یا نہ کرے۔سوشل پریشر نہیں بنے گا۔

چونکہ یہ زندگی اعمال کی کھیتی ہے۔ جو یہاں بوئیں گے ،وہی آخرت میں کاٹیں گے۔اس لیے اگر اس زندگی کو بہترین سسٹم دے کر جنت بنائیں گے تو آخرت میں جنت ملنی آسان ہوجائے گی۔انشاءاللہ۔

☆......☆......☆

۴۔کیا ہم کلمہ شہادت کی گواہی پر سچے اُترتے ہیں؟

ہمیں معلوم ہے کہ اس دنیا کے تعلقات ہمیشہ دوطرفہ ہوتے ہیں اور ہر تعلق کے حقوق ،فرائض ہوتے ہیں۔اس لیے اس دنیا میں جب بھی کوئی بندہ ملازم ہوتا ہے تو وہ ملک ،حکومت یا کمپنی یا کسی فرد کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے کہ اس کی کیا کیا ذمہ داری ہوگی اور اس کے بدلے کیا حقوق کیا ہونگے اور کیا ملے گا۔دستخط کروا کر یہ معاہدہ کیا جاتا ہے۔کسی بھی کاروباری سودے کی شرائط کا کنٹریکٹ بھی لکھا جاتا ہے۔یہی شادی کے کنٹریکٹ میں بھی ہوتا ہے۔

معاہدے کے بعد ہم کام یا پیشے کی پہلے ٹریننگ دیتے ہیں ،پھر پریکٹس کے لیے عموماً تین ماہ کا probation period ہوتا ہے۔اس کے بعد پکے ہوتے ہیں، اور ملازم کو کمپنی کے مالک اور کمپنی کے مفادات کا وفادار ہونا ہوتا ہے۔جس میں کمپنی کی ملکیت کی حفاظت ،احکام پر عمل، دوسرے ملازمین کے ساتھ اچھے تعلقات اور ان سے کوآپریشن وغیرہ ضروری ہوتے ہیں۔اور اگر اس کے بعد کسی وجہ سے ملازمت سے نکالنا ہو یا ملازم سروس چھوڑنا چاہیے تو پھر صرف معاہدے میں لکھے طے شدہ طریقہ کار سے کر سکتے ہیں۔

فوجی ملازمت میں بھی ٹریننگ ختم کرنے پر ان سے بھی عہد لیا جاتا ہے کہ میں ملک اور قوم کا وفادار رہونگا۔اسی طرح صدر پاکستان اور وزیر اعظم، وزراء سب آفس ہولڈرز بھی حلف اٹھاتا ہے کہ میں پاکستان کا وفادار رہوں گا۔اور ذمہ داریاں بخوبی نبھاؤنگا یہ سب کیوں کیا جاتا ہے؟۔اس لیے ریکارڈ کیا جاتا ہے کہ کسی معاہدے یا commitment کے ثبوت کے بغیر کسی کو فرائض کی خلاف ورزی omission or commision پر یا بھول چوک پر پکڑا نہیں جا سکتا ہے اور سزا نہیں دی جا سکتی۔ سزا جھوٹ بولنے اور دوسری پارٹی کے حقوق پورے نہ کرنے اور نقصان پہنچانے پر ملتی ہے۔

چونکہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کا ہر اصول حقیقت پر مبنی ہے نہ کہ جذباتیت پر، اسلیئے اللہ تعالیٰ بھی ہر انسان سے پہلے بندگی کا عہد لیتا ہے، پھر پیغمبر کے ذریعے ٹرینگ دیتا ہے۔(**جب تک لوگوں کو سسٹم کی ٹریننگ نہ دے لوں تو میں کسی کو پکڑ کر سزا نہیں دیتا۔**)**(17-15)**۔ٹریننگ کے بعد نافرمانی پر پکڑتا ہے۔اسی لیے قیامت کے دن اس عہد کی چیکنگ ہوگی کہ کتنی فرمانبرداری یاobedienceاور وفاداری کی تھی اور کتنی نافرمانیاں۔

شہادت:

جب کوئی بندہ مغربی ممالک کی نیشنیلٹی قبول کرتا ہے تو اسے بھی باقاعدہ ایک تقریب میں عہد لینا ہوتا ہے کہ وہ اب سے، پرانے وطن کی جگہ، اس نئے وطن اور ملک اور بادشاہ کا وفادار رہے گا۔ ویسے ہی مسلمان بننے کے لیے بھی اللہ سے وفاداری کا حلف لینا ہوتا ہے۔ جسے شہادت کہتے ہیں۔ اسلام کے سسٹم کو قبول کرنے کے لیے بھی پبلک میں اقرار اور اعلان کرنا ہوتا ہے کہ میں دوسرے معبودوں کو چھوڑ رہا ہوں اور اب صرف اللہ کو اپنا واحد معبود مانتا ہوں اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرونگا۔ تا کہ ہر ایک کو پتہ چل جائے کہ یہ آج سے مسلمانوں کے گروہ یا سوسائٹی کا حصہ بن گیا ہے۔ پہلے اللہ کو اپنا مالک مانتا ہے۔ پھر یہ مانتا ہے کہ اسے ٹریننگ کون دے گا۔

پہلا حصہ: **اشهد ان لا اله الا الله** ، میں گواہی دیتا ہوں کہ صرف اللہ ہی کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

دوسرا حصہ: **و اشهد ان محمد عبده و رسوله**۔ اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔

پہلا حصہ۔ سورہ والناس،114 ، میں اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے لیے تین حیثیتوں یا roles کا اعلان کرتا ہے۔ لوگوں کا رب، ، اور لوگوں کا مالک یا بادشاہ، اور لوگوں کا الہ یا معبود۔ تینوں حیثیتوں میں اللہ کو تسلیم کرنا ہوتا ہے۔

جیسے کسی بھی ملک میں جائیں تو وہاں کے قوانین کے مطابق رہنا ہوتا ہے تو یہ زمین اور اس کی تمام چیزیں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کا ملک ہے۔ انسان خالی ہاتھ آتا ہے، اسے یہاں زندگی گزارنے کے لیے رب کریم سب کچھ مہیا کرتا ہے۔ مرتے وقت سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ چلا جاتا ہے۔ تو پھر یہ یقینی بات ہے جس کا ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ملک میں اس کی مرضی اور اس کے قوانین کے مطابق ہی ہم یہاں رہ بھی سکتے ہیں اور اس کی چیزیں بھی اسی کی ہدایات کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں، جیسے حکومت یا کسی کمپنی کی چیزیں بھی ملازمین کی ملکیت نہیں ہوتیں صرف وہ استعمال میں لا سکتے ہیں جو رولز اجازت دیں۔ چیزیں غلط استعمال کرنے یا ضائع کرنے پر سزا مل سکتی ہے۔ اس لیے ہر انسان کو خدا کے رولز کا پتہ ہونا چاہئے۔

۲۔ دوسرا حصہ: شہادت میں اہم نقطہ نبی کریم ﷺ کے انسان ہونے کا اور اللہ کا بندہ یا غلام ہونے کی گواہی دینی ہوتی ہے۔ یعنی وہ صرف اللہ کے حکم یا سلیبس کے مطابق ٹریننگ دیتے ہیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے پہلے دونوں اہل کتاب اپنے نبیوں کو خدا کا بیٹا قرار دے چکے تھے۔ جبکہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہوتا ہے۔ (۴۶۔۹)

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد پھر ہم کس کا حکم مانیں گے؟

اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے:...... ”اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا، اور جو اختیار والے ہیں تم میں۔“ ((احسن تاویل)۔نساء4۔59)

یعنی اجتماعی زندگی کو منظم کرنے، چلانے اور عوام کی جان، مال، عزت کے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری حاکم وقت، بادشاہ، ملک کے صدر، یا وزیر اعظم پر ڈالی ہے اور ڈسپلن کے لیے عوام کو فرمانبرداری صرف حاکم وقت کے لیے مخصوص یا ریزرو ہے اور حاکم کو اللہ اور رسول سے رہنمائی لے کر ملکی قانون سازی اور قانون نافذ کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے جس کے لیے وہ آخرت میں ذمہ دار ہوگا جس کے لیے قرآن کی اتھارٹی

اوپر دی گئی ہے۔

صرف حاکم ہی عوام کی جان، مال، عزت کی حفاظت، ان کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہوگا اور لوگ بھی اپنے مسائل کے حل کے لیے حکومت کے پاس ہی جائیں گے اور حل نہ ہونے پر اس کے خلاف ہی احتجاج کر سکیں گے۔ اس لیے عوام کی وفاداری اپنے وطن اور ملک، اور حاکم وقت کے ساتھ ہونی چاہئے۔ چاہے حاکم کسی بھی مذہب، مسلک، کلچر، زبان، نسل، سے تعلق رکھتے ہوں، کیونکہ حاکم کے لیے وہ سب شہری برابر ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ مذہبی رہنماء صرف اور صرف advisory capacity میں ہوتے ہیں۔

ہماری کلمہ شہادت کی موجودہ صورت حال بدوؤں کی طرح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ حجرات ۴۹۔۱۴ میں فرماتا ہے کہ: **"بدوؤں نے کہا ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔"**

ہم پیدائشی اور نام کے مسلمان ہیں۔ اس لیے ایمان کے سلسلے میں بدوؤں کی طرح ہیں۔ جس گھر میں بچہ پیدا ہوتا ہے وہ والدین اور خاندان کا مذہب اختیا کر لیتا ہے۔ سنی شیعہ، حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی، ہندو، یہودی اور عیسائی، بدھ وغیرہ بن جاتا ہے۔ اور اپنے معاشرے کے مذہب کے مطابق ساری عمر رہتا ہے۔ ان میں سے جو خود اللہ کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں اور مسلمان بن جاتے ہیں تو وہ ایمان کے اونچے لیول پر ہوتے ہیں کیونکہ شعوری فیصلہ کرتے ہیں۔ ان نومسلموں کی طرح ہم میں سے ہر ایک کو بھی اپنے طور پر پھر سے مسلمانی سے مومن بننے کا سفر شروع کرنا ہوگا اور محنت کر کے شعوری طور پر اسلام کو دریافت کر کے اپنی اصل پہچان پھر سے ایمان والوں کی بنانی ہوگی۔

بچپن میں ملکی قانون اور شریعت لاگو نہیں ہوتی۔ والدین بچوں کے لیے اللہ اور ملکی قوانین کے آگے ان کے قول فعل کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں اور ان کی تعلیم اور تربیت

کر کے انہیں بلوغت تک قانون اور شریعت پر عمل کے لیے تیار کرنے کے ذمہ دار بھی۔

بچے کب بالغ ہوتے ہیں اور کب شعوری شہادت دیتے ہیں؟

ہم نے اس معاملے پر کبھی سوچا ہی نہیں، اس لیے ہم بالغ ہونے پر ان سے شہادت یا اللہ کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھواتے ہی نہیں ہیں۔ مگر یہودی چونکہ سوچ سمجھ والی قوم ہیں، تو وہ باقاعدہ بلوغت اور ذمہ داری سنبھالنے کا اعلان کرتے ہیں تاکہ بچوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے۔ جب کوئی بچہ یا بچی بالغ ہو جاتی ہے تو ان کی عبادت گاہ میں ایک تقریب ہوتی ہے جس میں وہ سب کے سامنے بالغ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں اور تورات کا ایک صفحہ ثبوت کے طور پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد مستقبل میں اپنے مذہبی افعال اور اعمال کی ذمہ دای قبول کرتے ہیں اور ان کے والدین بھی باقاعدہ اعلان کر کے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ان کی تعلیم اور تربیت کر دی ہے اور اس تقریب کے بعد سے وہ دنیا اور خدا کے سامنے اس بچے یا بچی کے اعمال کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ یہ ایک بہت اچھا آئیڈیا ہے جسے ہمیں اپنا لینا چاہیے۔ اس سے والدین کو بچوں کو کم سے کم مذہبی تعلیم، کلام پاک پڑھ سکنے کی صلاحیت دینے کا احساس ہو گا۔ کیونکہ تقریب میں ثبوت دینا ہو گا۔ ساتھ ہی بچوں کو بھی پتہ چل جائے گا کہ اب کوئی قانون توڑا تو اسے ہی سزا ملے گی، والدین کی سپورٹ نہیں ملے گی۔

مالک کسی بھی وقت کسی بات پر ناراض ہو سکتا ہے اور سزا کے علاوہ نوکری سے بھی نکال سکتا ہے۔ اس لیے مالک سے ڈرتے رہنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ مالک کتنی بھی محبت اور خیال سے پیش آئے مگر بندے کو اپنی حیثیت یاد رکھنی چاہیے اور بھول کر بھی غلط فہمی میں گرفتار ہو کر liberty نہیں لینی چاہیے۔ ہمیں اللہ کے مقابلے میں اپنی اوقات اور حیثیت یاد رکھنے کے لیے ایک مثال دے رہا ہوں۔ محمود غزنوی کو اپنے غلام ایاز سے بہت محبت تھی۔ لوگوں نے حسد کی وجہ سے محمود کو بتایا کہ شاید یہ کوئی مال چوری کر

رہا ہے کیونکہ ہر رات کو اس کے کمرے سے صندوق کھولنے اور بند کرنے کی آواز آتی ہے۔محمود نے ایاز سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں آپ کی محبت کی وجہ سے اپنا دماغ خراب کر کے متکبر نہیں بننا چاہتا اس لیے ہر رات کو اپنا غلامی کا لباس دیکھتا ہوں تا کہ مجھے اپنی حیثیت یاد رہے۔

سبق:

ہمیں سوچ سمجھ کر، شعوری طور پر فیصلہ کر کے دل سے اللہ کی حاکمیت کا اعتراف اور اس کی فرمانبرداری اور وفاداری کا حلف اٹھانا چاہیے۔تبھی مسلمان سے مومن بننے کا سفر شروع ہوگا۔اور اللہ تعالیٰ کو ہر وقت پاس کی طرح سمجھنا چاہئے،تب حکم عدولی نہیں ہوگی۔ایاز کی طرح،اپنے آپ کو،اپنی بندگی کی حیثیت اور اللہ کے مالک ہونے کو یاد کرنا چاہیے تا کہ اللہ کا ڈر دل میں رہے۔یہی عقل مندی کا سودا ہے۔ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ گواہی دلا رہا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ اس کے بندے اور رسول ہیں۔اس لیے ان کو اہل کتاب کی طرح ان کو عظمت دینے کے لیے غلط عقیدے اختیار نہ کر لیں۔تمام دنیا نبی پاک ﷺ کو انسان قرار دے کر ان کے انسانی کارناموں کی وجہ سے ہی ان کو بہت بڑا انسان سمجھتی ہے۔ہمیں بھی اسوۂ حسنہ کو انسانی اور، معاشرتی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے تو تبھی دنیاوی معاملات کے اسوۂ حسنہ کی صحیح سمجھ آئے گی۔نماز کا ترجمہ پتہ ہونا چاہیے تا کہ یاد رہے کہ اس کے دوران کیا حلف اٹھا رہا ہے۔اس کا پابند بھی رہے۔

☆......☆......☆

۵۔نقل ہی سیکھنے کا فطری طریقہ ہے۔

نقل کی حقیقتیں یا اصول

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے اسوۃ کو حسین نمونہ یا رول ماڈل قرار دیا ہے۔جس کی ہمیں نقل کرنے کا حکم دیا ہے جو یہ ثبوت ہے کہ انسانوں کی یہی ڈیزائین شدہ فطرت ہے۔

لَقَد كَانَ لَكُم فِی رَسُولِ اللّٰه اُسوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ یَرجُو اللّٰلهَ والیَومَ الآخِرَ وَ ذِكُرَاللّٰه كَثِیراًO (سورہ احزاب۔آیت 21)

''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔''

اس رول ماڈل کی نقل کر کے ہی اپنے اخلاق کو بہتر سے بہتر بنا کر دنیا کو دکھانا ہے۔کہ مسلمان کا کریکٹر کیسے ہوتا ہے۔تبھی وہ اسلام کے پیغام کی حقانیت پر یقین لائیں گے۔اس لئے، میرے خیال میں، تلاوت قرآن مجید کی طرح، ہر گھر میں سیرت النبی ﷺ کی کتاب بھی ہر روز پڑھی جانی چاہیے اور اس کے مطابق عادات بناتے رہنا چاہئے۔

اسوہ حسنہ میں اللہ تعالیٰ کس بات کی نقل کرنے کی نصیحت کر رہا ہے؛

وَمَآ اَرُسَلنٰکَ اِلاَّ رَحمَةً لِلعٰلَمِینo (سورۃ انبیاء۔آیت 10)

''ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔''تفہیم القرآن

آپ ﷺ کا اسوہ ہر لحاظ سے تمام عالمین کے لیے رحمت ہے تو ہمیں بھی تمام

انسانوں کے لیے رحمت بننا ہے۔ اور رحمت بننا صرف انسانی محبت اور بہترین اخلاق سے ممکن ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ آپ ﷺ دراصل انسانی اخلاق کی تکمیل کے لیے اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

اوپر کی آیت سے ایک اصول یہ بھی نکلتا ہے کہ جو انسانی فطرت پر مبنی ہے کہ انسان ہمیشہ دوسروں کی مثال یا نقل یا سکھانے سے ہی سیکھ سکتا ہے یعنی زیادہ تر لوگ عام طور پر دوسرے کو دیکھ کر سیکھتے ہیں۔ FOLLOWERS ہوتے ہیں۔ جبکہ سوچنے اور ایجاد کرنے والے یعنی ORIGINAL THINKERS بہت کم ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو دنیا کو قانون اور سسٹم SYSTEMS دیتے ہیں وہ تو بہت ہی کم ہوتے ہیں اور یہ اللہ کے منتخب انسان ہوتے ہیں۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کو دنیا کے سو بڑے آدمیوں میں سے اول نمبر دیا گیا ہے۔ میں نے نقل کے چند بنیادی اصول لکھنے ضروری سمجھے ہیں۔

نقل کا پہلا اصول:

''یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہر کوئی دوسرے کو دیکھ کر سیکھتا ہے، کوئی آدمی زندگی میں نقل کے اصول کو نظر انداز نہیں کرسکتا کیونکہ یہ انسانی فطرت میں ہے کہ جو دوسرے کرتے ہیں وہ ان جیسا ہی کام کرتا ہے مثلاً بچہ اپنی ماں کی نقل اتارتا ہے۔ سب سے پہلے وہ وہی کام کرتا ہے جو اس کی ماں کرتی ہے۔ غریب امیر کی نقل کرتا ہے۔ ترقی پذیر ملک ترقی یافتہ مغربی ممالک کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتے ہیں۔''

دوسرا اصول:

ہمیں مختلف'' ہونے سے ڈر لگتا ہے اس لیے نقل کا مقصد یکسانیت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ڈر انسانی نسل کی بقا کے لیے ضروری بھی ہوتا ہے تا کہ سب ایک ہی جیسے لگیں اور ایک ہی جیسے رہ سکیں اسی میں آسانی ہوتی ہے۔ شروع زمانے سے ہی نقل قبیلہ کی بقا، اتحاد اور پہچان کا ذریعہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ ایک خاص طرز عمل، لباس، وغیرہ پر اصرار کرتا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی رائے اور عادات ماحول کے مطابق

بدلتے رہتے ہیں۔ ہم ویسے ہی کرتے ہیں جیسے کہ دوسرے کررہے ہوتے ہیں۔۔ ہم فیشن کے اثرات کو بخوبی جانتے ہیں۔ وہ اسی طریقے سے سوچتے ہیں جیسے دوسرے سوچتے ہیں۔"

"اسی اصول سے قومیں، نسلی اکائیاں، فوج، مذہبی فرقے، سکول، کالج کی ٹیمیں، مختلف نسلیں، ملک، کلچر، مشترکہ پہچان کے لیے اسٹینڈرڈ لباس، رویئے اپناتے ہیں۔ فوج اور مذہبی فرقوں کی مختلف رنگوں، ڈیزائین کی ٹوپیاں، پگڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہ سب دراصل پرانے طریقوں کو بچاتی بھی ہے۔ یہ قوم پرستی کا ایک جزو ہے۔"

تقلید کے نقصانات: کیسے قومیں بتدریج زوال پذیر ہوتی ہیں؟

"زیادہ تر لوگوں کو پڑھایا نہیں جاتا بلکہ وہ ایک دوسرے سے چیزیں سیکھتے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سارا غلط ہوتا جاتا ہے کیونکہ بجائے مکمل اور صحیح طور پر سیکھنے کے وہ ایک دوسرے سے صرف چھوٹے چھوٹے حصے سیکھتے ہیں۔ مثلاً احمد نے محمود سے سیکھا۔ محمود نے اسلم سے اور اسلم نے اشرف سے اور اشرف کو پوری طرح آتا نہ تھا۔ اس طرح ایک ادھوری بات سب تک پہنچ گئی۔ اور اس طرح بعض اوقات نسلوں کی نسلیں غلط بات کو صحیح مانتی رہتی ہیں۔ اس طرح کی نقل سے کتنا نقصان ہوتا ہے اندازہ لگالیں۔"۔ اس لیے ہمیں اپنے اسلامی اور دنیاوی نظریات کو پرکھتے رہنا چاہیے کہ کہیں ہم بھی اس ادھوری بات پہنچنے سے غلط مائینڈ سیٹ میں تو مبتلا نہیں ہوگئے۔

نقل کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اندھی تقلید ہی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے:

ہم سب جانتے ہیں کہ معاشرے باپ دادا کے رسم و رواج پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور یہی اصرار ترقی میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ اور آج کل بھی دنیاوی اور مذہبی اندھی تقلید ترقی میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ فطرتاً ہم اجنبی لوگوں یا نئے خیالات یا نئی عادات کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ ماضی میں مذہبی اختلاف پر زندہ جلا دیا جاتا تھا جبکہ برما اور ہندوستان میں اب اقلیتوں کے خلاف بھی یہی شروع ہوا ہے۔ ہمارے لیے بھی ترقی

کے لیے زرعی سے صنعتی زندگی اپنانا مشکل بن گیا ہے کیونکہ ہمیں مغربی ورکنگ طرز زندگی اپنانا ہوگا۔ ہم اسی کشمکش میں گرفتار ہیں ۔ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے ہمیں بہرصورت بہتر طریقوں کو اپنانا ہی پڑے گا۔ جن قوموں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا وہ ترقی کر گئے ہیں۔

جہان تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پر اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

چوتھا اصول: لوگ نئی چیز کر کے خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔

''جو بھی کوئی نئی چیز یا نیا انداز شروع کرتا ہے وہ خطرہ میں ہوتا ہے۔اس کو عام طور پر شہید بنا دیا جاتا ہے۔لوگ جدت پسند کو اس کی موت کے بعد ہی تعریف کریں گے۔یہی وجہ ہے کہ مفادات خطرے میں پڑنے کے ڈر سے ہم ہر نئے آئیڈیا سے ڈر جاتے ہیں۔مذہبی اور سیاسی رہنماء، اور اشرافیہ اسی لیے مساوات، انصاف، آزادی رائے، یونیورسل تعلیم، خواتین کے اسلامی حقوق، بنیادی انسانی حقوق کی ڈیمانڈسن کر گھبرا جاتے ہیں۔

ماضی کے غلط خیالات کو غلط ثابت کرنے یا سچ دریافت کرنے اور بولنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے، تاریخ بھری پڑی ہے۔آپ ماضی کی بات کو غلط ثابت کر دیں تو اسے بزرگوں کی بے عزتی کا ایشو بنا لیا جاتا ہے۔۔ ماضی میں سائینس دانوں کو چرچ سے جان بچانے کے لیے اپنی دریافت سے رجوع کرنا پڑتا رہا ہے۔کئی نے زہر کا پیالہ پینا قبول بھی کیا تھا۔اس کا حل یہ ہے کہ پرانی چیز کے ساتھ تھوڑا سا نیا خیال ڈال دیا جائے تو پھر وہ قابل قبول ہو جاتا ہے۔''

پانچواں اصول: نقل ہمیشہ اپنے سے بہتر فرد، قوم، کلچر یا تہذیب کی، کی جاتی ہے۔

امیر کبھی بھی غریب کی نقل نہیں کرتا۔ یورپ میں چودھویں صدی تک

یونیورسٹیوں میں مسلم سکالرز کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں کیونکہ مسلم تہذیب ہی برتر تہذیب تھی۔آج کل ہم مغربی تہذیب کی نقل کرتے ہیں کیونکہ وہی دنیا کی برتر تہذیب ہے۔جاپان،کوریا،سنگاپور،چین نے مغربی تعلیم،سیاسی نظام،معاشی نظام اور کلچر اپنا کر ہی ترقی کی تھی۔

اگر موجودہ اسلامی نظام جس کو ہم رائج کرنے کی کوشش کررہے ہیں،اسلامی کلچر کی برتری ثابت نہیں کرسکتا تو پھر دنیا ہماری نقل کیوں کرے گی؟ کونسٹن ورجیل کی کتاب کا نام،"**محمد ﷺ،جنہیں پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔**"بہت مناسب ہے۔ ہمیں بھی اسوۂ حسنہ کو دوبارہ دریافت کرنا ہوگا۔اپنے زمانے میں بھی اسوۂ حسنہ ماڈرن خیالات پر مبنی تھا اور مجھے یقین ہے کہ ہم جب اسوہ کو سوشل نظر سے دیکھیں گے تو ہم دنیا کو آج بھی بہترین معاشرتی سسٹم دے سکتے ہیں مگر یہ کام عام مسلمان،اورسوشل سائینٹسٹ کو کرنا ہے۔خواتین کا اس میں خصوصی رول ہے کیونکہ رسوم،کلچر،نئ نسل کی تعلیم اور تربیت اور آداب سکھانا انہی کا شعبہ ہے۔

نقل کیوں کی جاتی ہے؟

نقل دراصل آسانی اور تیز رفتار ترقی کے لیے کی جاتی ہے۔کیونکہ اپنا سسٹم ابتداء سے شروع کر کے بنانے میں بڑا وقت لگتا ہے۔اس لیے ہم نے اگر برتر کلچر بننا ہے تو پہلے مغربی ممالک سے پورے کا پورے سسٹم سیکھ کر پندرہ بیس سال میں ان کے برابر آجانا اشد ضروری ہوگیا ہے جیسے جاپان نے کیا تھا۔جیسے کہ چین نے روس اور،مغربی دنیا سے سیکھا،اور اب وہ نئے آئیڈیاز پیدا کرنے میں امریکہ سے بھی آگے ہیں، اورانہوں نے اوریجنل چینی طریقے نکالے ہیں ۔اس طریقے کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔

عوام آگے کی طرف دیکھتے ہیں پیچھے کی طرف نہیں۔جبکہ ہر ملک کے مذہبی رہنماء ماضی کو لوٹنا پسند کرتے ہیں ۔سیاسی لیڈر بھی سچ مساوات انصاف پر مبنی اسلامی کلچر

سے ڈرتے ہیں کیونکہ یہ مکمل فرعون بنے ہوئے ہیں تو وہ مساوات پر مبنی نظام کیوں نافذ کرنے دیں گے۔ ابوجہل کو بھی یہی شکایت تھی کہ مساوات کا نام نہ لیا جائے، نہ انصاف کی بات۔ اس لیے ہمیشہ کی طرح، اسلام کی دریافت اوراس کو معاشرے میں ذاتی لیول پر پریکٹس کرنا عوام کی ذمہ داری بن گئی ہے۔ اخلاق، کردار، بنیادی انسانی حقوق، معاملات وغیرہ سب ذاتی فعل ہیں۔ عوام نے ہی ان سب پر رضا کارانہ عمل کر کے ہی اسلامی تہذیب اور کلچر کو نافذ کرنا ہے، حکومتی آرڈرز کے ذریعے زبردستی نفاذ کی امید لگانا غلط سوچ ہے۔ ہم مسلمان بھول رہے ہیں کہ ہمیں اسی دنیا میں رہنا ہے اور سب کا مقابلہ کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم نقل کے اصول کے مطابق زیادہ تر چیزوں میں ترقی یافتہ ملکوں کے مطابق چلیں مگر بنیادی عقائد اور اصولوں پر بھی محکم رہیں۔

تمام مغربی اور ترقی یافتہ قومیں مکی دور کی کاپی کر کے ترقی یافتہ ہوئی ہیں۔ نبی بننے سے پہلے بھی اسوۂ حسنہ صداقت سے شروع ہوا تھا۔ یہ سنت ہے کہ لیڈرشپ کے لیے انسان سازی میں ذاتی لیول پر پہلا قدم سچ بولنا اور امانت ہے۔ اور اجتماعی لیول پر انسانی مساوات، شرفِ انسانی اور انصاف ہے۔ مدینہ میں اسلامی نظام کے نفاذ سے پہلے نشاۃ ثانیہ مکی دور سے شروع ہوتا ہے جو تیرہ سال پر محیط ایمان اور انسان سازی کا پروگرام تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں دوسرا دور شروع ہوا تھا جس میں اسلامی نظام، کلچر اور تہذیب کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

آپ ﷺ نے تیرہ سال تک مکی دور میں یہ سب باتیں ٹیچر کی طرح سکھائیں۔ عمل کروایا۔ تربیت دی۔ تب جا کر آپ کو مدینہ ہجرت کر کے وہاں حکومت بنانے کا حکم ہوا اور تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ نے ہر فیلڈ میں بہترین کارکردگی دکھائی۔ جبر سے کام نہیں لیا۔ بلکہ رحمت سے، خیر خواہی سے، ہر کام کرنے کی وجہ سمجھا کے قائل کر کے احکامات پر عمل کروایا۔ دیکھیے مسٹر کریگ نبی کریم ﷺ کی حکمت عملی کو کیسے بیان کرتا ہے

"MUHAMMAD, WORKING BY PERSUATION AND MORAL FORCE RATHER THAN BY DECREE, SET OUT TO MAKE MADINA THE PERFECT CITY,, MAN

MADE LAWS, THE EDIFICE OF PERFECT CITY, WERE ADMINISTERED MILDLY. THEY COVERED ALL ASPECTS OF EVERY DAY LIFE, FROM DEALINGS IN THE MARKET PLACE TO THE MANAGEMENT OF HOUSE HOLDS, AND MOHAMMAD USED THEM TO TEACH RATHER THAN TO PUNISH, TO REFORM RATHER THAN TO AVENGE."'BILAL' Quartet Books London Page 121 . 1997

سبق

ہمیں اسلامی نظام کی جگہ پہلے اسلامی کلچر کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا جو کہ کردار، اخلاق، حقوق العباد، معاملات اور انسانی اخوت پر مبنی ہو۔ان پر عمل سے اسلامی نظام خود ہی تشکیل پا جائے گا۔جیسے کہ ملائیشیاء میں ہو رہا ہے کہ وہاں کا زکوۃ کا نظام، حکومت پر اعتماد کی وجہ سے حکومتی سر پرستی میں ترقی کر رہا ہے اور حکومت سو فیصد فطرانہ کو جمع اور تقسیم کر رہی ہے اور بیس فیصد سے زیادہ لوگ زکوۃ بھی حکومت کو دے رہے ہیں جبکہ بے اعتمادی کی وجہ سے ہمارا زکوۃ کا سسٹم تقریباً فیل ہو چکا ہے۔

اگرچہ آج کل انٹر نیشنل اثرات سے بچنا بھی محال ہے مگر پھر بھی حل نکالا جا سکتا ہے جیسے جاپانی کرتے ہیں کہ ورکنگ کلچر مغربی ہے، مگر گھر کا کلچر جاپانی ہوتا ہے۔ہم بھی گھر میں اسلامی کلچر پریکٹس کر سکتے ہیں۔

ہمیں اندھی تقلید کو چھوڑ کر ہر فرد، عورت، مرد کو پنگھوڑے سے قبر تک علم حاصل کرنے والی حدیث پر عمل کرنا ہوگا۔اور قرآن کو فرسٹ ہینڈ نالج سے سیکھ کر زندگی کے اصول دریافت کرنے ہوں گے اور ان پر ملٹری ڈسپلن کی طرح ذاتی عمل کرنا ہوگا۔اسلام دراصل ڈسپلن کی زندگی کا ہی دوسرا نام ہے۔اپنی مرضی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔اللہ کی مرضی کے مطابق ڈسپلن والی زندگی گزارنی ہوتی ہے۔

ہمیں پہلے گھر سے شروع کرکے، اپنی ذاتی اور پاکستان کے نشاۃ ثانیہ کو مقصد

بنانا چاہیے اور جاپان کے 1853ء کے قومی غیرت اور نشاۃ ثانیہ کے ماڈل کی سٹڈی کر کے تیز ترقی کرنی ہوگی۔ ہم پہلے ہی چالیس پچاس سال ضائع کر چکے ہیں۔ یہ بہت اہمیت کی بات ہے کہ سیاسی، مذہبی، معاشرتی لیڈرز مشترکہ جوائنٹ سٹڈی کر کے معاشرے کی تنظیم نو کریں۔ کتابیں لکھ کر عوام کی سوچیں بدلنی ہوگی۔ ان کو اپنے حقوق کی تعلیم دینی ہوگی ساتھ ہی ملک کے ان پر کیا حقوق ہیں ان کو بتانا ہوگا۔

کثیر المذاہب اور کثیر المسالک کی موجودگی میں نبی کریم ﷺ کی سنت، یعنی میثاق مدینہ کو اس کی روح کے مطابق اپنانا ہوگا۔ جس میں ملکی شہریت کو تعلق کی بنیاد بنانا اور مذہب، نسل، زبان اور کلچر کو ذاتی پریکٹس رکھنا ہوگا۔ اور وحدت افکار پیدا کرنی ہوگی۔ اور یہ میثاق مدینہ کے مطابق صرف کامن مستقبل کی حفاظت کا مقصد ہی بنیاد فراہم کرسکتا ہے۔

ے ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت اقبالؒ

☆......☆......☆

۶۔ معلم بن کر سکھانا ہی سنت ہے

حدیث پاک: ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

قرآن میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کے چار فرائض یا مقاصد بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ کلام پاک کی آیات کی تلاوت۔ (یعنی اسلام کی فلاسفی اور احکامات کی تعلیم)

۲۔ تزکیہ نفس (انسان سازی، مثبت کردار اور منفی سوچ سے چھٹکارا)

۳۔ حکمت سکھانا، (دلیل اور سچ پر مبنی حقیقت پسندانہ فیصلے کرنے کی صلاحیت)

۴۔ اور وہ باتیں سکھانا جو لوگ نہیں جانتے تھے۔ (آداب، نئے علوم، مرنے کے بعد کی زندگی کی تفصیل وغیرہ)

تزکیہ نفس سے ہی اعلیٰ ذہنی تربیت اور اخلاقی قدروں کو بلند کیا جا سکتا ہے، اور منفی اور ناپسندیدہ عادات اور سوچوں سے نفس کو بچا سکتے ہیں۔ اسی لیے اپنی بعثت کے بعد آپؐ نے اس امر کا اعلان فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور بہترین اخلاق کی تکمیل میرا مشن ہے۔ جس کا نتیجہ اس دنیاوی زندگی کو بہترین سسٹم دے کر جنت بنانا ہے۔ حکمت دراصل صحیح فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں۔

آپ کا طریقہ کار: آسان زبان۔ مثال اور دلیل سے سمجھانا تھا۔

اپنے پیغمبری کے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آپ کا طریقہ تعلیم عوام الناس کو اس انداز سے خطاب کرنے کا تھا کہ ایک عام معمولی فہم کا شخص بھی آپ ﷺ کے مقصد کو بخوبی سمجھ جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کو اولین ماننے والوں میں نچلے طبقے کے ہی زیادہ تر لوگ تھے۔ جن کو بھی پیغام کی فوراً سمجھ آ جاتی تھی۔ آپ بات مختصر کرتے تھے، ٹھہر ٹھہر کر کہ لوگ لکھ بھی سکتے تھے۔ آپ کتابیں دیکھیں تو آپ کے سارے خطبات بھی بہت ہی مختصر ہوتے تھے۔ ایک وقت میں ایک بات کی ہی سمجھ دلائی جاتی تھی۔

Standardisation۔آپ پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل لیڈر بھی تھے۔اس لیے آپ کا مقصد مسلمانوں میں نظریات، تعلیم، تربیت، علم و عمل کی وحدت یاhomogenityپیدا کرنا تھا۔تا کہ تمام افراد کے سٹینڈرڈ standard behaviour pattern۔اورpredictableرویے ہوں، جیسے فوجیوں میں ہوتا ہے کہ سب کو پتہ ہوتا ہے کہ ایک خاص حالت میں ایک فوجی کیا کرے گا۔

رسول اکرم ﷺ دو طریقوں سے تعلیم دیتے تھے، ایک اپنے قول کے ذریعے اور دوسرے اپنے عمل کے ذریعے۔ اس لیے ہمیں بھی تعلیم اور تربیت انہی دو طریقوں سے دینی چاہئے۔مثال کے ذریعے سکھانا زیادہ متاثر کرتا ہے۔صرف الفاظ کا اثر ہو بھی تو دیرپا نہیں ہوتا، جیسے آج کل ہو رہا ہے۔سیاسی اور دینی رہنما، استاد، والدین اسوۂ حسنہ کی مثال نہیں بن رہے۔مغربی دنیا میں مثال ہی معاشرے کی تربیت کا ذریعہ ہوتی ہے۔

معلم بن کر تعلیم دینے کا طریقہ:

مختلف قبائل کے لوگ مدینہ آتے، وہاں رسول اکرم ﷺ سے ضروری مسائل سیکھتے اور واپس جا کر اپنے قبیلے کے دوسرے افراد کو تعلیم دینے لگتے۔ہم نے آج صرف عبادات اور فقہ کو ہی سارا علم قرار دے لیا ہے جبکہ اصل اسلامی علم تو سوشل علم ہے، اسلامی کلچر کا علم ہے جس میں کردار سازی، حقوق العباد، معاملات کا علم شامل ہے۔اس سنت طریقے کو اپنانے اور زندہ کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ علماء کرام اور مشائخ لوگوں کو ان مضامین کی تعلیم دیں اور وہ جا کر گھر، محلے، گاؤں میں تعلیم دیں۔مثلاً اگر ایک وقت میں عوام کو صرف ایک بات بتا دیں کہ ہر ایک دوسرے کے لیے آسانیاں پیدا کرے، یا ہر جگہ صفائی رکھیں۔اور وہ جا کر ان کو پریکٹس کر کے عادت بنا لیں تو پھر دوسری بات بتائیں تو ہمارا معاشرہ چند سال میں یورپ کے برابر ہو جائے گا۔کوئی سڑک پر، یا پارک میں کوئی چیز نہیں پھینکے گا تو شہر محلے صاف ستھرے نظر آئیں گے۔

بیعت کا طریقہ:

نبی کریم ﷺ ہر عورت اور مرد کو جنرل یا عام بیعت نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ایک کی شخصیت یا ضرورت کے مطابق چند اخلاقی عادت اپنانے کی باتوں کا عہد لیتے تھے یا کسی بری عادت کے چھوڑنے کا عہد لیتے تھے۔ آپ کو انسانی فطرت کا گہرا علم تھا کہ شروع میں بہت کم بوجھ ڈالا جائے کیونکہ انسانی تبدیلی بہت وقت لیتی ہے۔ یہ بجلی کا سوچ switch on or off آن اور آف کرنے والا معاملہ نہیں ہے۔ آج کل کردار سازی کی بیعت لینے کا رواج نہیں ہے۔ اس سنت کو بھی زندہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اگر کسی کو مرید کرتے دو تین اخلاقی باتوں کی بیعت لی جائے تو معاشرہ بہتر ہونا شروع ہو جائے گا۔

مشاہدہ سے دلیل بنا کر سکھانے کا طریقہ:

ایک دفعہ ایک عورت کھانا پکا رہی تھی۔ بچہ پاس کھیل رہا تھا۔ وہ بار بار قریب آتا تو ماں اسے پرے ہٹاتی کہ کہیں سینک نہ لگ جائے۔ اس پر آپ نے لوگوں سے پوچھا، کیا ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ عرض کیا حضورؐ، یہ اسے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی، آگ میں کیسے پھینک سکتی ہے؟ اس پر آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ اللہ رب العزت بھی اپنے بندوں پر ظلم کا ہرگز ارادہ نہیں کرتا۔ یہ بندے ہی ہیں جو نافرمانی کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور سزا کے مستحق بن جاتے ہیں۔

خواتین کو تعلیم کے لیے استعمال کرنا

آپؐ کی ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کو کئی علوم میں عبور حاصل تھا۔ جن میں ادب، طب اور شاعری بھی شامل تھے۔ غزوات میں زخمیوں کی فرسٹ ایڈ اور مدینہ میں گھروں یا خیموں میں علاج عورتوں کے فرائض میں شامل تھا۔

کونسٹن ورجیل کے مطابق:

''حضرت آمنہ اپنے شوہر کا غم بھلانے اور تنہائی اور تہی دستی میں اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر شعر کہنے اور پڑھنے کا سہارا لیتی تھیں۔اس زمانے میں جزیرۃ العرب میں معزز طبقے کی خواتین شعر کہنے کا ذوق رکھتی تھیں، اور مجھے (یعنی کونسٹن) آمنہ کے کہے ہوئے چند اشعار جمع کرنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے۔(صفحہ۔۱۰)''

کونسٹن کی کتاب، سیرت کے وہ پہلو سامنے لاتی ہے جس کو ہمارے مذہبی حلقے سامنے نہیں لا سکے اور شاید اسی وجہ سے، مذہبی حلقے اب بھی فنون لطیفہ میں خواتین کی شراکت کو اچھا اور اسلامی نہیں سمجھتے۔حالانکہ امہات المومنین کے ادب، شاعری کرنے کے ثبوت کے بعد ماضی میں عورتوں پر ان مضامین کی پابندیاں لگانا یقیناً صحیح بات نہیں تھی اور نہ اب بھی ہے۔اور نہ ہی خواتین کی تعلیم پر حدود مقرر کرنا یا پابندی لگانا یا یہ کہنا کہ عورتوں کو صرف پڑھنا سکھاؤ، لکھنا بالکل نہیں، صحیح نہیں تھا (بہشتی زیور، مولانا تھانوی، پہلا حصہ، مضمون تعلیم نسواں) ہمیں تو مرنے تک لگاتار علم میں اضافہ کرتے رہنے کا نبوی حکم ہے۔اور علم پڑھنے اور لکھنے دونوں سے آتا ہے اور لکھنے سے دوسروں کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کا ایک فرض یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دوسری خواتین کو تعلیم دیں۔خواتین میں یہ سنت طریقہ رائج کرنے کی بھی ضرورت ہے تا کہ محلے لیول پر خواتین کو صرف مذہبی نہیں بلکہ علمی، خلاق، حقوق العباد، سوشل معاملات میں حصہ لینے کی عادت پڑے، خصوصاً آداب کی تعلیم بھی شیئر کریں تا کہ وہ بچوں کو با کردار اور باادب بنا سکیں۔

آپ ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کا قائم کردہ نظام تعلیم و تربیت ہمہ گیریت، جامعیت، کاملیت اور آفاقیت کا پہلو لیے ہوئے ہے اور انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔اس لیے ہمیں بھی معلم بن کر دوسروں کو سکھانے کی سنت پر عمل کرنا

چاہیے اور معلم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ سکھانے کے لیے نئے سے نئے طریقے ایجاد کرے۔ سکھانے کی ٹکنیک، طریقے اور ذاتی علم میں بہتری لاتا رہے۔ ہر قسم کی مثالوں سے سمجھاتا رہے جب تک طالب علم کو سمجھ نہ آجائے۔

معلم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔ آداب زندگی بھی سکھاتا ہے۔ پاکستان بنتے وقت میں چوتھی جماعت میں تھا۔ اس زمانے میں کردار سازی کا جذبہ ہر سکول میں تھا۔ کسی بھی مضمون کا ٹیچر ہوتا، وہ کردار سازی، جنرل نالج، زندگی کے اصولوں کے لیے ہفتے میں ایک پیریڈ ضرور رکھتا تھا۔ آج کل تعلیم کمرشل ہوگئی ہے اور اس میں کردار سازی اور نیشن بلڈنگ کا عنصر غائب ہوگیا ہے۔

انبیاء کی تعلیم کا مقصد لوگوں کے اخلاق کو درست کرنا، زندگی کو اصولوں پر منظّم کرنا اور معاشرتی، معاشی، نفسیاتی لیول پر طاقتور بنانا ہوتا ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر کا سنا ہے کہ وہ اس سنت پر عمل کرتے اپنے آپ کو صرف اور صرف معلم کہتے ہیں اور کہتے ہیں جو مجھ سے سیکھا ہے جا کر دوسروں کو سکھاؤ۔

ڈاکٹر خالد علوی، 'انسان کامل' باب العلم میں صفحہ ۲۰۹ پر لکھتے ہیں: ''ایک معلم کے لیے سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ معلم ہیں۔ آپ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے جہالت کے خلاف جہاد کیا اور علم عام کرنے کا جھنڈا اٹھایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے معلم کے لیے بہترین مرتبہ تجویز فرمایا: علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ (بخاری۔۱،۲۵۔)

اس لئے علماء کو بھی اپنے علاقے میں جہالت دور کرنے کے لیے جھنڈا اٹھانا چاہیے۔ لوگوں کو بتائیں کہ گھر کا ایک فرد جو بھی فارغ ہو، آکر ایک بات سیکھ کر چلا جائے اور گھر والوں کو سکھائے۔ جب تک وہ بات پکی نہ ہوجائے دوسری بات نہ سکھائیں۔ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ حضرت عثمانؓ نے فرمایا تھا کہ ہم نبی کریم ﷺ سے چند آیات اور ان کے معانی سیکھ کر جاتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو سکھاتے بھی تھے اور عمل بھی کرتے تھے۔ جب تک وہ سبق مکمل طور پر اپنا نہ لیا جاتا تب تک دوسری آیات نہیں سیکھتے تھے۔

علماء کرام کے احترام میں آپ نے فرمایا، ''**وہ شخص میری امت سے نہیں جو**

ہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا اور چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے عالم کا حق نہیں پہچانتا۔ص ۲۱۰'' تو اس معاشرتی رتبے اور عزت کے بدلے کیا ان کا فرض نہیں بنتا کہ وہ نیشن بلڈنگ کے لیے سیاست کی بجائے انسان سازی میں سارا وقت لگا دیں اور خود بھی مثال بنیں۔یہی پاکستان کی ترقی کا نسخہ ہے۔علماء کرام اور مشائخ کا بہت اثر ورسوخ ہوتا ہے۔ان کی بات توجہ سے سنی جاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نئے سے نئے آئیڈیاز کے ساتھ تعلیم اور تربیت دیتے تھے۔اور قرآن کی تعلیمات کو سوشل سسٹم میں بدل دیتے تھے۔۔دین اسلام کے سوشل اصول رائج کرنے کے نئے آئیڈیاز مغربی سوچوں سے بہت پہلے نافذ اور پریکٹس ہو چکے تھے۔یعنی بہت ماڈرن تھے جن کی نقل صدیوں بعد مغرب نے کی ہے۔

> His (Prophet Muhammad PBUH) translation of much of the spiritual messege of the Koran into social reality showed Mohammad's genius as a law giver.He expressed human sympathies that in their time, the seventh century, were astonishing. Many of his social ideas were not realized institutionally in western civilization until the 19th and 20th centuries". CRAIG BOOK 'BILAL' Page 121,1997

بدقسمتی سے تقلید پر زور اور خود نہ سوچنے کی عادات نے ہماری سوچیں بانجھ کر دی ہیں اور نئے آئیڈیا پیدا کرنے سے عاری ہوگئی ہیں۔تو ہمیں بھی نبی کریم ﷺ کی سیرت سے کامیاب زندگی گزارنے کے لیے معاشرتی اصول سیکھ کر ان کو اپنی زندگی میں حالات کے مطابق ان پر پھر سے اسلامی کلچر کی بنیاد رکھنی ہوگی۔دنیا کے ہر گوشے میں اسلام،صوفیاء اور عام مسلمانوں کے سچ،مساوات،دیانت،انسانی ہمدردی کے کلچر کی وجہ سے پھیلا۔نہ کہ بادشاہوں کی وجہ سے یا تلوار سے فتوحات سے۔علم صرف دینی علم نہیں ہوتا بلکہ اس کی کوئی حد نہیں ہے،ہر علم علم ہوتا ہے۔مغربی ممالک میں مشہور کھلاڑی بچوں کو مفت کھیل سکھاتے ہیں۔سوشل سنٹرز میں مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں۔ہمارے

یہاں بھی اب رواج بننے لگا ہے کہ چھٹیوں میں لڑکیوں کو کھانا پکانا، پینٹنگ، مختلف ہنر سکھائے جاتے ہیں یہ خوش آئیند بات ہے کہ ہم علم کے محدود نظریے سے نکل رہے ہیں۔

سبق

سکول، کالج، یونیورسٹی، مدرسہ، مسجد، کسی پیشہ ورسکول کالج، سٹاف کالج، وغیرہ میں تعلیم اور تربیت دینے والے سب نبی کریم ﷺ کی معلم کی تعریف میں آتے ہیں۔ان سب پر ہی مسلمانوں کی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔انہیں اپنے مضمون میں اتنا علم، مہارت ہونی چاہیے کہ طالب علم کے کسی سوال کا جواب دے سکیں۔

ہمارے مدرسوں اور سکولوں دونوں کا طریقہ تعلیم رٹا لگوانا اور تقلیدی ہو گیا ہے اور اوریجنل سوچ اور ریسرچ کی عادت نہیں ڈالی جاتی۔ہمیں بچوں کو بچپن سے ہی سوال پوچھنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔خود بتانے کی بجائے پہلے بچوں سے سوال کر کے ان کے مشاہدے اور سوچوں کے لیول کو چیک کریں پھر پڑھائیں۔

مشاہدہ کرنا اور غور وفکر کرنا، سوال کرنا، سکھانا ہی علم کی بنیاد بناتا ہے۔اپنے علاقے کے پھولوں، درختوں جری بوٹیوں وغیرہ کا مشاہدہ، ان کے نام سیکھنا، پرانی بلڈنگز دیکھنا ان کے طرز تعمیر اور آجکل کی تعمیر میں فرق دیکھنا وغیرہ یہ سب علم میں شامل ہے۔

علم پھیلانے کی لیڈر شپ سنبھالنا ہر مسلمان مرد عورت کا فرض ہے۔مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش سب کو قائل اور مائل کرلے گی کہ عام مسلمان کو دین میں ریسرچ کا حق بھی ہے اور فرض بھی تا کہ وقت کے مطابق ہم نئے آئیڈیا پیدا کرنے کی سنت رسول کریم ﷺ کو پریکٹیکل شکل دے کر زندگی کو بہتر سے بہترین بناتے جائیں۔یہی اپلائیڈ اسلام ہے۔یہی پریکٹس ہونا چاہئے۔یہی نئی نسل کے لیے پیغام ہے۔

☆......☆......☆

۷۔اسلامی تہذیب اور کلچر کی بنیاد بچپن کی تربیت سے رکھی جاتی ہے۔ بڑے ہو کر نہیں

سید سرفراز احمد شاہ صاحب نے اپنی کتاب ''فقیر رنگ'' میں بالکل صحیح فرمایا ہے کہ: **''میرے خیال میں اسلام مذہب سے زیادہ کلچر ہے۔''** (ص۲۸۳)

ہم آج کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب اور مغربی کلچر ہر ملک میں غالب کلچر ہو گیا ہے۔ انگریزی زبان بھی بین الاقوامی رابطے کی زبان بن گئی ہے۔ کبھی اسلامی تہذیب اور کلچر بھی صدیوں تک دنیا کی سوچوں پر حاوی رہ کر رہنمائی کرتی رہی۔''

تو اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہمیں پھر سے اسلامی کلچر کو رواج دینا ہو گا اگر ہم نے دوسروں کو متاثر کرنا ہے۔ کلچر کیا ہے؟۔

the ideas, customs, and social behaviour of a particular people or society.The arts and other manifestations of human intellectual achievement regarded collectively is called culture.

Bryant C. Mitchell ایک نو مسلم نے بھی لکھا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اسلامی تہذیب کی بنیاد ان اصولوں پر رکھی تھی: ''عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میرا مرکب یا سواری ہے۔'' اعتماد میرا خزانہ ہے, علم میرا ہتھیار ہے، یقین میری قوت ہے، صدق میرا حامی اور سفارشی, طاعت میری کفایت کرنے والی ہے، وغیرہ۔ یہی اصول مغربی کلچر کے ہیں جبکہ مغربی کلچر سچ، امانت، مساوات انصاف، انسان دوستی اور ہمدردی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ سچ بولنا مغربی کلچر کا حصہ ہے جھوٹ بولنا سخت ناپسندیدہ ہے جبکہ شراب پینا ناپسندیدہ نہیں۔ مگر ہمارا آج کا کلچر تقلید، جہالت،

غربت، مذہب اور مسلک کی بنیاد پر نا پسندیدگی، علم دشمنی، جھوٹ منافقت، عدم مساوات، کرپشن پر مبنی ہے ہمارے یہاں پہلے رشوت لینا، حرام کمانا سوشل لحاظ سے سخت ناپسندیدہ ہوا کرتا تھا، اب نہیں رہا۔ ہمیں پھر سے سچ کو کلچر کی بنیاد بنانا ہوگا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان زندگیاں کلچر کے حساب سے گزارتے ہیں، نہ کہ مذہب سے۔ اس لیے ضروری بن گیا ہے کہ ہم اس زندگی گزارنے کے اصولوں کا تعین کریں جس میں سچ، امانت، مساوات اور انصاف بنیادی اصول ہونے چاہئیں۔ مذہب چونکہ سب کا ذاتی ہوتا ہے جبکہ کلچر اجتماعی ہوتا ہے۔ کلچر کی ٹریننگ بچپن سے ہی دینے سے سٹینڈرڈ برتاؤ بنتا ہے۔

سید سرفراز شاہ صاحب، اپنی کتاب، ''کہے فقیر' صفحہ ۲۲۷ سے ۲۳۰ پر کہتے ہیں کہ بچوں کی تربیت کا معاملہ بڑا نازک ہے اور ضروری بھی۔ ٹونی بلیئر کا نابالغ بیٹا شراب پینے پر پکڑا گیا تو ٹونی نے پارلیمنٹ میں کہا کہ آج مجھے احساس ہوا کہ بچوں کا پالنا وزیراعظم بننے سے زیادہ دشوار ہے۔ برٹش بچوں کی ٹریننگ سکول سے شروع ہوتی ہے نرسری کلاس سے یعنی چار سال سے۔ سکول کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے ہی کلچر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ کیسے یہ دیکھیں:

> ''جب بچہ سکول جاتا ہے تو اسے کتابیں نہیں دی جاتیں بلکہ سپیشل خاتون ٹیچرز اس کو کھلونوں سے بھی بات سکھاتی ہیں، آپ دیکھیں گے کہ ایک ٹیچر بیس پچیس بچوں کو لے کر فٹ پاتھ پر جا رہی ہے۔ انہیں بتاتی ہے کہ لائین میں اس طرح چلنا ہے کہ کسی کے ساتھ نہ لگیں، کسی کے پاؤں پر پاؤں نہ آئے، ان کا بیگ کسی کے ساتھ نہ ٹکرائے، احتیاط کیسے کرنی ہے۔ ایک زیبرا کراسنگ سے سڑک کی دوسری طرف لے جائے گی، پھر کچھ فاصلہ پر زیبرا کراسنگ سے پہلی طرف آ جائے گی۔ اور یوں سڑک کراس کرنے کی ٹریننگ دیتی جائیگی۔ سگنل سرخ ہو جائے تو اونچی آواز میں ان کو بتائے گی کہ اس پر رک جانا ہے۔ اسی طرح بچوں کو بس میں سوار کرانے کے لیے

قطار بنوائیں گی۔ غرضیکہ بچوں کی تعلیم، پریکٹیکل تربیت کے ذریعے کی جا رہی ہوتی ہے۔ نہ کہ کتابوں کے ذریعے۔''

یہ سب سے پہلے اس لیے کی جاتی ہے تاکہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ روزانہ برتاؤ کے آداب سکھا دیۓ جائیں۔ جس سے زندگی میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ایک سٹینڈرڈ معاشرتی اخلاق بن جاتا ہے اور ہر ایک کو پتہ ہوتا ہے کہ کب کیا کرنا ہے۔

''اسی طرح بچہ دیکھتا ہے کہ باپ گھر کے کام خود ہی کر رہا ہوتا ہے پلمبر یا الیکٹریشن نہیں آ رہا بلکہ باپ اس کو بھی ساتھ لگا لیتا ہے تاکہ وہ بھی کام کرنا سیکھ لے جیسے کہ سکریوڈرائیور پکڑاؤ، ریڈی ایٹر میں پانی ڈالو، آؤ کار صاف کریں۔ بچے بھی بڑے خوش ہو کر یہ کام کرتے ہیں۔ ان کے لیے کھیل بھی ہو جاتا ہے مصروف بھی رہتے ہیں اور باپ کی مدد کر کے اچھا محسوس کرتے ہیں۔ باپ شام کو ماں کے کچن کے کام میں بھی مدد کرتا ہے تو یہ تمام مشاہدات بچے کے ذہن میں نہ ختم ہونے والا تاثر چھوڑتے ہیں جو ساری عمر اس کے ساتھ رہتا ہے اور یہی پھر نیشنل پریکٹس اور سٹینڈرڈ بن جاتا ہے۔'' اور ساتھ ہی ساتھ کام کرنے میں جھجک بھی دور ہو جاتی ہے اور کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں رہتا۔ اس کے برعکس ہمارے بچے پلمبر یا الیکٹریشن کو کام کرتے دیکھ کر اس کام کو کم تر کام سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ہم میں کلاس سسٹم آ جاتا ہے کہ یہ بڑے لوگوں کے کام ہیں یہ چھوٹے لوگوں کے کام ہیں۔ ڈاکٹر عزت والا کام ہے۔ پلمبر چھوٹے لوگوں کا کام ہے اور کام میں بھی کم درجے کا یعنی پیشے میں بھی کلاس سسٹم آ جاتا ہے۔ بڑوں کو پانی نوکر یا بچہ پلائے گا، خود اٹھ کر نہیں پیئے گا۔ بلکہ ادب کے نام پر بھی یہ چھوٹوں کا کام ہے کہ بڑوں کی خدمت کریں اور بڑے شکریہ بھی ادا نہ کریں یعنی ہم عقیدت اور ادب کو غلامی اور فرض بنا دیتے ہیں۔ چھوٹوں کو بڑوں کو سلام کرنا چاہیے یہ ان کا فرض ہے مگر افسر باہر سے آئے تو اس کا فرض نہیں کہ وہ چھوٹوں کو سلام کرے۔ غرض ہم نے مساوات سکھانا اور پریکٹس کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اور مساوات ان چھوٹے کاموں اور روزانہ کی پریکٹس سے ہی آتی ہے۔

دوسرا غلط نظریہ یہ ہے کہ ہم بچوں کو بچہ ہی سمجھتے رہتے ہیں کہ بڑا ہو کر سیکھے گا

جبکہ بچہ تو پیدا ہوتے ہی دیکھنے سننے لگتا ہے اور وہ چیزیں اس کے ذہن میں ریکارڈ ہو رہی ہوتی ہیں اگرچہ وہ نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ جواب دے سکتا ہے۔ اسی لیے وہ بچے جلدی بولنے لگتے ہیں جن کو پیدائش کے بعد سے ہی ان سے باتیں کی جائیں تاکہ الفاظ ان کے ذہن میں پہلے سے ہی موجود ہوں انہیں صرف بولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پانچ سال تک بچے کی شخصیت کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ جس پر پھر اس کی personality بنتی ہے۔ اگر بچے کی پیدائش کے بعد سے ہی ہم گھر میں سنت طریقے سے رہنے لگیں تو پھر ہی بچہ صحیح مسلمان بنے گا۔ بڑے ہو کر سیکھنا اور عادات اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جائنٹ فیملی سسٹم میں چونکہ بہت لوگ سکھانے والے ہوتے ہیں تو وہاں بچے ذہنی طور پر جلدی بالغ ہوتا ہے۔

ہمارا تربیت دینے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، سوائے وعظ، نصیحت یا لیکچر دینے کے۔ پریکٹیکل مثال سے اور خاموش تربیت کا طریقہ ہم نے ترک کر دیا ہے۔ ماں اور باپ، ٹیچر کو چاہیے کہ وہ بچوں کی ہر بات کو نوٹ کریں اور جہاں موقع ملے مناسب ہو تو فوراً صحیح بات کی تلقین کر دے۔ یہی teaching moments کہلاتے ہیں۔ بٹھا کر بچوں کو لیکچر بہت کم دئے جانے کی ضرورت ہوتی ہے، بچے دیکھ کر، یا سن کر سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر بچے غلط سوچ رہے ہوں تو فوراً اسی وقت سوچ کو correction کر دیں۔ اس سے بچوں کی متوازن شخصیت بن جائے گی۔۔ ہمارے سکول صرف کتابیں پڑھاتے ہیں جو پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے ضروری ہیں۔ اخلاق کی تعلیم یا تربیت کرنی بند کر دی ہے۔ زندگی کی حقیقتیں سکھانا بھی والدین اور ٹیچر کا کام ہے۔

شاہ صاحب مزید کہتے ہیں کہ:

”برٹش بچوں میں تربیت کے ذریعے ملکی قوانین پر عمل، حب الوطنی اور معاشرتی روئے دو تین سال سے ہی سکھانے شروع کر دینے چاہیئے۔ روحانی ٹریننگ میں بھی فقیر کو یہی سکھایا جاتا ہے کہ اپنے حقوق کی فکر مت کرو کہ دوسرے ادا کرتے ہیں یا کہ نہیں۔ تمہارے ذمے دوسروں کے جو

فرائض ہیں ان کو ادا کرنا سیکھو کیونکہ تم سے صرف اسکی باز پرس ہوگی جو فرائض تمہارے ذمہ ہیں۔اس لیے فقیر کسی کے برے سلوک کے بدلے اچھا سلوک کرے گا۔اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ اس شخص نے جو میرے ساتھ کیا ہے اس کے لیے وہ اللہ کو جواب دہ ہوگا اور میں اپنے عمل کے لیے اس لیے بہتر ہے کہ میں ایسا کروں کہ جواب دہی سے بچ جاؤں۔''

جس بچے کو شروع سے ہی بات سکھا دی گئی ہو کہ وہ صرف اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہوگا اس لیے اسے اپنے اور دوسروں کے حقوق کا پتہ ہونا چاہیے اور جواب دہی کا بھی، چاہے والدین کے سامنے ہو یا اللہ کے سامنے یا معاشرے کے سامنے، دوسروں پر اسے کوئی کنٹرول نہیں ہوتا کہ وہ کیسے برتاؤ کریں گے۔ کیونکہ وہ اپنے والدین کی تربیت کے مطابق رویئے رکھے گا۔تو پھر وہ بچپن سے ہی سیکھ جائے گا کہ دوسروں کی آزادی میں دخل نہیں دینا چاہیے اور ان کے حقوق ادا کرنے ہیں اور ان کو خوش رکھنا ہے۔ اگر دوسرے اس کا جواب اسی طرح نہیں دیتے تو اس کو زیادہ مائیند نہیں کرنا چاہیئے۔صرف نوٹ کرے کہ یہ شخص کیسا ہے تا کہ آئیندہ اس کے ساتھ احتیاط رکھے تا کہ ناخوشگوار تجربہ نہ ہو۔ اگر بچے میں یہ عادات ہوں تو پھر اسے روحانیت میں بھی ترقی کرنے میں مشکل نہیں ہوگی وہ تیزی سے منزلیں طے کر کے اگلے درجات تک جاتا جائے گا۔انسان اچھے اخلاق، فقیری اور روحانیت سے اس وقت دور ہوتا ہے جب وہ اپنے حقوق کی ادائیگی پر زور دے اور اس کی ذات پہلے آ جائے اور دوسروں کی ذات پیچھے چلی جائے۔

بچہ چونکہ باہر کے ماحول سے بھی بری اچھی باتیں سیکھتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی عادات پر نظر رکھی جائے اور گھر کا ماحول ایسا ہو کہ زیادہ اچھی ہی باتیں سیکھے۔کوئی آدمی بھی پرفیکٹ نہیں ہوسکتا۔اس لیے جو زیادہ اچھی باتیں سیکھے اور کرے وہی اچھا انسان کہلائے گا۔

جاپان کی ترقی کے راز میں پہلے نمبر پر ان کے سکول سسٹم ہیں جو کہ اخلاق،

حقوق العباد، آداب کی تربیت کرتے ہیں۔ اگرچہ انگریز خود ترقی یافتہ ہیں مگر پھر بھی ایک انگریز یہ دیکھنے کے لیے کہ جاپان کی ترقی کا راز کیا ہے، جاپان گیا اور اس کی تحقیق کے مطابق جاپان کے سکول سسٹم کی دس خوبیوں ہیں جنہوں نے اسے دنیا کی دوسری قوموں سے عقل مندی، صحت مندی، خوش اخلاقی میں مختلف اور یکتا بنا دیا ہے۔ ہمیں بھی اس سٹڈی سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ .

پہلی خوبی: زندگی کے اصول اور آداب پہلے سکھائے جائیں۔ علم بعد میں سکھایا جائے۔ Manners before knowledge.

جاپانیوں کا خیال ہے کہ سکول کے پہلے تین سال بہترین اخلاق اور آداب زندگی اور کردار سازی کے لیے ہونے چاہئیں اور طالب علم کی علم سیکھنے کی صلاحیت کا اندازہ لگانے یا سکھانا شروع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بچوں کو مساوات، دوسرے انسانوں کی عزت کرنا، اور دوسری مخلوقات جیسے جانور، پرندوں، نباتات کے ساتھ کیسے نرمی کا سلوک کرنا ہے سکھانے کے ساتھ ہی انہیں رحم دل، ہمدرد، بننا، انصاف کرنا، اپنے آپ پر کنٹرول کرنا، ہمت، محنت، وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔ جاپانی طالب کا چوتھی کلاس یعنی دس سال کی عمر تک کوئی باقاعدہ امتحان نہیں ہوتا۔ بلکہ ہلکے پھلکے ٹسٹ ہوتے ہیں۔

دوسری خوبی؛ صفائی پسندی؛ یہ خود صفائی کرنے سے سکھایا جاتا ہے۔

یہ عادت سکھانا سکول کی تربیت کا اہم حصہ ہے۔ اس لیے سکول میں صفائی والا کوئی سٹاف نہیں رکھا جاتا بلکہ بچے ہی کلاس روم، کیفیٹیریا، باتھ روم، سکول سب کی صفائی خود کرتے ہیں اور ان کی ٹیمیں بنا دی جاتی ہیں جو باری باری ہر جگہ صاف کرتی ہیں اور سال کے دوران، جگہوں کی باریاں بدلتی رہتی ہیں۔ اس سسٹم سے مقصد ٹیم میں کام کرنے کی عادت، ٹیم لیڈرشپ، ایک دوسرے کی مدد کرنا، اپنے وقت اور محنت سے جھاڑو دینا، پوچا مارنا، گرد جھاڑنا وغیرہ کام کرنے سے صفائی رکھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے، جس سے صفائی کے کام کرنے والے کی عزت کرنی آجاتی ہے اور کوئی کام چھوٹا یا بڑا، اچھا یا برا نہیں لگتا۔ یعنی کام میں کلاس سسٹم نہیں آتا۔ اپنے کام کی بھی عزت اور

دوسروں کے کام کی بھی عزت سکھائی جاتی ہے۔

اگر ہم نے بھی اس حدیث،''صفائی نصف ایمان ہے''، پر عمل کی عادت ڈلوانی ہے تو سکولوں سے ہی پریکٹیکل تربت دینی ہوگی۔

تیسری خوبی ۔کھانے کے آداب سکھانے اور ٹیچر اور بچوں میں محبت عزت پیدا کرنے کے لیے اکٹھا لنچ کرنا۔

سکول میں ہر ایک کو سٹینڈرڈ لنچ ملتا ہے۔ پرائمری اور جونیئر ہائی سکول میں کھانے کا مینو سپیشلسٹ تیار کرتے ہیں اور بچے استاد کے ساتھ اکٹھے کھاتے ہیں۔جس سے استاد اور بچوں میں اچھے اور مثبت تعلقات بنتے ہیں۔اور استاد ان کو دوست بن کر ان سے سوشل ہوکر کھانے کے دوران زندگی گزارنے کے گر بھی سکھاتا ہے۔

چوتھی خوبی۔ شام کو بھی ہوم ورک،اضافی سٹڈی کے لیے ورکشاپ ہوتی ہے۔

آٹھ گھنٹے سکول گزارنے کے بعد اچھے جونیئر ہائی سکول میں داخلے کئے لیے شام کو پریپریٹری ورک شاپ میں جاتے ہیں جیسے ہمارے یہاں ٹیوشن ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے کوئی بھی بچہ فیل نہیں ہوتا اور کلاس دہراتا نہیں ہے۔نہ زندگی کا سال ضائع ہوتا ہے

پانچویں خوبی: چھٹیوں میں اور ویک انڈز میں بھی یہ سلیبس کی کتابوں کے علاوہ ادب، آرٹ، پینٹنگ،شاعری، جاپانی زبان کی خوش خطی وغیرہ کی بھی ٹریننگ دی جاتی ہے۔نظمیں، پڑھتے ہیں۔نظموں کے ذریعے گہرے جذبات، زندگی کے اسباق سکھائے جاتے ہیں اور اپنے کلچر، آرٹ،ادب کی عزت کرنا اور رسوم پر فخر کرنا سکھایا جاتا ہے .

چھٹی خوبی: سکول یونیفارم سے سوشل یک جہتی سکھائی جاتی ہے

ہر ایک لڑکے کو فوجی طرز اور لڑکیوں کو ملاحوں کی طرز کی یونیفارم پہننی ہوتی ہے تاکہ سوشل برابری پیدا ہو۔

ساتویں خوب کلاس کے ماحول کی وجہ سے حاضری نناوے فیصد ہوتی ہے۔ وقت پر آتے ہیں اور پوری توجہ سے لیکچر سنتے ہیں اور وہ پوری توجہ سے ہر بات سیکھتے ہیں۔

آٹھویں خوبی: اپنی اپنی پسند کے کالج میں داخلہ لینے کا رجحان 76% فی صد سٹوڈنٹ بعد میں کالج میں پڑھائی جاری رکھتے ہیں۔ اپنی پسند کے کالج میں داخلے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ مقابلہ بڑا سخت ہوتا ہے اور داخلے کے امتحان سے ہی ان کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے۔ بچے اسے جہنم کا امتحان کہتے ہیں۔

نویں خوبی۔ سال موسم بہار سے شروع ہوتا ہے جبکہ مغربی مما لک میں ستمبر میں علمی سال شروع ہوتا ہے۔ سال ساڑھے تین مہینے کے تین سمسٹر میں تقسیم ہوتا ہے۔ گرمیوں میں چھ ہفتے اور سردیوں میں دو ہفتے کی چھٹیاں ہوتی ہیں

دسویں خوبی۔ کالج کے سال ہی زندگی میں بہترین سال یا چھٹیوں کے سال گنے جاتے ہیں اور انجوائے کیئے جاتے ہیں

کیا ہم نے بھی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا راز جاننے کی کوشش کی ہے؟

میری انفارمیشن کے مطابق، جواب نہیں میں ہے۔ ہندوستان میں ہمارے بزرگوں میں صرف سر سید احمد خاں نے ہی نے انگریزوں کی ترقی کا راز جاننے کی کوشش کی تھی جس کے لیے وہ اپنی ساری جائیداد بیچ کر اس پیسے سے انگلینڈ گئے تھے وہاں کے سکول سسٹم کالج یونیورسٹیوں کا سسٹم دیکھا اور بالکل صحیح تشخیص بھی کی تھی کہ پوری قوم کی اخلاقی تربیت، انسان سازی صرف سکول اور کالج کر رہے تھے، اور ساتھ ہی پروفیشنل تعلیم بھی دے رہے تھے۔ اور یہی ان کی ترقی کا راز ہے کہ سب ایک ہی جیسی تہذیبی سوچ رکھتے ہیں۔ اس لیے واپس آ کر پھر علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور اس کا پرنسپل اور چند استاد بھی انگریز ہی رکھے تاکہ کالج کی تعلیم اور تربیت کا سارا کلچر انگلینڈ والا ہی ہو۔ تعمیر چندہ مانگ کر کی گئی تھی، حتی کہ طوائفوں تک سے بھیک مانگی۔ کسی نے اعتراض کیا تو کہنے لگے کہ ان کے پیسوں سے باتھ روم بنا لیں گے۔ وہاں سے ہی وہ

پڑھے لکھے نوجوان نکلے جنہوں نے پاکستان بنایا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں بھی کیڈٹ کالج بنے تو ان کے پرنسپل بھی انگریز ہی رکھے گئے تھے جنہوں نے انگلش پبلک سکول کی طرز پر کالج بنائے تھے۔

تمام مذہبی حلقوں سے سرسید احمد خان کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ کیونکہ مذہبی تعصب کی وجہ سے ہم انگریزوں سے سیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ نہ ہی میں نے کہیں پڑھا ہے کہ مذہبی حلقوں نے کبھی کسی بھی مسلمان ملک میں یورپ کی ترقی کے راز کی سٹڈی کی ہے۔ اگر کی ہے تو پھر صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کیونکہ یہ سوشیالوجی کا مضمون ہے اور سوشیالوجی کی ہمیں تعلیم ہی نہیں دی جاتی۔ سرسید نے بھی اسے سوشل مسئلہ سمجھ کر سٹڈی کیا تھا اور صحیح تشخیص کی تھی کہ انسان سازی ہی ترقی کی بنیاد ہے۔ مگر ہم انسان سازی کو ہمیشہ مذہبی مسئلہ سمجھتے رہے ہیں، جبکہ یہ سوشل مسئلہ ہے۔

پاکستان بننے کے بعد بھی ملک کو ترقی دینے کی پلاننگ کے لیے ہمیں انگریزوں کی مدد کی ضرورت تھی مگر ہم نے ان سے مدد لینے کی بجائے خود پہیہ ایجاد کرنے کو ترجیح دی۔ جبکہ جاپانیوں نے امریکنوں سے شکست کے بعد، انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے اپنے دشمنوں سے ہی مدد کی درخواست کی تھی اور صرف تیس سال میں ترقی یافتہ بن گئے تھے۔ گلف کے عرب بدوؤں میں اتنی عقل تھی کہ ان کو ترقی صرف مغربی ممالک دے سکتے ہیں، اور آج دیکھیں کہ گلف کے تمام ممالک ہر شعبے میں ترقی یافتہ ہیں۔ یہی تائیوان، ساؤتھ کوریا، چین، سنگاپور نے کیا۔ ترکی نے بھی یہی کیا ہے۔ اب بھی اگر ہم تعصّبات، اکڑ، تکبر، جھوٹی ان سے نجات پالیں تو مغربی ممالک کی مدد سے ان کے تمام سسٹم ایک ہی دفعہ اپنا کر دس پندرہ سالوں میں یہ کام کر سکتے ہیں۔ ہمارے مذہبی تعصب کی سوچ کی بہترین مثال مجھے انٹرنیٹ سے، نائیجیریا کے مسلمان کی رائے ملی ہے۔

WE MUSLIMS ARE NOT READY TO LEARN FROM OTHERS BECAUSE OF RELIGIOUS BIAS. AND ALSO FEEL THAT, WE HAVE ALL THE KNOWLEDGE SO WE DO NOT NEED DLEARN

سبق:

بچوں کی تربیت بہت مشکل کام ہے۔ بچے ہی دراصل ہر گھر اور ملک کی دولت ہوتے ہیں۔ اگر بچے لائق اور کامیاب نکلیں تو والدین کا بڑھاپا پرسکون گزرتا ہے۔ ایک انڈین فلم کا ڈائیلاگ ہے۔ دولت مت بناؤ بلکہ بچوں کی تعلیم اور تربیت پر دولت خرچ کرو بڑے ہو کر خود کما لیں گے۔ اگر نالائق نکلا تو دولت برباد کر دے گا۔

مغربی ممالک، جاپان کے ماڈل سے سیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ سکول کو ہی نیشنل کردار کی تربیت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور مقاصد بنا کر اس کے مطابق تعلیم اور تربیت کرتے ہیں۔ جس سے پھر وہ کلچر بن جاتا ہے۔۔ صرف نمونے کے طور پر کتاب کے آخری باب میں آداب پر میں نے اسلامی کلچر اور تہذیب کی اخلاقیات سکھانے کے طریقہ کا نمونہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ سکولوں کو چاہیے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے ماڈل کاپی کر لیں۔ یہ سب انسانی فطرت پر مبنی ماڈل ہیں، نہ کہ مذہب پر۔

☆......☆......☆

۸۔ ہر ٹیچر، افسر، لیڈر اور عالم دین، والدین کو معلم بن کر مسلمانوں کی اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے دنیا سنوارنے کی تعلیم اور تربیت دینا بھی فرض بنتا ہے

الا کلھم راع و کلھم مسئول عن رعیية

تم سب نگران وذمہ دار ہو اور تم سے ماتحت افراد کے بارے پوچھا جائے گا۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنه وقنا عذاب النار

(سورہ بقرہ۔۲۰۱)

یہ آیت بڑے واضح انداز میں کہہ رہی ہے کہ جب آخرت کا حسنہ جنت ہے تو پھر دنیا کے حسنہ کا مطلب بھی دنیا کو جنت بنانا ہی ہوسکتا ہے اور کچھ نہیں۔ اور دنیا جنت اچھے ملکی سسٹم اور قانین پر عمل سے بنتی ہے۔

رسول کریم ﷺ ہمیشہ مسلمانوں کو صرف دینی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ معاشرتی، معاشی، سیاسی، مالی زندگی گزارنے کی ہر بات، طریقہ، آداب، بھی پریکٹیکل سے سکھاتے تھے۔ جس پر دوسرے مذاہب کے لوگ حیران ہوتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی تعلیم اور آداب سکھانا بھی دراصل سنت نبوی ﷺ ہے، جس کو ہم عام مسلمان، عورت اور مرد اور ہمارے علماء کرام، سیاست دان، سرکاری افسر، والدین سب بھول چکے ہیں۔ اور دنیا سکھانے سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے خود ہی دین اور دنیا کی تفریق پیدا کر کے لیڈرشپ کے بہت اہم حصے سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ جبکہ ہر محکمے کے سربراہ پر دنیاوی یا پیشہ وارانہ علوم کے ساتھ، کریکٹر بلڈنگ، سوشل سینس، وغیرہ سکھانا بھی سب شامل ہے۔

سیاست دان، وزراء اورانتظامیہ کے لوگ معاشرے کے اخلاق، کردار، معاملات کے لیے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں مثلاً کمشنر، ڈپٹی کمشنر، پولیس بھی اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی جواب دہ ہونگے۔ ٹی وی، پرنٹ اور وڈیو میڈیا کے لوگ بھی برائی پھیلانے کے لیے پکڑے جائیں گے۔

آخرت میں جنت کے حصول کے لیے اس دنیا کو بہترین طریقے سے منظّم کر کے، بہترین سسٹم ایجاد کر کے جنت بنانے کے لیے مسلمان عوام کو دنیا کی باتیں بتانا بھی سنت ہے۔اس سنت پر عمل کرتے یہ کتاب بھی میں نے معلم کے طور ہی لکھی ہے۔

شہروں اور دیہات میں جہالت دور کرنے کیلئے ہمیں خود ہی نئے آئیڈیا پیدا کرنے ہوں گے۔ جہالت دو طریقے سے دور ہوسکتی ہے۔ایک تو پڑھنے لکھنے کے قابل بنا کر کتابوں کے ذریعے یا پھر زبانی تعلیم دے کرتا کہ وہ گھر جا کر دوسروں کو سکھائیں۔ دونوں طریقے ہر فرد کی قابلیت کے مطابق اپنائیں۔

سنت طریقہ یہ ہے کہ گاؤں یا محلے کے لوگوں میں تعلیم اور ترقی کا احساس دلایا جائے تا کہ بچے، بڑے، عورتیں اور مرد، سب لوگ خود شوق سے آئیں۔ اسلامی کلچر، اخلاق، انسانی حقوق، آداب سیکھ کر جائیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ جب یہ لوگ آپس میں بحث کریں گے تو خود ہی بہت سی باتیں دوسروں کے آداب دیکھ کر سیکھ لیں گے۔ یہ تب ہوگا جب ہم دنیا سے مقابل کرنے اور ان سے بہتر ہونے کا شوق دل میں پیدا کریں گے۔

> ”بنگلہ دیش میں مولانا ابو کلام آزاد دینی معاملات میں ہی نہیں عام معاشی، معاشرتی، سماجی، تعلیمی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی اپنے سامعین کی رہنمائی کر تے تھے۔ وہ لوگوں کو اپنی مدد آپ کے تحت اپنے گلی محلے اور اپنے گاؤں، قصبے اور شہر کو نہ صرف صاف کرنے بلکہ اسے دلہن کی طرح سجانے کی تلقین کرتے۔ وہ لوگوں کو گھر کا بجٹ بنانے اور گھروں کو خوشی اور خوشحالی کا گہوارہ بنانے کے سلسلے میں عملی تجویز دیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ ایک صحت مند اور خوشحال خاندان کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدید

معلومات سے فائدہ اٹھانے کے طریقے بھی بیان کرتے۔ وہ بے روزگاری کیخلاف جہاد کی اہمیت اور فضیلت بیان کرتے اور حصول روزگار کے عملی منصوبے سامعین کے گوش گزار کرتے۔‘‘(نوائے وقت۔کالم حکم اذان۔ ڈاکٹرحسین احمد پراچہ)

علماء کے علاوہ بنگلا دیش کے ہی ایک بینکر ڈاکٹر محمد یونس نے گرامین بینک شروع کر کے دیہات میں صنعتی قرضے دینے کے ساتھ ہی اسے استعمال کرنے کے چند معاشرتی اصول اور مقاصد کا آئیڈیا متعارف کرایا تھا جس پر انہیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ جن پر عمل کر کے بنگلا دیش کے دیہات بہت ترقی کر گئے ہیں، خصوصا ریڈی میڈ کپڑوں کا دیہات میں ہی کام ہوتا ہے۔ انہوں نے دیہاتی صارفین یا قرض لینے والوں کو یہ مقاصد دئے تھے:۔

ا۔ ہم گرامین بینک کے چار اصولوں یعنی ڈسپلن۔ اتحاد، ہمت، بہت محنت، کو زندگی کے ہر شعبے میں استعمال کریں گے۔
۲۔ ہم اپنی فیملی کے لیے خوشحالی لانے کی کوشش کریں گے۔
۳۔ ہم ٹوٹے پھوٹے گھر میں نہیں رہیں گے بلکہ اس کی مرمت کر کے اچھے گھر میں رہیں گے
۴۔ ہم گھر میں سبزیاں اگا کر سارا سال استعمال کریں گے اور فالتو بیچ دیں گے۔
۵۔ ہم صحیح موسم میں بہت سارے درخت لگائیں گے۔
۶۔ ہم چھوٹی فیملی بنائیں گے۔۔ خرچ کم کریں گے۔ فضول خرچ نہیں کریں گے اور اپنی صحت پر توجہ دیں گے
۷۔ ہم بچوں کو تعلیم دلائیں گے اور تعلیم کے دوران وہ کما کر اپنی تعلیم مکمل کریں گے۔ ہم گھر، بچے اور ارد گرد کا ماحول صاف رکھیں گے۔
۹۔ ہم زمین کھود کر اس پر لیٹرین بنائیں گے، باہر پاخانہ نہیں کریں گے۔
۱۰۔ ہم ٹیوب ویل یا نلکے کا صاف پانی پئیں گے، اگر یہ نہ مل سکے تو اسے ابال کر

پئیں گے یا اس میں پھٹکڑی ڈال کر جراثیم مار کر پئیں گے۔

۱۱۔ ہم نہ جہیز لیں گے، نہ دیں گے۔

۱۲۔ ہم چھوٹے بچوں اور بچیوں کی شادی نہیں کریں گے۔

۱۳۔ ہم نہ ناانصافی کریں گے، نہ برداشت کریں گے۔

۱۴۔ ہم بڑی بزنس میں مل جل کر پیسے لگائیں گے اور منافع شئر کریں گے۔

۱۵۔ ہم ہر وقت ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔

۱۶۔ اگر کسی جگہ ڈسپلن خراب ہوگا تو سب مل کر ڈسپلن پھر قائم کریں گے۔

۱۷۔ ہم معاشرتی سرگرمیوں میں اجتماعی شرکت کریں گے۔

بنگلا دیش میں قرضے واپس کرنے کی شرح نوے فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے آئیڈیا کو چالیس ممالک نے اپنا کر دیہات میں معاشی ترقی شروع کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ محمد یونس یا مولانا آزاد کو نئی سوچ اور آئیڈیا سے اس لیے نوازتا ہے کہ یہ لوگوں کے ہمدرد ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے بھی ترقی کرنی ہے تو ہمارے سیاسی، انتظامی، معاشرتی، اور مذہبی رہنماؤں کو لوگوں کے لیے اپنے دلوں میں ہمدردی اور خیر خواہی پیدا کر کے ان کے دنیاوی مسائل حل کرنے میں دلچسپی لینی ہوگی۔ الحمدللہ کہ ڈاکٹر امجد ثاقب نے قرض حسنہ پر مبنی اخوت پروگرام شروع کیا ہے۔ جس میں مسلمان، عیسائی، ہندو سب مذاہب کے ہم وطنوں کو چنا جاتا ہے۔ یہ پروگرام اب کروڑوں روپے قرض حسنہ دینے کے قابل ہو گیا ہے۔ عبدالستار ایدھی ہمارے لیے سوشل ورک کی مثال چھوڑ گئے ہیں۔ اور پوری دنیا میں ہماری پہچان بن گئے ہیں۔

چین کی ایک مثال شاید ہمیں قائل کر دے کہ ایک چھوٹی سی عادت سے کتنے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ چین کے پاس دوائیاں امپورٹ کرنے کے لیے زرمبادلہ نہیں تھا تو پوری قوم نے فیصلہ کیا کہ ہم صرف ابلا ہوا جراثیم سے پاک اور نیم گرم پانی پئیں گے کیونکہ زیادہ بیماریاں پیٹ سے شروع ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ہر جگہ صفائی کو یقینی بنائیں گے۔ اس تجربے سے چین میں بیماریاں کم ہوگئیں۔ اور دوائیاں باہر سے منگوانے کی

ضرورت ہی نہ پڑی۔

سبق

میرے خیال میں اگر ہم نے اپنی ذاتی شخصیت اور پاکستان کی ترقی اور نشاۃ ثانیہ دیکھنی ہے تو تمام با اثر، سوچ اور رائے پر اثر انداز لوگوں اور میڈیا کو عوام کی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔ اگر ہم صرف، صفائی نصف ایمان کی حدیث پر عوام کو اپنے گلی، محلے، بازار کو صاف رکھنے پر قائل کر سکیں تو پاکستان کے شہر اور دیہات خوبصوت لگنے لگیں گے اور بیماریاں کم ہو جائیں گی۔

پاکستان کو جنت بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بہترین اخلاق، کردار، معاملات، حقوق العباد ادا کرنے والے اور مساوات پریکٹس کرنے والے بن جائیں اور بہترین معاشرتی معاشی، علمی، صنعتی، عائلی سسٹم بنائیں تا کہ گڈ گورنس کو یقینی بنایا جا سکے۔ تب ملک میں امن سکون محبت ہمدردی کا ماحول پیدا ہوگا۔ ذاتی عبادت پر زور کم کر کے اجتماعی معاملات اور اخلاق کی تعلیم پر زور دینا ہوگا۔ لوگوں کی ہر فیلڈ میں رہنمائی کرنی ہوگی جیسے کہ بنگلا دیش کے مولانا آزاد نے شروع کیا ہے۔ الحمد للہ۔ کہ علماء کرام کا معاشرے میں بہت اثر ہے اور اسلام کا غلبہ پہلے نیشن بلڈنگ اور انسان سازی سے شروع ہوتا ہے۔ سیاسی غلبہ تو بہت بعد میں ممکن بنتا ہے

ہم سب کو کام کی جگہ پر بھی معلم بننے کا شوق پیدا کرنا ہوگا۔ سٹاف کی کردار سازی پر توجہ دینی ہوگی تبھی وہ عوام کی خدمت، سروس کے جذبے سے صحیح رہنمائی کریں گے۔ آسان قانون بنائیں گے۔ آج کل تو وہ عوام کا استحصال کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ سنت پریکٹس کرنے میں کوئی مشکل نہیں آ سکتی۔ صرف لوگوں کو اپنا سمجھ کر، ان کی خیر خواہی کی سوچ اور عادت ڈالنی ہوگی۔ یہ ذاتی عمل ہے جو ہر ایک اپنی چوائس سے اپنا سکتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی بھی ذاتی ہوگی۔

☆......☆......☆

۹۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کے لیے کرو، یہ بھی سنت ہے۔

☆ **حدیث:** ''جس کی آرزو ہو کہ وہ جہنم سے بچ جائے اور جنت میں داخل ہو جائے تو اس کی موت اس حالت میں آنی چاہیے کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیتا ہو اور وہ لوگوں سے بھی وہی معاملہ کرے جو اپنے لیے چاہتا ہو۔'' (الطبرانی)

☆ **حدیث:** ''تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔'' (بخاری)

اگر ہم سب حضور اکرم ﷺ کے صرف اسی ایک فرمان کو ہی زندگی اور عمل کا اصول اور اپنی پہچان بنالیں تو دنیا بھی جنت بن جائے گی۔ اور نبی کریم ﷺ کے فرمان پر عمل سے جنت کا حصول بھی ممکن بن جائے گا۔ اس لیے ہر مسلمان کا یہی ماٹو ہونا چاہیے۔ دنیا کے ہر مذہب میں بھی یہ اصول موجود ہے اسی لیے یہ سنہری اصول کہلاتا ہے۔ اس لیے یہ خدائی اصول ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی حکمت ہر جگہ سے سیکھنے کے ارشاد کے مطابق، میں دوسرے مذاہب، کلچرز سے چند ریفرینس دے رہا ہوں۔ تورات اور ہندو مذہب میں تو گولڈن رول کو ہی تمام مذہب کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ میں نے وکی پیڈیا سے ریفرنس بغیر ترجمہ دے دیئے ہیں؛ ہندو مذہب.

"If the entire Dharma can be said in a few words, then it is—that which is unfavorable to us, do not do that to others.—? Padmapuraana, shrushti

"One who, while himself seeking happiness, oppresses with violence other beings who also desire happiness, will not attain happiness hereafter." Budhism

"What is hateful to you, do not do to your fellow: this is the whole Torah; the rest is the explanation; go and learn."?Shabbath folio:31a, Babylonian Talmud

"A man should wander about treating all creatures as he himself would be treated."—?Sutrakritanga, 1.11.33 JAIN Mat

"The sage has no interest of his own, but takes the interests of the people as his own. He is kind to the kind; he is also kind to the unkind: for Virtue is kind. He is faithful to the faithful; he is also faithful to the unfaithful: for Virtue is faithful".—?Tao Te Ching, Chapter 49

حدیث کی اپلائیڈ شکل:

آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ کی عزت کریں تو آپ بھی دوسروں سے عزت کا سلوک کریں۔ اگر چاہتے ہیں دوسرے آپ سے سچ بولیں تو خود بھی دوسروں سے سچ بولیں۔ ان دو مثالوں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس گولڈن اصول کی عادت سے ہر ایک، بہترین انسان اور مسلمان بن سکتا ہے۔

یہی گولڈن اصول، ہر بہترین ایڈمنسٹریشن اور گڈ گورنس کا بنیادی اصول

ہے۔میں یہ ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ 1971 میں، میں ابوظہبی ایئر فورس کے ساتھ Deputation پر گیا۔ مجھے فلائنگ کے ساتھ تمام سٹاف کی پرسنل ایڈمنسٹریشن کے کام کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ چونکہ مجھے یڈمن کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے میں نے اپنے گورے باس سے اپنی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا اور اس سے یہ کام اور اس کے گر سیکھانے کی درخواست کی۔ کیونکہ کامیاب ہونا میرے لیے ضروری تھا، یہ میری اور پاکستان کی عزت کا سوال تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ ایڈمن کا کام کرنا دراصل کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔کامیاب ایڈمن افسر کے لیے ایک ہی گر اور اصول ہے کہ فیصلے کرتے وقت اپنے آپ کو اس سٹاف کی جگہ رکھو اور سوچو کہ اگر تم وہاں ہوتے تو کیسا حل یا کیسی مدد چاہتے،،تب جو بھی فیصلہ کروگے وہ ہمیشہ صحیح فیصلہ ہی ہوگا۔یعنی گوروں کا ایڈمنسٹریشن کا اصول دراصل اس حدیث کے ہی عین مطابق تھا کہ دوسروں کیلیئے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

دوطرفہ تعلقات کے اصول اور گولڈن رول میں یہ فرق ہے کہ دوطرفہ تعلقات میں اصول یہ ہے کہ تم میرے ساتھ یہ کروگے تو تبھی میں یہ کرونگا۔اسی کو امریکن یوں کہتے ہیں؛۔you scratch my back, i will scratch yours

جبکہ گولڈن رول اصول میں یک طرفہ بھلائی کرنا ہوتا ہے۔ جو اس اصول کو نہیں اپناتا، وہ دراصل منافقت کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے اور اپنوں سے ہی دشمنی کر رہا ہوتا ہے۔اس کی مثال دیکھیں۔

میں اوپر والی حدیث کو زندگی کا اصول اور مقصد بنانا تجویز کر رہا ہوں کہ جو اپنے لیے پسند کرو تو دوسروں کے ساتھ اس کے مطابق ہی سلوک کرو۔ کیونکہ یہ جنت کیلیئے شرط قرار دی گئی ہے اور ایمان کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہے۔ مغربی دنیا اسی اصول پر عمل کرتی ہے۔

اللہ سبحانہ تعالیٰ کا مقرر کردہ اصول ہے کہتمام انسانی تعلقات دوطرفہ ہوتے ہیں۔ مفت کچھ نہیں مل سکتا۔حقوق اور فرائض یکساں پریکٹس ہونے چاہئیں۔ جہاں یک

طرفہ تعلق ہوگا، یعنی فرائض ہوں اور حقوق کوئی نہ ہوں یا ہونے کے باوجود ادا نہ ہوتے ہوں، وہاں استحصال exploitation ہوگا۔ غربت، گھٹن، غصہ، نفرت ہوگی۔

بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ استحصالی معاشرہ بن گیا ہے کیونکہ معاشرے سے سزا کا ڈر نکل گیا ہے۔ معاشروں کو منظّم کرنے میں دو میں سے ایک چوائس کرنی ہوتی ہے۔ کامیاب معاشروں می مثبت سوچ پہلی چوائس ہوتی ہے کہ میں دوسروں سے سچ بولونگا تا کہ دوسرے بھی مجھ سے سچ بولیں۔ میں پہلے تمہارے حقوق ادا کرونگا، تا کہ تم میرے حقوق ادا کرنا۔ ناکام اور استحصالی معاشروں میں دوسری، منفی اور غلط چوائس کی جاتی ہے اور وہ چوائس یہ ہے کہ میں دوسروں سے سچ نہیں بولونگا مگر دوسرے سے امید کرونگا کہ مجھ سے سچ بولیں۔۔ میں اپنے حقوق کی ڈیمانڈ کرونگا مگر دوسرے کمزور کے حقوق ادا نہیں کرونگا۔ ہم نے دوسری چوائس کی ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرتا، مثلاً پٹرول ڈلواتے بھی ہمیں میٹر کو زیرو پر دیکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ملازم بددیانتی کر جائے گا۔ ہم سب اپنے آپ کو چالاک ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔

صدر ایوب خاں کے ایک جرمن اکنامک ایڈوائزر نے، جس نے بونس ووچر سکیم متعارف کروائی تھی، پاکستان دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ " پاکستانی کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک یہ سوچیں نہیں بدلیں گے۔ یہاں ہر کوئی کہتا ہے کہ یہ چیز صرف میرے پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتا تو کہے گا کہ سب سے پہلے میں نے ہی خریدی تھی۔ اس سوچ سے کوشش کی جاتی ہے کہ دوسرے ان کے مقابلے میں چیزیں خرید نہ سکیں اور محروم رہیں تا کہ میری برتری قائم رہے کیونکہ چیزوں کے علاوہ ان لوگوں کے پاس فخر کی کوئی چیز نہیں ہوتی، نہ علم نہ ہنر، نہ اخلاق۔۔ جبکہ جرمنی میں ہر کوئی چاہتا ہے جو چیز میرے پاس ہے سب کے پاس ہو تو تبھی ہم ترقی یافتہ ہونگے" . یہ بات مجھے اسی پروفیسر کے ایک پاکستانی سٹوڈنٹ نے 1972 میں بتائی تھی۔ جرمن لوگوں کی سوچ گولڈن رول کی ہی سوچ ہے۔ ہماری نہیں۔ کیا ہمارے سیاست اور حکمران یہی نہیں کر

رہے۔ یہ سب مغربی مما لک جاتے ہیں، جیسے نواز شریف، چوہدری شجاعت وغیرہ موجودہ حکمران، یا وہ حکمران جو وہاں کے پڑھے ہوتے ہیں، جیسے نواب کالا باغ، بھٹو، بے نظیر، مگران سب میں کبھی یہ شوق نہیں پیدا ہوا کہ ہمارا ملک بھی ویسا بن جائے، عوام بھی آرام سے رہیں، مساوات اور انصاف دیکھ کر آتے ہیں مگر لوگوں کو غلام دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ بھٹو صاحب عوام کو بھیڑ بکریاں سمجھتے تھے۔ یہ تکبر اور اکڑ کی نشانی ہے۔ اسی لیے ہم ستر سال میں ترقی نہیں کر سکے۔ جبکہ ہمارساتھ ہی شروع ہونے والے مما لک جیسے چین، جنوبی کوریا، سنگاپور، تاؤان، مغربی مما لک کے مقابلے کے ملک بن گئے ہیں۔ مسلم ملکوں میں ملائشیاء، ترکی کو ایک ہمدرد اور شوق والا لیڈر ملنے سے یہ بھی ترقی یافتہ بن گئے ہیں۔ مگر ہم ایک بھی دیانت دار، ہمارا ہمدرد، وفادار اور ہمیں ترقی دینے کے شوق رکھنے والا سیاسی لیڈر پیدا نہیں کر سکے۔

سبق

ہر مسلمان کا زندگی کا نصب العین یا motto یہ ہونا چاہیے۔ دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو۔ اس سے سنت رسول کریم پر عمل کے ثواب کے علاوہ ایمان کی تکمیل اور جنت کے حصول میں بشارت کے حقدار بننے میں مدد ملے گی۔

ہمیں اپنی سوچیں بدلنے کی سخت ضرورت ہے اگر ترقی کرنے کا شوق ہے۔ ہمیں تکبر اور غرور سے نکل کر انسان بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

موجودہ ماحول میں اس سنت پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر چونکہ یہ ذاتی عمل کی سوچ ہے، اس لیے یہ آسان بھی بن سکتی ہے۔ صرف ہر ایک کو ذاتی فیصلہ اور چوائس کرنے کی ضرورت ہے کہ مجھے پرواہ نہیں کہ دوسرے میرے ساتھ کیسا برتاؤ کرتے ہیں میں سب کی بھلائی کا سوچوں گا۔ اور میں اپنا ایمان مکمل کرنے اور جنت کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے آپ کے ارشاد پر عمل کرونگا۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی عادت ڈالوں گا۔

☆......☆......☆

۱۰۔غور و فکر بہت ہی اہم سنت ہے

سوچ بچار، غور و فکر کے بغیر نہ معلم بنا جا سکتا ہے اور نہ ہی لیڈر۔ نہ ہی اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے ترقی کی جا سکتی ہے۔ نہ ہی نئے آئیڈیاز پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ نہ ہی دوسروں کی بھلائی کی جا سکتی ہے۔ نہ ہی دنیاوی یا انفرادی ترقی کی جا سکتی ہے۔

نبوت سے پہلے جب آپؐ غار حرا میں عبادت کرتے تھے تو اس عبادت کی نوعیت کے بارے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی؟ جواب یہ تھا کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔ (عینی: شرح بخاری' ص 254 ریفرنس؛ پیغمبر اعظم و آخر)

یعنی مشاہدہ میں آئی ہر بات کا تجزیہ کرنے، نتائج نکالنے اور سیکھنے کی عادت۔ اور سوال پوچھنے کی عادت۔ غور و فکر میں سب سے پہلی اور اہم بات خدا کی پہچان ہے اور اس کا اقرار۔

''ہمیں ذہن میں عمل اور فیصلے کی قوت پیدا کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ مثال کے طور پر آپ ایک ہی ذہنی قوت کے دو لڑکوں میں سے ایک کو یونیورسٹی اور دوسرے کو ورکشاپ میں مکینک بھیج دیں۔ پچیس سال کی عمر میں دونوں کا مقابلہ کریں کہ کس کا ذہن زیادہ عمل پذیر ہے اور جو مشاہدے کا ماہر بھی ہو۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ دوسرا لڑکا زیادہ محنتی ہوگا۔''

''تعلیم عموماً آدمی کو زیادہ رکھ رکھاؤ والا اور اچھے تلفظ والا اور تہذیب سکھلاتی ہے۔ سوچنا اور دماغ استعمال کرنا نہیں سکھلاتی۔ بڑے بڑے موجد ،ایڈیسن، راک فیلر، آرک رائٹ، کارنیگی وغیرہ جنہوں نے انڈسٹری بنائی وہ سکول کی تعلیم کے بغیر ہی تھے۔ کیونکہ یہ تمام بچپن میں ہی کام پر لگ گئے

تھے۔'' (ریفرنس: انسانی فطرت، ہربرٹ کیسن)

اسی لیے اپنے بچوں کو چھوٹی عمر سے کام پر لگانے کی عادت ڈالیں۔ مثلاً سب سے پہلے اپنے برتن اٹھا کر کچن میں رکھیں۔ کھیل کے بعد کھلونے اکٹھے کر کے واپس اپنی جگہ رکھیں۔ گھر میں کہیں کوئی گری چیز دیکھیں تو اپنی جگہ رکھیں تا کہ گھر صاف ستھرا رہے۔ سکول کے لیے رات کو ہی سب بستے تیار کر لیں۔ جب ذمہ داری ڈالی جائے اور جواب دہی بھی ہو تو تبھی سوچنے، یاد رکھنے اور فیصلے کرنے کی عادت پڑتی ہے۔

''سوچ دراصل تعلیم اور تہذیب کی مرہون منت نہیں ہوتی بلکہ یہ تخلیقی ہوتی ہے۔ یہ ذہن کی عملی قوت ہے۔ یہ صرف معلومات کو وصول کرنے کا آلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ مشاہدہ کر سکتا ہے، انفارمیشن کا مقابلہ کر سکتا ہے، حسّوں کو پرکھ سکتا ہے۔ دو اور دو جمع چار کرتا ہے۔ یہ حسوں کو خیالات اور اصولوں میں بدل دیتا ہے، یہ تنقید کرتا ہے اور تخلیق کرتا ہے۔ ایسے خیالات ہی موجد بناتے ہیں۔ ایجاد کرتے ہیں۔ یہ نئی ترتیب دیگر ایجادیں کرتے ہیں۔ ایجاد کرنا غیر معمولی ذہانت کے باعث نہیں ہوتا بلکہ یہ استقلال و محنت کا ثمر ہے۔''

(ریفرنس: انسانی فطرت، کیسن)۔

مثلاً ڈاکٹر فلیمنگ، پینسیلین کے موجد کا کہنا تھا کہ سالوں سے کام کے باوجود، دوسرے محققین کی جگہ خدا نے یہ ایجاد میری جھولی میں ڈال دی تو اس میں میرا کوئی کمال نہیں اس کی دین ہے۔ یہ دراصل استقلال اور محنت کا پھل تھا۔

اس لیے بچوں کو سکھائیں کہ ہر بات کسی وجہ، مقصد کے لیے کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیے۔ ہر کام کے کرنے کی وجہ پوچھیں، نہ پتہ ہو تب بتائیں۔ بچوں کو دس سوال پوچھنے کی عادت ڈالیں۔ بچے دن کے تجربات پوچھیں سب گھر والوں سے شیئر کر کے بتائیں آج کیا سیکھا۔ ان کو خود فیصلے کرنے کی عادت ڈالیں جیسے کون سے کپڑے پہننے ہیں اور کیوں۔ وغیرہ

''سوچ کتابوں میں نہیں، چیزوں میں ملے گی۔ یہ حقیقت کالج والے بھول جاتے ہیں۔کار، جہاز، پین اور پنسل کی ایجاد سب سوچ کا نتیجہ ہیں۔''

امریکنوں نے سپیس شٹل میں لکھنے کے لیے بال پوائنٹ بنانے کی ریسرچ پر لاکھوں ڈالر خرچ کر دیے تھے جبکہ روسیوں نے عام پنسل استعمال کر لی۔ یہ سب اوریجنل سوچ کا کمال تھا۔

ہمارے سکول و یونیورسٹی اور مدارس سب ہی آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ سوچنے، نئے نتائج نکالنے، فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں سکھاتے بلکہ رٹہ لگواتے ہیں جو صرف امتحان پاس کرنے اور ڈگری لینے تک محدود ہے کیونکہ اسی سے ملازمت ملتی ہے۔ حالانکہ ملازمت کے بعد سوچنے، نئے نتائج نکالنے سے ہی ترقی ممکن بنتی ہے۔مگر ہم ترقی کرنا نہیں چاہتے۔

''تو اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک آدمی سوچ سکتا ہے۔قدرت نے ہر ایک کو سوچنے کا ذہن دیا ہے۔اس لیے سوچ پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔تاریخ میں سینکڑوں بار ایسا ہو چکا ہے کہ حکمرانوں نے سوچ پر پابندی لگانے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ بلکہ اس کے بدلے کسی سوچ والے نے ان کو اتار کر پھینک دیا۔''

نبی کریم ﷺ کی ہدایات ہمیشہ گہری سوچ بچار پر مبنی ہوتی تھیں اور لوگوں کے دل، دماغ اور سوچیں بدل کر نئے اسلامی کلچر اور تہذیب کی بنیاد رکھ رہی تھیں۔اور یہ سب انسانی فطرت، معاشرتی اصولوں پر مبنی ہیں، نہ کہ مذہبی باتیں ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی حریت فکر سے ابتداء کرنی چاہیے۔ اندھی تقلید کو چھوڑنا ہوگا۔ہمیں ہر چیز مذہب کی نظر سے دیکھنے کی عادت بدلنی ہوگی کیونکہ زیادہ تر چیزیں انسانی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ہوتی ہیں۔اور معاشرتی اور انسانی فطرت کے اصولوں سے ہی حل ہونگی۔ پرانی باتوں کو validity کے لیے چیک کرنا ہوگا۔

سیرت، اسوۂ حسنہ پڑھتے خود بھی تجزیہ کرنا سیکھیں اور بچوں کو بھی سکھائیں۔ اصول نکالنے سکھائیں۔ یہ موازنہ یا comparative study سے ممکن ہو سکتا ہے۔ سیرت کے ہر واقعہ کا آج کے واقعات سے موازنہ کر کے کوئی سبق سیکھیں۔ تب اسوۂ حسنہ پر عمل کریں۔ سیرت کی میری اس کتاب کو صرف انفارمیشن کے لیے نہیں پڑھیں۔ اس کتاب کو پڑھتے بھی سوال کریں کہ کیا میں نے صحیح لکھا ہے تب آگے بڑھیں اور عمل کریں ورنہ صحیح بات دریافت کر کے پھر عمل کریں۔ اپنی سوچ سے ہر باب میں نئی باتوں کا اضافہ کریں۔ اور اسے لکھنا اور دوسروں سے شیئر کرنے کی عادت ڈالیں۔ آپ اپنا علم جتنا بانٹیں گے تو اتنا ہی علم میں اضافہ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ کی غزوہ بدر کی جنگی تنظیم اتنی نئی اور پرفیکٹ تھی کہ مکہ کہ فوج حیران رہ گئی تھی۔ آپ نے مثلث کی شکل میں سو سو صحابہ کے تین گروپ بنائے تا کہ ان کی پیٹھ کی طرف سے کوئی حملہ یا وار نہ کر سکے۔ یہ سب غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ اس سوال کا حل تھا کہ دشمن کو پیٹھ پیچھے سے حملہ روکنے کے لیے کیا طریقہ اپنایا جائے تا کہ کم سے کم جانی نقصان ہو۔ لیڈر کا کم ہی سوچنا ہوتا ہے کام عوام نے کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے سارے لیڈر سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

غور و تفکر پر ترغیب دینے والی احادیث:

"اے اللہ ہمیں تمام اشیاء کی اصلی حقیقت سے آگاہ فرما۔"

"ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

ان احادیث کو پڑھنے کے بعد یقیناً ہر وہ مسلمان جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کی ذرا سی بھی عزت و محبت ہے۔ شرم سے اپنا سر نیچا کر لے گا اور یہ سوال کرنے کی ہرگز جرات نہیں کرے گا کہ ہمارے قومی زوال اور تباہی کی کیا وجوہات ہیں۔ (ریفرنس۔ سلسلہ توحیدیہ۔ گوجرانوالہ)

ہم لوگ سچ اور حقیقت معلوم کرنے کا شوق ہی نہیں رکھتے۔ شوق ہو تو علم، سچ

کی تلاش عادت بن جائے گی۔ کسی کی بھی بات کو فیس ویلیو پر سچ نہیں مانیں گے خود سوچ کر، سوال پوچھ کر، دل کی تسلی کر کے قبول کریں گے

ایک گھنٹے کا سوچ بچار ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ کیوں۔؟ یہ اس لیے بہتر ہے کہ عبادت کرنا آسان ہے اور صرف ہر ایک کے ذاتی مفاد میں ہوتی ہے، معاشرے کے افراد کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب کہ سوچنا، غور کرنا اور نتائج نکالنا ایک بہت مشکل عمل ہے۔ جب کوئی سوچتا ہے تو اسے سچائی نظر آنے لگتی ہے تو اس سے یقیناً پھر معاشرے کی سوچ بدلے گی کیونکہ وہ دوسروں سے اس کا ذکر ضرور کرے گا۔ حقیقت پسندی آئے گی۔ اور کسی مسئلے پر سوچ سے حل نکلنے کی امید ہوتی ہے جس سے تمام معاشرہ فائدہ اٹھائے گا۔ نہ سوچنے والوں کے لیے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی وارننگ دیکھیں؛

> ''جو سوچتے نہیں، جو محسوس نہیں کر سکتے، جو دیکھ کر مشاہدہ کر کے نتیجہ نہیں نکال سکتے، نہ ہی دوسروں سے سن کر اس پر سوچتے ہیں کہ وہ صحیح بھی ہے یا کہ نہیں، تو وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔'' (سورہ ۷:۱۷۹)

جو سوچتا نہیں وہی نقصان اٹھاتا ہے۔

AYAH al-A`raf 7:179; having hearts wherewith they understand not, and having eyes wherewith they see not, and having ears wherewith they hear not. These are as the cattle - nay, but they are worse! These are the neglectful.M. M. Pickthall

غور و فکر کے لیے بنیادا اپنے آپ سے سوال کرنا فراہم کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اچھا سوال آدھا علم ہے۔

Shuabul Imaan of Imaam Bayhaqi #6148.

حدیث کے مطابق سوچنے کے لیے یا تو آپ کے ذہن میں سوالات آنے چاہئیں۔ جیسے کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، مرنے کے بعد کہاں جاؤنگا۔ یا پھر

آپ کے ذہن میں مشاہدات سے سوال آنے شروع ہو جانے چاہئیں، اور جواب کی تلاش سے ہی غور وفکر شروع ہونے کی عادت بنے گی۔ مثلاً اپنے آپ سے پوچھیں کہ ہم دوسروں کے مقابلے میں کیوں غریب ملک ہیں۔ جہالت کیوں ہے۔ ہمارے ملک میں سچ، مساوات، انصاف کیوں نہیں ہے۔ سیاست دانوں کی پوچھیں کہ ہم ترقی کیوں نہیں کر رہے۔ پینے کا پانی کیوں نہیں ملتا ہمیں ٹینکر کیوں خریدنے پڑتے ہیں۔ تو تب یہ لوگ ٹھیک ہونگے۔ سوال پوچھنا ہی ترقی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تبھی سچ سامنے آئے گا اور ترقی ہوگی۔ نئے آئیڈیاز آئیں گے۔

ہم اپنے لیڈروں سے جب سوال ہی نہیں کرتے پھر انہیں کیوں فکر ہو، جب ہمیں اپنی فکر نہیں ہے۔؟

نئے آئیڈیا پیدا کرنا بھی سنت ہے۔ نئے آئیڈیا بھی غور وفکر سے پیدا ہوتے ہیں۔ معلم کا یہی کام ہوتا ہے۔ کہ سوچنا سکھائے تا نئے آئیڈیاز پیدا ہوں ہے۔

ہمارے یہاں موبائل فون اور انٹرنیٹ، الیکٹرانک بکس کی وجہ سے کتابیں پڑھنے کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے۔ پاکستانی سروے کے مطابق، انفارمیشن بکس پڑھنے کی شرح بارہ فیصد ناول ۲۷ فیصد، ڈائجسٹ ۳۲ فیصد، شاعری پڑھنے کا رجحان صرف بارہ فیصد رہ گیا ہے حیران کن بات یہ ہے کہ سکول کے مضامین کی کتابیں پڑھنے کا رجحان بھی کم ہوا ہے۔ وہ خلاصے اور نوٹس سے کام چلاتے ہیں۔

عرب کلچر کی ترقی کی رپورٹ کے مطابق، امریکن سال میں گیارہ کتابیں پڑھتے ہیں اور برٹش سات کتابیں، اور عرب اوسطا سال میں ایک صفحے کا چوتھا حصہ

نماز میں سوچ، فکر غور ہے ہی نہیں۔ جب کوئی کہتا ہے کہ تو روزِ حساب کا مالک ہے۔ یا میں تجھی سے مدد مانگتا ہوں۔ تو کیا وہ سچ کہہ رہا ہے۔؟ اگر سچ کہے تو پھر روزِ حساب سے ڈرے گا بھی اور صرف اسی سے مانگے گا، تو نماز برائیوں سے روک بھی لے گی۔ مگر اسے تو ترجمہ نہ آنے سے معلوم ہی نہیں کیا کہہ رہا ہے۔

مسلمان سائینس دان، ابن الہیثم کو سائینسی طریقے کا باپ کہا جاتا ہے۔ ان کا

کہنا ہے کہ ''اگر ایک سائینس دان کا مقصد سچ کی تلاش ہے تو اسے ہر وہ چیز جس کو پڑھتا ہے اس کا اسے دشمن بن جانا چاہیے اور اس پر تنقید اور سوالوں سے حملہ کر دینا چاہیے۔ اسے اپنے تجربات کے نتائج کو بھی چیلنج کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنی ذات کے تعصب میں بھی گرفتار نہ ہو جائے۔ یا آرام پسند ہو جائے۔'' ابن الہیثم۔ علامہ ابن قیمؒ کے مطابق علم کی کنجی سوال کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دنیا میں بھی اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، اور سیدھے راستے سے دور۔ (۱۷۔۷۲)

سبق

ہمیں بچوں میں بچپن سے ہی سوچ بچار کی عادت ڈالنی چاہئے۔ کیسے۔؟ خود بھی غور و فکر کرنا سیکھیں تو جو طریقہ معلوم ہو وہی بچوں کو سکھائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''حق آیا اور باطل بھاگ جاتا ہے۔'' ۱۷۔۸۱۔ اس لیے میرے خیال میں ہر مسلمان کو حق کی تلاش کا عادی بننا چاہئے۔

غور و فکر عبادت سے بدرجہا ثواب میں بڑھا ہوا ہے۔ غور و فکر سے ہی ملک و قوم کی ترقی ممکن ہے۔ اس لیے تقلید کو چھوڑ کر ہر چیز کو چیلنج کریں اور سچ ڈھونڈیں۔ سچ کی تلاش کے لیے بچوں میں بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے، سوال کرنے اور جواب ڈھونڈنے کی عادت ڈالیں۔ انہیں ہر کام، عادت، رسم کا بتانا چاہیے کہ یہ ہم کیوں کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا ذاتی یا معاشرے کا اجتماعی کیا فائیدہ ہے۔ سکول کی پڑھائی، ہوم ورک کے وقت ان سے سوال پوچھیں بار بار پوچھیں، اسی طرح ادب، شاعری، ناول کہانیاں پڑھیں تو ان سے کیا نتائج نکالے جاسکتے ہیں نکالیں،۔ ان سے لوگوں کی سوچوں، عادات رسم و رواج، زبان، کا پتہ لگے گا،۔ اپنے آپ اور بچوں سے یہ ضرور پوچھیں اور یہ گھر میں شیئر کرنے سے سوشل ہونے، بات چیت کرنے اور سیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس سنت پر عمل کرنا بھی آسان ہے کیونکہ ذاتی عمل ہے۔

☆......☆......☆

۱۱۔علم کو ہتھیار بنانا سنت ہے

Knowledge is my arms

☆**حدیث:** ''علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔''
(طبرانی240;10)

''جس نے بچپن میں علم حاصل نہ کیا اور بڑی عمر میں علم حاصل کرتے فوت ہو گیا تو وہ شہید ہے۔'' (کنزالعمال28843)

''علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے'' (کنزالعمال نمبر28697)

''**اطلبوا العلم ولو کان با لصین**'' (ڈاکٹر محمد دین ص104)

''اے لوگو علم سیکھنے سے آتا ہے اور سمجھ کوشش سے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ جس کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے اور بندوں میں سے اللہ تعالیٰ سے زیادہ وہی ڈرتے ہیں جن کے پاس زیادہ علم ہو۔'' (کنز29265)ص244

مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مجھ سے جو سنو آگے پہنچاؤ، چاہے وہ ایک آیت ہی ہو۔(**بلغوا عنی ولو آیۃ**)اللہ اس بندے کو خوش رکھے جس نے میرا کلام سنا، یاد رکھا اور پھر آگے پہنچا دیا۔

''اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر فیاض ہے اور میں اولاد آدم میں فیاض ترین ہوں میرے بعد تم میں فیاض ترین وہ ہو گا جس نے علم سیکھا اور پھر اس کی

اشاعت کی۔ایسا شخص قیامت کے دن پوری امت کی شان سے اٹھایا جائے گا۔'' (کنزالعمال۔ترجمہ ڈاکٹر محمد دین پشاور۔ص 103)

''اگر کسی سے علم کے بارے کوئی بات پوچھی جائے اور وہ جانتے بوجھتے نہ بتائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام دی جائے گی۔''

بدر کے قیدیوں کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینا تھا۔یعنی حضور اکرم ﷺ نے علمی پسماندگی دور کرنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کیا مگر آج ہم علم کے دشمن ہیں خصوصا عورتوں کی تعلیم کے جنہوں نے اگلی نسلوں کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔

نقصان دہ علم سے منع کیا گیا ہے اس لیے پناہ کی دعاء مانگنی چاہیے ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا؛ اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، ایسے علم سے جو نفع بخش نہ ہو، اس دعا سے جو سنی نہ جائے، ایسے قلب سے جو نہ ڈرے، اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو۔

''علم میں اضافہ بہت پسندیدعمل ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

قل رب زدنی علما. (طہ ۱۱۴)

''آپ کہیں کہ اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔''

کیا ان احادیث کو پڑھنے کے بعد بھی ہم قائل نہیں ہو گئے کہ ابھی سے، اسی وقت دین اور دنیا کی ترقی کے لیے علم حاصل کرنے کا تہیہ کر لیں۔اور کتابیں پڑھنے کی عادت ڈال لیں۔اور اپنے تجربات کو لکھ کر اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کر لیں؟ مسلمانوں کے غلبے کی تیاری کے لیے علم کا ہتھیار استعمال کرنا سیکھ لیں۔

حضرت آدم کو ملائکہ پر برتری صرف علم کی وجہ سے دی گئی تھی۔ساتھ ہی قوت فیصلہ کی facility بھی جس کے لیے علم یا inputs چاہیے ہوتا ہے۔اس لیے انسان کو کہا گیا تھا کہ تمہیں پیدا کرنے سے پہلے تمہارے استعمال کے لیے زمین اور آسمان

بنائے گئے تھے۔تمہیں ان میں موجود چیزوں کواستعمال میں لانے کے لیے ان کوتسخیر کرنا ہوگا جوکہ صرف علم سے ممکن ہوگا۔اس سے علم کی اہمیت کا پتہ چل جاتا ہے۔

علم کی ترقی کے بغیر دنیاوی ترقی،سہولیات کا میسرآنا ممکن نہیں۔اورآج کی تمام سہولیات،جیسے ایئر کنڈیشنر، پرنٹنگ پریس،بجلی کے آلات، کاربس، ہوائی جہاز وغیرہ،مغربی دنیا کی علمی،تعلیمی اور صنعتی صلاحیت،سوچوں اور نئے آئیڈیاز پیدا کرنے کی مغربی ٹیکنالوجی کی مرہون منت ہیں۔ہم بھول گئے ہیں کہ دنیاوی علوم کا مقصد اس دنیا کی زندگی میں آسانیاں حاصل کرنا بھی ہے اور آسانیاں مہیا کرنے کی نبوی نصیحت بھی ہے۔

رسول کریم ﷺ نے صرف علم کے فرض ہونے کو بتایا ہے اور چین جانے کی حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے کسی خاص علم کی تخصیص نہیں فرمائی تھی۔اس لیے انکے فرمان پر عمل ہی مسلمانوں کی کایا پلٹ سکتا ہے۔علم کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے تجربات کو دوسرں کے لیے تحریر کرے، دوسروں تک پہنچائے ورنہ ایک نسل کا علم ضائع ہوجائے گا۔اورنئی نسل پھر سے پہیئے کوایجاد کے چکر میں زندگی برباد کرتی رہے گی۔(اگرچہ ایک دواحادیث بارے اختلاف ہے کہ حدیث ہیں یا کسی کا قول۔مگر ہمارے موضوع کے لیے قول بھی ہوتو بحث میں فائدہ مند ہیں)

صدیوں سے ہم نے علم کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ہم نے دین کے علم کو ہی صرف علم بنادیا ہے۔اورصرف اس کے حصول میں ثواب بتاتے ہیں، دوسرے دنیاوی علوم کے حصول پر ثواب کا نہ ہی بتایا جاتا ہے اور، نہ صحیح سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ رزق حلال فرض ہے اور یہ سب سے زیادہ اہم عمل، جوصرف دنیاوی علوم کے حصول سے ممکن ہے۔اورقدرتی طور پر اس علم کا حاصل کرنا بھی اتنے ہی ثواب کا باعث ہوگا جتنا کہ دینی علم۔دونوں کا حصول، دونوں زندگیوں،یعنی دنیا اور آخرت کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ہمیں قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے کہ طاقت کے تمام ذرائع بشمول گھوڑے یا فوجی طاقت مہیا کروتا کہ دشمن کے دل میں خوف پیدا ہو۔سورہ انفال، آیت ۶۰۔ یہ طاقت

معاشی طاقت کے بغیر ممکن نہیں، اور معاشی طاقت علم کے بغیر ممکن نہیں۔تو علم حاصل کرنا، ہمارے لیے آج، سب سے اہم فرض بن جاتا ہے۔

جو علم مسلمانوں کی دنیاوی ضرورت کو پورا کرے یا طاقتور بنائے، سب پر یقیناً ثواب ملے گا اور یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہدایات پر عمل کی وجہ سے ملے گا۔ نئی نسل کو اور یہی بتانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے تو لا محدود علم ۔تمام کائنات کا مطالعہ، اور اس پر غور و فکر کر کے سمجھنے، کائنات کو انسان کے لیے مطیع کر کے اس کو استعمال کرنے کی چیز بنا دیا ہے۔مگر علم کو محدود کر کے ہم نے مسلمانوں پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔انہیں محکومی اور غلامی میں مبتلا کر دیا ہے۔۔

آپ ﷺ نے ہی پنگھوڑے سے قبر تک ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا تھا، یعنی علم حاصل کرنا پوری زندگی پر محیط ہے۔ یہ نہیں کہ جب جاب مل گیا تو پڑھنا بند کر دیا جائے۔اور علم کے لیے دور دراز چین تک بھی جانا پڑے تو جانے کا حکم تھا۔یعنی دین کے ساتھ دنیا کی تعلیم ضروری قرار دی گئی دین کا نظریاتی غلبہ حاصل کرنا ممکن ہو سکتا تھا کیونکہ اور دوسروں تک اللہ کا آخری پیغام پہنچانا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔اب کوئی نیا نبی تو آنا نہیں ہماری ہی ذمہ داری ہے۔

علم اور انفارمیشن میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔علم حقیقت کو بیان کرتا ہے۔انفارمیشن وہ ڈیٹا ہے جس کے تجزیہ کے بعد علم نکالا جاتا ہے۔

ہر آدمی اور عورت کو دنیا میں آنے کے اپنے مقصد اور اپنی پوشیدہ قابلیت و صلاحیت کی پہچان کرنے کی ضرورت ہے تبھی وہ بھرپور اور کامیاب زندگی کے ساتھ قوم کے لیے بھی باعث افتخار بن جاتا ہے۔کیونکہ ہر فرد دراصل قوم کا ستارہ ہوتا ہے۔دنیا کا علم، حقائق اشیاء کا علم ہے جس سے ہی اس زندگی میں دوسروں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

بدقسمتی سے امت مسلمہ علم حاصل کرنے کا اہم سبق بھول چکی ہے۔وہ سمجھتی ہے کہ ملازمت کے لیے ضروری ہو تو ٹھیک ہے پڑھ لیں۔مگر اللہ کی معرفت کے لیے اور دنیا کی تسخیر کے لیے علم حاصل کرنے میں محنت کرنا غیر ضروری ہے۔ خاص کر

عورتوں کو جنھوں نے اگلی نسل کی تربیت کرنی ہے انہیں علم سکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، بہشتی زیور میں تعلیم نسواں کے تحت لکھتے ہیں کہ "اس چیز کے باوجود کہ رسول کریم ﷺ نے ہر مسلمان مرد اور عورت کو مرنے تک لگاتار علم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے مگر علمائے ہند کا خیال ہے کہ عورتوں کو صرف پڑھنا سکھایا جائے لکھنا نہیں"۔ کیا یہ رائے نبی کریم ﷺ کے ارشاد کی مخالفت نہیں ہے۔ اپنی رائے کو نبی کی رائے پر ترجیح دینے کی غلطی نہیں ہے۔

قرآن پاک کا ترجمہ کرنے کی بھی صدیوں تک مخالفت کی گئی کہ قرآنی پیغام سمجھنے کے لیے ترجمے کے ساتھ پڑھنا ضروری نہیں مولوی صاحب جو بتا دیں بس مان لو۔ اور یوں قرآن کو صرف ثواب کمانے کی کتاب بنا دیا گیا ہے کہ ناظرہ پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ میرے خیال میں یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی صریح حکم عدولی ہے، جب وہ خود سورہ یوسف میں کہتا ہے کہ یہ قرآن عربی میں اس لیے نازل کیا گیا ہے تاکہ لوگ سمجھ سکیں۔ تو کیا سمجھنے کے لیے ہر زبان میں ترجمہ کرنا ضروری نہیں بنتا۔ عیسائیوں نے انجیل کا زیادہ تر زبانوں میں ترجمہ کر دیا ہے۔ ان کے برعکس ہم صدیوں سے ترجمکہ کرنے سے اعراض برتتے چلے آرہے ہیں اور نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔ علم کی قوت تسخیر کے ذریعے ہی گوروں نے تمام دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

ہم نے صدیوں سے علم دشمن, غلط سوچوں و نظریات کی وجہ سے صدیوں سے دوسروں کے غلام بن چکے ہیں مگر اپنی سوچوں کی روش نہیں بدلنی۔ نہ ہی دوسری قوموں کا مقابلہ کرنے کا شوق ہے مگر دعوی مسلمانوں کے اس صدی میں غلبہ کا ہے۔ اور وہ بھی غلط پالیسیوں سے۔ مغربی مما لک میں آپ کہیں گھوم جائیں۔ لوگ آپ کو کتابوں کے شیدائی نظر آئیں گے۔ ٹیوب ٹرین، جہاز، غرضیکہ اجتماعی سفر کے ذرائع میں کتابیں پڑھتے نظر آئیں گے۔ روزانہ کا تجربہ ہے کہ صرف مغربی مما لک کے مسافروں کے دستی سامان میں آپ کو کتاب نظر آئے گی۔ ہمارے مسلمان مسافروں کے بیگ سامان سے بھرے وہ آپ کو لاؤنج میں گپیں لگاتے نظر آئیں گے۔ ان کے یہاں کتابیں اتنی سستی

ہوتی ہیں کہ وہ انہیں خرید سکتے ہیں آسانی سے۔ جبکہ پاکستان میں کتابیں بہت مہنگی ہیں۔یعنی ہم خود اپنے آپ کو جاہل رکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔کتابوں کا کاروبار بھی جاہل تاجروں کے پاس ہے۔یہ مجھے تب پتہ چلا جب میں نے کتاب چھاپنے کی کوشش کی۔ پبلشر مصنف سے ہی پیسے لگواتے ہیں اور اس کا استحصال کر کے کو ایک بھی پیسہ دینے کے لیے تیار نہیں صرف سو کتابیں اس کو دے دیتے ہیں۔ پرچون کتابیں بیچنے والے پبلشر کا ہر طرح استحصال کرتے ہیں۔اور چالیس سے ساٹھ فیصد رعایت پر ادھار کتابیں لیتے ہیں اور باقی قیمت مرضی سے دیتے ہیں۔

ہر قسم کے مقابلے میں جیتنے کے لیے داؤ پیچ، مہارت چاہئے ہوتی ہے اور جن کا سیکھنا بھی علم ہی کہلاتا ہے اور جس کی پریکٹس کر کے ہی ماہر ہوا جا سکتا ہے۔جیسے تلوار، ڈھال کا استعمال بھی علم ہے۔گھڑ سواری کا بھی علم ہے۔اسی طرح تبلیغ، دعوت، مناظرہ، خطابت یہ سارے علوم سیکھنے ہوتے ہیں۔یہی سب ہتھیار کہلاتے ہیں۔ ماڈرن علوم سیکھنا بھی ہتھیار سیکھنا ہی کہلائے گا۔اسی ہتھیار بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا ہمیں علم سیکھنا اور اسے استعمال کر کے جیتنے کی ترغیب دینا ہے۔مگر جب یورپ صنعتی دور میں داخل ہو رہا تھا تب توجہ ہی نہ دی اور مغلوب ہو گئے

سبق

ہمیں نبی کریم ﷺ کی طرح علم کو بطور ہتھیار استعمال کرنا سیکھنے کی ضرورت ہے۔ہتھیاروں سے ہی دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں مگر پچھلے چار سو سال سے ہم بغیر علم کے ہتھیار کے لڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور لگاتار شکست کھا رہے ہیں۔

علم اور عبادت میں ترجیحات کو سمجھنا ضروری ہے۔ میرے خیال میں صرف فرض عبادات کو یقینی بنا کر باقی وقت بنیادی اور اپلائیڈ علم سیکھنے میں لگانا چاہیے۔ ہمارے لیے ہر قسم کی طاقت جلد سے جلد حاصل کرنا ایمرجنسی ضرورت بن گئی ہے۔

☆......☆......☆

۱۲۔سب سے آسان حل تلاش کرنا بھی سنت ہے

لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا بھی سنت ہے۔

☆**حدیث:** ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہﷺ کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپﷺ ہمیشہ آسان کا انتخاب کرتے۔''(بخاری)

کلامِ پاک میں رب العالمین فرماتے ہیں: ''دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

22-78"has not laid upon you in religion any hardship"

دوسروں کے لیے آسانی پیدا کرنا تب ممکن ہوسکتا ہے جب دوسروں سے محبت ہو۔ان کے آرام کا خیال ہو۔ہم خود کو بھی انسان سمجھیں اور دوسروں کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھیں۔ان کی تکلیف کا احساس ہو،انسانوں سے محبت،انسانی عزت،خیر خواہی، ہمدردی ہو،ہم وطن سمجھیں۔اپنا سمجھیں جن کا مستقبل مشترک ہےتو پھر ہی آسانیاں پیدا کریں گے

یہ سنت بھی ایڈمنسٹریشن کا بہت اہم اصول ہے۔چونکہ اس اسوۂ حسنہ کا ذکر بطور سنت نہیں کیا جاتا، یا لکھا جاتا اور نہ ہی کبھی کسی خطبہ یا تقریر میں اس کو سنت کہہ کر بیان کیا جاتا ہے اس لیے گڈ گورنس کی یہ سنت ہم مسلمانوں کی سوچ، عادت،اور اس سے زندگی اور کلچر میں داخل نہیں ہوسکی۔حالانکہ دوسروں کے لیے رحمت بننا ہو تو سب سے پہلے اسی سنت پر عمل کریں گے کہ مجھے چاہے تکلیف ہو جائے مگر میں دوسروں کے لیے آسانیوں کا ذریعہ بنوں گا۔

ہمارے یہاں جو بھی قانون بنایا جاتا ہے،طریقہ کار وضع کیا جاتا ہے اس میں

لوگوں کے لیے سہولت اور آسانی نہیں دیکھی جاتی بلکہ دفتر والے اپنی آسانی کے لیے طریقے بناتے ہیں۔ایک بار میں کبھی کام ہو ہی نہیں سکتا۔بل میں محکمے کی غلطی کا خمیازہ بھی صارف کو بھگتنا ہوتا ہے۔بل ٹھیک کرانے کے لیے بار بار چکر لگانے پڑتے ہیں۔ محکمے ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔اس رویے سے آخرت میں کتنی پکڑ ہوگی، یا معاشرے میں کتنی بے چینی، فساد، نفرت، پیدا ہوگی، اور ردعمل میں محکمے کی بجائے ملک کو گالیاں دیتے ہیں اور ہر بندہ یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش میں ہے۔اس کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔

علامہ ابن القیمؒ کے مطابق، **"حالات ،زمان اور مکان یعنی وقت اور جگہ۔عادات ۔نیتیں اور ماحول کی تبدیلی سے متعلقہ فتویٰ بھی بدل جاتا ہے۔"** فتوی کا مطلب رائے ہے۔اگر ہم وقت کے ساتھ رائے میں تبدیلی نہ لائیں گے تو پھر نیا حل بھی نہیں لائیں گے،تو پھر یہ مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتی ہے۔جبکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ لوگوں کے لیے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا۔حضورﷺ کا فرمان ہے کہ دین کو آسان کر کے پیش کرو۔

زاویہ پروگرام کے آخر میں جب اشفاق احمد ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ: **"اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔"** تو وہ دراصل اسی حدیث کو نصیحت کی شکل میں بیان کر رہے ہوتے تھے کہ اسے زندگی کا اصول اور عادت بنا کر اپناؤ اور عمل کرو۔یہی حدیث کی اپلائیڈ شکل ہے۔

اس حدیث پر گورے پورا پورا عمل کرتے ہیں بلکہ اگر یہ کہیں کہ آسانیاں پیدا کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت میں ہے کہ لوگ ہمیشہ آسانیاں چاہتے اور تلاش کرتے ہیں، تبھی سسٹم ترقی کرتے ہیں۔

ہم مسلمانوں نے مسئلے کیا حل کرنے ہیں، ہم تو ان سے سمجھوتہ کر کے زندگیاں گزار دیتے ہیں بلکہ اب تو ہم مسائل پیدا کرنے والے بن گئے ہیں۔جب ہمیں صرف

اپنی ذاتی فکر ہوگی، تو پھر دوسروں کے لیے آسانیاں کیسے پیدا ہوسکتی ہیں۔

میری سمجھ کے مطابق، ہمارا نیشنل مائنڈ سیٹ یہ بن گیا ہے کہ جب تک ہم کسی کو تکلیف میں نہیں ڈالیں گے تو وہ ہماری نہ ہی عزت کرے گا، نہ پرواہ کرے گا۔ تو دوسروں سے عزت کرانے کے لیے پہلے مشکل میں ڈال کر تنگ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اس کے بعد مسئلے کے حل کے لیے ہمارے ہی پاس آئے گا تو حل کر کے احسان کریں گے تب وہ ہمیں بڑا بھی مانے گا اور عزت بھی کرے گا۔۔ سیاست دان یہی کرتے ہیں کہ پہلے مسائل پیدا کرتے ہیں، رلاتے ہیں، محروم رکھتے ہیں اور پھر الیکشن کے سال حل کر کے کریڈٹ بھی لیتے ہیں کہ ہم تمہارے ہمدرد ہیں ہمیں ووٹ دو۔ مگر دراصل بدمعاشی کر رہے ہوتے ہیں۔

آسان حل تلاش کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے کے جتنے ممکن حل ہو سکتے ہیں، پہلے ان کو سوچ کر لکھ لیا جائے اور پھر ان میں سے ہر ایک میں لوگوں کے لیے مشکلات اور آسانی کا اندازہ لگا کر تجزیہ کر کے process of elimination سے ایک ایک چھوڑتے جائیں حتیٰ کہ ہم لوگوں کے لیے آسان ترین حل تک پہنچ جائیں

اس سنت رسول کریم ﷺ سے ایک اور اصول بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی ایک بھی مسئلے کو جو لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہو، حل کیئے بغیر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اسی لیے آپ ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ حاکم کا فیصلہ اگر غلط بھی ہو جائے تو اسے ایک ثواب ملے گا۔ اس سے حاکم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ حاکم کو فیصلہ لٹکانا نہیں چاہیے بلکہ عارضی فیصلہ بھی کر لینا چاہیئے۔ مگر ہمارے فیصلہ کنندگان کے پاس ایک ہی طریقہ ہے کہ فیصلہ نہ کرو، معاملہ لٹکاؤ۔ یا تو لوگ تنگ ہو کر چھوڑ جائیں گے یا حالات سے خود ہی حل نکل آئے گا۔

ہم میں سے ہر ایک کو ان تمام مسائل جن کی نشان دہی ہو اور ان کا حل ہمارے دائرہ اختیار میں ہو تو اس کے حل ڈھونڈنے شروع ہو جانا چاہیے۔ اگر عارضی فیصلہ یا حل بھی ممکن ہو تو کر لینا چاہیے۔ اس سے جزوی فائدہ ہو جائے گا۔ حقیقت پسندی، لوگوں کی

ہمدردی وفکر، نیک نیتی فیصلہ کرنے کا اثاثہ ہے۔ اسی سے صحیح اور میرٹ پر فیصلہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ورنہ مفاداتی فیصلوں سے لوگوں کو تکلیف ہوگی۔

اگر خود کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتے تو پھر جو حل کر سکتا ہو، سائل کو مکمل رہنمائی کریں کہ کون حل کر سکتا ہے۔ اگر کوئی محکمہ ہو تو اس کو ضرور لکھ کر اطلاع دینی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو حل بھی تجویز کر دیں کیونکہ اس کے لیے آسانی ہوگی اور وہ حکم دینے میں تاخیر نہیں کرے گا۔ مثلاً ہمارے اپنے محلے میں صفائی کا انتظام نہیں تھا تو ہم نے ٹاؤن انتظامیہ کو لکھ کر تجویز دی کہ چونکہ پیسے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تو محکمے پر بوجھ ڈالنے کی بجائے ہم پیسے دینے کے لیے تیار ہیں، مگر انتظام کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، یہ آپ کر دیں۔ الحمدللہ کہ ایک ماہ بعد ہی سو روپے ماہوار میں انتظام ہو کر سسٹم چل رہا ہے۔

فیصلہ کرنے والے یا حاکم کے لیے vision، بصارت و بصیرت، مستقبل بینی۔ لانگ ٹرم اثرات کا ادراک کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ کہ کسی فیصلہ کے مستقبل کی نسلوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ صرف وقتی فیصلوں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ دوسروں کے کلچر، تہذیب، علم کو سٹڈی کرنا چاہیے اور اپنے فائدہ کے لیے جو مناسب ہو، ان سے لے لینا چاہیے۔ اسلام دنیا میں isolation میں نہیں رہ سکتا ہے۔ اسے تمام لوگوں اور قوموں اور تہذیبوں کے ساتھ interact کرنا ہے۔ کچھ دینا ہے کچھ لینا ہے۔ یہی دنیا کا اصول ہے۔

انسانوں کی فطرت ہمیشہ ایک ہی جیسی رہتی ہے۔ عوام ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے ہر قسم کی حرکتیں کر سکتے ہیں، چکر چلا سکتے ہیں۔ اس لیے قوانین میں تبدیلی لاتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ کوئی قانون ہمیشہ کیلئے نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ابن قیمؒ نے یہ کہا ہے کہ لوگوں کی نیتیں بدل جائیں تو قانون بدل دینا چاہیے۔

سبق:

اگر آپ چاہتے ہیں کہ جہاں بھی کسی کام کے لیے جائیں تو کام فوراً ہو جائے

اور بار بار کے چکر نہ لگانے پڑیں تو پھر جب کوئی آپ کے پاس کام کے لیے آئے تو پوری کوشش کریں کہ اس کا کام فوراً ہو جائے۔ اور اسے چکر نہ لگانے پڑیں۔

اگر خود نہیں کر سکتے تو مکمل رہنمائی کریں کہ کون کر سکتا ہے۔

اگر آپ کسی دفتر، محکمے میں ذمہ دار پوزیشن میں ہیں، تو رولز، قاعدے قوانین ایسے بنائیں کہ لوگوں کے لیے آسانیاں ہوں۔ ہر کام کرنے کے لیے کچھ شرائط اور کاغذات چاہیے ہوتے ہیں، انکو تو تفصیل سے لکھیں۔ آج کل انٹرنیٹ کے ذریعہ کام کئے جا سکتے ہیں اس کو استعمال کریں تاکہ لوگوں کو خود آنے کی تکلیف سے بچا لیں۔

اس اسوۂ حسنہ اور سنت پر عمل بہت آسان ہے۔ ہر ایک اس پر عمل کر سکتا ہے اور کرنا چاہئے۔ صرف ذہن بنانے کی ضرورت ہے اور آج سے اپنے آپ سے وعدہ کر لیں کہ ”میں آج سے دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والا اور آسانیاں بانٹنے والا اور رحمت بنوں گا۔“

اگر سب یہی کر لیں تو ہمارا مائینڈ سیٹ آسانیاں بانٹنے والا بن جائے گا اور بچے بھی ہمیں دیکھ کر ایسے ہی بن جائیں گے۔

☆......☆......☆

۱۳۔تدریج کے اصول کے تحت آہستہ آہستہ عادات تبدیل کروانا یا احکام کا نفاذ سنت ہے

☆حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی گئی وہ مفصل ایک سورۃ ہے۔ جس میں دوزخ اور جنت کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے دائرے میں آئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر بالکل شروع ہی میں حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زنا، نہ کرو تو لوگ کہتے ہم ہرگز زنا نہیں چھوڑیں گے۔'' (بخاری کتاب فضائل قرآن، باب تالیف القرآن، 6/100-101، بحوالہ انسان کامل۔صفحہ 169)

یہ سنت انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ایک دم سے سارے قوانین پر عمل کے لیے اصرار کرنا غلط پالیسی ہے۔ انسان جن عادات، خیالات، کلچر کی رسومات سے مانوس ہو جائے، اسے ہی صحیح سمجھ لیتا ہے۔ کھانے پینے، لباس، شادی کی رسومات وغیرہ صدیوں میں بھی تبدیل نہیں ہوا کرتیں۔ٹھیک کرنا ہو تو حکمت اور تدریج ہی ٹھیک طریقہ بنتا ہے۔ذہن بدلنے سے شروع کریں تب تبدیلی آتی ہے۔زبردستی سے وقتی عمل کروایا جا سکتا ہے۔ ڈر دور ہونے سے لوگ پھر پرانی عادت کو لوٹ جائیں گے۔اسی لیے نبی کریم ﷺ نے پہلے سوچیں بدلی تھیں۔ جب احکام آئے تو فوراً عمل شروع ہو جاتا تھا۔

"آپ ﷺ نے بھی اسلام کی تبلیغ کے ابتدائی دور میں عرب کلچر اور عادات کو بدلنے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی۔آپ نے پہلے ان بنیادی سوچوں کو بدلا

تھا جو نقصان دہ تھیں۔ دلیل کی قبولیت کا مزاج پیدا کیا تھا۔ یہاں تک کہ اصلاح کی قبولیت کی استعداد پیدا ہو گئی تو پھر شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا اور وہ انقلابی نتیجہ نہ نکلتا جو عرب کلچر میں مدینہ میں جا کر نکلا۔'' (انسان کامل۔ص ۸۸)

مگر برصغیر کے مسلمان صدیوں سے تدریج کے اصول پر عمل نہیں کرتے رہے اور نہ ہی کرنا چاہتے ہیں۔ سوات میں زبردستی اور ایک دم سب احکام نافذ کرنے کی کوشش سے کتنے برے نتائج نکلے، اس کا پاکستان میں سب نے مشاہدہ کیا ہے۔ مغربی ممالک میں بھی پرانے مسلمان نومسلموں کے ساتھ یہی کرتے ہیں تو ان کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور ردعمل کے طور وہ اسلام ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ نومسلم خواتین کی رائے سنیں:

''extreme version of Islam. تنگ نظر اسلام اپنانا۔'' بد قسمتی سے ہم پر زور دیا جاتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد ہر اس چیز کو جو پہلے تھی بالکل بدل دیا جائے۔ یعنی ماضی کو بالکل رد کر دیا جائے۔ فیملی کے ساتھ بھی تمام تعلقات منقطع کر لیے جائیں تاکہ کافروں کے درمیان نہ رہا جائے۔ مجبوراً جب جینز کی بجائے سر سے پاؤں تک ہم لمبا لباس پہن لیتی ہیں تو تب ہی پرانے مسلمان تعریف کریں گے ورنہ نہیں۔ مگر یہ سب کرنا عارضی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ مصنوعی لگنے لگتا ہے۔ یہ سب کرنے کے باوجود دل نماز میں نہیں لگتا۔ تو ہم پریشان، confused ہو جاتی ہے۔ شادی میں بھی اختلافات ہو جاتے ہیں۔ پرانے مسلمانوں سے بھی تعلقات میں سرد مہری آ جاتی ہے اور تنگ آ کر اسلام چھوڑ دیتی ہے۔''

ایک اور نومسلم خاتون نے لکھا کہ:

''مجھے بھی مسلمان ہونے کے بعد ہر ایک نے ہر پرانی چیز کو فوری بدلنے کے

لیے کہا اور رشتہ داروں سے بھی دور رہنے کے لیے کہا مگر مجھے یہ بڑا مشکل لگا تو پھر میں نے سیرت رسول ﷺ سے رہنمائی لی اور خود فیصلہ کرلیا کہ میں مکہ کے زمانے کے نئے مسلمان ہونے والوں کی طرح آہستہ آہستہ اور بتدریج اپنے اوپر اسلام نافذ کروں گی اور زیادہ زور ایمان کی مضبوطی پر دونگی۔ کیونکہ اللہ کو پہچاننا، اس پر مکمل یقین، نماز روزہ سے زیادہ ضروری ہے۔اس لیے ہم بھی تیرہ سال لے سکتے ہیں۔''

ایک اور نومسلم نے لکھا کہ:

مجھے مسلمان ہونے کے بعد فوراً عبادات کی تفصیل پر زوور دیا گیا تو جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو پہلے توحید کی پختگی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اخلاق، حقوق اور معاملات کی تعلیم کی ضرورت ہے۔تب میں نے اپنی ترجیحات بدل دیں۔

ہم میں سے جو بھی مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے تو وہ بھی یہی غلطی کرتا ہے کہ ایک دم سے بہت سی باتیں یک لخت کرنے کی کوشش کرتا ہے، ہر وقت صرف مذہب کی بات کرتا ہے۔، ساتھ ہی دوسروں کو تبدیل کرنے کی کوشش بھی شروع کردیتا ہے۔کھیل کود، تفریح بھی بند کردے گا۔مگر یہ غلط اپروچ ہے۔اپنی اصلاح بھی بتدریج اور سوچ اور شعوری فیصلے پر مبنی ہونی چاہئے۔ جذباتی نہیں۔ایک دو چیزیں اپنا ئیں اور باقی عادت ویسے ہی رہنے دیں۔ دوسروں کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش نہ کریں۔تبھی دوسرے آپ کی تبدیلی میں معان ثابت ہونگے۔ کیوں کہ آپ کی تبدیلی دوسروں سے تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔اس لیے تبدیلی کو اپنے تک محدود رکھیں۔

ہمارے بچپن میں ریلوے ٹائم ٹیبل پر قائد اعظم کی ایک نصیحت لکھی ہوتی تھی۔کہ ''اگر تم سال میں ایک اچھی عادت اپنا لو یا ایک بری عادت چھوڑ دو تو مرنے تک بہترین انسان بن جاؤ گے۔'' یعنی قائد بھی سنت نبوی کے مطابق بتدریج اپنے آپ کو بدلنے کی نصیحت کررہے تھے۔ ایسی تبدیلی ہی پائیدار تبدیلی ہوتی ہے۔

سبق:

یہ کتاب چونکہ اسوۂ حسنہ پر عمل کی ترغیب کے لیے ہے تو ہمیں بھی مکی ماڈل سے شروع ہونا چاہیے اور پہلے چند سال اپنے ایمان کو مضبوط کرنے پر محنت کرنی چاہئے۔ اور باقی معمولات پرانے ہی رکھیں۔تا کہ دوسرے بھی تنگ نہ ہوں۔مکی دور کی نقل کریں۔

ساتھ ہی سٹڈی کریں کہ آپ میں کون کون سی عادات نقصان دہ ہیں۔ان کی نشان دہی کر کے ان میں سے ایک کو چن لیں اور ایک سال میں اسے تبدیل کر دیں۔ سب سے اہم اخلاق، انسانی حقوق اور معاملات ہیں۔ان پر زیادہ توجہ دیں کیونکہ وہی آخرت میں تول میں بھاری ہونگی۔دوسرے انسان بھی انہی سے متاثر ہونگے۔

اس سنت پر عمل کرنا بھی بہت آسان ہے۔صرف دنیا اور دین دونوں میں ترقی کرنے کا دل میں شوق پیدا ہونا چاہیے۔آپ کا مقابلہ کسی اور کی بجائے اپنے آپ سے ہونا چاہیے اور چیک کرتے رہیں کہ ہر روز پہلے سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں یا کہ نہیں۔

☆......☆......☆

۱۴۔ عادات، اعمال میں استقلال رکھنا اہم سنت ہے

☆**حدیث:** ''وہ عمل وہ بہتر ہے جو خواہ تھوڑا ہو مگر مستقل ہو۔'' (بخاری 6464)

استقامت اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے عادات میں پختگی۔ consistancy and permanancy آ جاتی ہے جس سے کسی کے کردار کی پہچان بن جاتی ہے اور اس کا predictable behaviour pattern ہو جائے گا۔ جیسے حاتم طائی کی پہچان صرف سخاوت ہے، حضرت خالد بن ولیدؓ کی ذاتی بہادری، فوجی قیادت کی مشہوری ہے، قائداعظم کی اصولوں اور سچ پر مبنی سیاسی لیڈر شپ، ایدھی کی انسانیت کی خدمت، فوجی افسروں، جوانوں کی پختہ ڈسپلن والی عادات۔ علامہ اقبال اسی سنت کو شعر کی شکل میں یوں بیان کرتے ہیں:

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہی ہیں مردوں کی شمشیریں

نبی کریم ﷺ کی سنت کبھی نہیں بدلتی تھی:

آپؐ کے تمام اعمال اور اخلاق اس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ عمر بھر ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پیدا ہوا۔ حضرت علقمہؓ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ اے اُم المومنین، نبی کریم ﷺ کا عمل کیسا تھا؟ کیا آپ یہ عمل کسی خاص دن کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا، نہیں، آپ کا عمل اس مسلسل جھڑی کی طرح ہوتا تھا جو مسلسل برستی ہے۔ پھر فرمایا جو نبی ﷺ کر سکتے تھے وہ تم میں سے کون کر سکتا ہے؟ (بخاری کتاب الرقاق، باب القسد و مداومۃ العمل 182/7)

انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کون

سا عمل زیادہ پسند ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ؛ **جس پر انسان مداومت اختیار کرے خواہ قلیل ہی کیوں نہ ہو۔** اس کے بعد فرمایا کہ؛ **انسان صرف انہی اعمال کو اختیار کرے جن کی وہ طاقت رکھتا ہو۔** (بخاری)۔ حضرت جریرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ **آپ مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ میں حاضر ہوا ہوں اور آپ نے مسکرا نہ دیا ہو۔** (بخاری ۲۳۲۔۴ اور مسلم ۱۵۷۔۷)

آپ ﷺ کی استقامت کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر عمل، غور و فکر کے بعد، سوچ سمجھ کر، اور اس کے فوائد اور اثرات سمجھ، کر ہی شعوری فیصلے کے بعد اختیار فرماتے تھے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں ہر کام، عادت، فعل کو سوچ سمجھ کر شعوری فیصلہ کر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اسے سنت نبوی کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔

ضروری نہیں کہ ہر بات کو اپنایا جائے مگر جو بھی اپنایا جائے وہ موت تک عمل میں رہنا چاہیے تبھی وہ اس کی پہچان بن جائے گا۔ میں نے پڑھا ہے کہ تمام بڑے صوفیا کے نزدیک تصوف صرف اخلاق کا نام ہے۔ جو بھی اعلیٰ ترین صوفیاء ہیں وہ زندگی کی صرف ایک چیز کو اصول بنا لیتے ہیں جیسے نوریہ سلسلہ کی پہچان، ایثار کی عادت ہے۔ ایک اور سلسلے کا طریقہ اپنا احتساب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی نے ایک زیر تعمیر مکان کے پاس سے گزرتے سوچا کہ یہ کتنے عرصے میں مکمل ہو جانا چاہیے تو ساتھ ہی احتساب کا خیال آیا کہ تمہیں یہ سوچنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔

ایسے رویوں کی بنیاد یہ حدیث نبوی ﷺ ہے کہ ایک آدمی نے حضورؐ سے درخواست کی کہ مجھے صرف ایک عمل بتا دیں جس سے میں بہترین انسان بن جاؤں تو آپ ﷺ نے اسے صرف سچ بولنے یا جھوٹ نہ بولنے کے لیے کہا وہ مان کر چلا گیا۔ ایک دن شراب پینے لگا تو سوچ کر رک گیا کہ آپ نے پوچھ لیا تو کیا کہوں گا۔ جب بھی کسی غلط کام کا سوچتا تو جواب دینے کا سوچ کر رک جاتا۔ یعنی ایک عمل سے ہی وہ بہترین بندہ بن گیا۔ (انٹرنیٹ اخلاقی کہانیاں)۔ مثلاً اسی طرح اگر ہم ہر غلط کام کرنے کی خواہش کے وقت سوچ لیں کہ اللہ کیا کہے گا، والدین کو دکھ ہوگا، یا بدنامی ہوگی، تو ہم

اس سے رک جائیں گے۔اس سے یہ اصول نکلا کہ کوئی انسان ایک بھی اچھی عادت، اچھا اصول، اخلاق اپنا لے تو وہی انسان کو ایک مضبوط اور ہمہ گیر اپروچ دے گی اور اخلاق کو بہتر بنا دے گی اور وہی اس کی پہچان بھی بن جائے گی۔

استقلال عادت بنانے سے آتا ہے۔☆ **حدیث:**"جب تم کسی پہاڑ کے بارے سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اس کی تصدیق کرو مگر جب یہ سنو کہ کسی شخص نے اپنی عادت چھوڑ دی ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو، اس واسطے کہ وہ وہی کرے گا جو اس کی عادت ہے۔" (7349،مسند احمد۔عن ابوالدردا)

عادات کیا ہیں؟ یہ ایک رسی کی طرح ہوتی ہیں۔ہم ہر روز اس کا دھاگہ تیار کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ رسی اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ ہم خود اسے تیار کرنے کے باوجود اسے توڑنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ ہر آدمی جہاں پر ہے، جس مقام اور رتبہ پر ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ اپنی ذہن اور سوچنے کی عادت اور اعمال کی عادات کی ہی بدولت ہے۔اِس اصول کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ترقی کرنا چاہے تو اپنی موجودہ جگہ پر اپنی عادات کا جائزہ لے اور اِن عادات کو اختیار کرے جن کو اپنانے سے وہ اپنی پسند اور خواہش کے مطابق زندگی میں مقام و مرتبہ حاصل کر سکے۔ اور ان عادت کو چھوڑ دے جو نقصان دہ ہیں۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں مانع ہو سکتی ہیں۔

عادت قائم رکھنا اور اس کا احساس کتنا ضروری ہے۔اس کی بہترین مثال میں ایک گورے کی لائین نہ توڑنے پر اصرار سے دونگا۔ 1991 میں اسلام آباد ائرپورٹ پر فلائٹ کی بورڈنگ شروع ہوئی تھی کہ ایک چھاپہ ٹیم نے تمام پاکستانی پاسپورٹ والوں کے ویزے کی چیکنگ شروع کر دی جس سے فلائٹ کی روانگی میں دیر ہونے کا خدشہ پڑ گیا تو ہم نے لائین میں کھڑے غیر ملکیوں کو لائین توڑ کر بورڈنگ جاری رکھی تو ایک بوڑھے برٹش مسافر نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر آج میں نے یہاں اپنی عادت توڑ دی تو پھر میں انگلینڈ جا کر بھی لائین نہ توڑ دوں۔اس لیے میں آگے نہیں جاؤں گا۔ یعنی اس کو اپنی عادت کی استقامت کی فکر تھی اور وہ صحیح تھا کہ ایک دفعہ عادت کے خلاف کریں تو پھر آہستگی سے ہی سہی مگر عادت توڑنے کی عادت پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔

سبق

۱۔ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ شوق میں ڈھیر ساری عبادات اور ذکر شروع کر دیں جو قائم نہ رکھ سکیں۔اس لیے روحانی سفر آرام سے اور آہستہ آہستہ طے کریں۔ایک عادت پختہ ہو جائے تب دوسری شروع کریں۔دنیاوی معاملات میں بھی ایسے ہی کریں۔اس لیے میرے خیال میں ہم میں سے ہر ایک کا یہ اصول بن جانا چاہیے کہ اپنے لیے ایک بات چن لے جو اس کی پہچان بن جائے۔دوسری عادات کو ایک ایک سال میں بدلیں۔

۴۔ اپنی اچھی عادات اور شخصیت کی حفاظت کریں۔لوگوں کے غلط رویوں کے ردعمل سے اپنی عادات نہ بدلیں۔ورنہ اپنی شخصیت کو ہی نقصان پہنچائیں گے۔

۵۔ میرے نزدیک سب سے اہم عادت نیک نیتی کی ہے۔ہر عمل ثواب کی بجائے اللہ کی خوشنودی اور انسانیت کی بھلائی ہونا چاہیے

اس اسوۂ حسنہ اور سنت پر عمل کرنا بھی بہت آسان ہے۔پہلے وہ عادات چنیں جو آسان ہوں اور ذاتی ہوں، دوسروں کو بھی پسند آئیں، جیسے وقت کی پابندی، سلام میں پہل کرنا، صبح جاگ کر اللہ کا شکر ادا کرنا اور دن کا پروگرام بنانا۔تعریف کرنا، شکریہ ادا کرنا، سوری کہنا وغیرہ۔

☆......☆......☆

۱۵۔ جو اچھا مقصد بنالیں اس پر عمل شروع کر دیں اور کسی مخالفت پر ردعمل ظاہر نہ کریں، یہی سنت ہے۔

نبی کریم ﷺ کی راہ میں کوڑا ڈالنے والی بوڑھی کا مشہور قصہ ہے جب وہ ایک دن نہیں آئی تو آپ نے دریافت کیا کہ مائی کہاں ہے تو پتہ چلا کہ بیمار ہے تو آپ بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ **"وہ اس کا عمل تھا یہ میرا عمل ہے۔"** یعنی آپ کی دعوت کی ڈیمانڈ تھی کہ آپ ردعمل ظاہر نہ کریں بلکہ اپنے مقصد کے حصول کو سامنے رکھیں جو کہ دل جیتنا تھا۔ اسی لیے وہ بڑھیا مسلمان بھی ہوگئی تھی۔ ایک اور واقعہ اس اصول کو واضح کر دے گا:

> "دولڑکے ملازمت کے لیے انٹرویو دینے رکشہ میں جا رہے تھے کہ راستے میں چند شرارتی لڑکوں نے رکشہ پر پتھر مار دیئے تو ایک نے اتر کر لڑنا چاہا تو دوسرے نے کہا ہمارے پاس لڑنے کا وقت نہیں ورنہ انٹرویو سے لیٹ ہو جائیں گے۔ یعنی مقصد کو ذہن میں رکھیں۔ راستے کے پتھروں کی پرواہ نہ کریں۔" (مطالعہ سیرت، مولانا وحیدالدین خان)

اسوہ حسنہ کی طرح جو بھی دینی یا دنیاوی مقصد بنائیں تو اس کو ہر وقت سامنے رکھیں۔ دوسرے لوگوں کے بُرے ردِعمل کی پرواہ نہ کریں۔ ان کی مخالفت یا غلط ریمارکس کو نظر انداز کرتے اور معاف کرتے آگے بڑھتے جائیں اور اپنے آپ کو یاد دہانی کراتے رہیں کہ میرے پاس ضائع کرنے کا وقت نہیں کہ غیر متعلقہ لوگوں کی پرواہ کروں اور زندگی کا قیمتی وقت ضائع کروں۔ صبر ہی دنیاوی کامیابی اور جنت کی بھی قیمت ہے۔ اگر ایذا رسانی پر صبر نہ کروں تو جنت کیسے ملے گی۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ **"برائی کو اچھائی سے دُور کرو"** (۴۱۔۳۴)۔ برائی کے بدلے برائی کرنے سے برائی کرنے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہر انسان کا صرف اس کے اپنے اوپر کنٹرول ہوتا ہے دوسروں پر نہیں۔ اس لیے ردعمل ظاہر کر کے آپ ان سے اپنی مرضی کا کام نہیں کرا سکتے۔ بلکہ صبر سے خاموشی سے اپنا مقصد سامنے رکھیں اور اس کے مطابق بات کریں۔

تعلیم کے دوران سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور دوستوں پر وقت مت ضائع کریں۔ اپنے والدین کے پیسے اور اپنی زندگی کی حفاظت کریں۔ پہلے کچھ بن جائیں تب دوسری چیزوں کی طرف آئیں۔ تعلیم کے بعد ان میں حصہ لیں۔ ورنہ سب لیڈر اپنے مطلب کے لیے آپ کو استعمال کریں گے اور آپ کی زندگی کو کیا نقصان پہنچے گا اس کی انہیں پرواہ نہیں ہوتی ہے۔ زندگی بھر بھگتنا آپ نے یا بیوی بچوں نے ہے۔

سبق

۱۔ اس دنیا کی زندگی میں کچھ بھی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ غور و فکر کر کے مقصد بنایا جائے، اس کے حصول کی پلان بنائی جائے اور پھر اللہ پر بھروسہ کر کے اس پر عمل شروع کر دیا جائے اور دوسروں کی پرواہ نہ کی جائے۔ یہی سنت طریقہ ہے۔ یہی اللہ سبحانہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے کہ مجھ پر بھروسہ کرو۔

۲۔ بچے صرف اپنی تعلیم اور کچھ بننے پر توجہ مرکوز رکھیں۔ اگر وقت ضائع کر دیا تو ساری عمر روتے رہیں گے۔

اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنا تھوڑا مشکل ہوگا۔ بڑی توجہ، ہمت، پکا ارادہ مانگتا ہے۔ کیونکہ ہم میں تکبر اور جذباتی ہونے کی وجہ سے برداشت کی کمی ہے۔ ہم فوراً ردعمل ظاہر کرتے ہیں اور بھولتے بھی نہیں۔ جبکہ معاف کرنا اور بھول جانا ہی سکون اور کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

۱۶۔لگاتار دینی اور دنیاوی ترقی کرنا بھی سنت ہے

☆**حدیث مبارک:** ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے دو دن ایک جیسے گزرے وہ خسارے میں ہے۔'' (زیلمی)

"He whose two days are equal, is a loser." [Daiylami]

آپ ہی کا یہ بھی ارشاد ہے کہ **''اللہ تعالیٰ میری امت کے لیے ہر سو سال بعد مجتہد پیدا کرے گا جو دین کی اصلاح کرے گا۔''** (سنن ابوداؤد)

Book 37: Battles (Kitab Al-Malahim) Book 37, Number 4278:

ذاتی لیول، اور ملک اور قوم کے لیول پر لگاتار ترقی کے لیے اپنے علم، کردار، عادات اور سسٹم کو اپڈیٹ کرتے رہنا بھی سنت ہے۔ اس لیے اندھی تقلید قرآن اور سنت کے خلاف نظریہ ہے۔ ذاتی ترقی کے لیے بھی فارغ وقت کا صحیح استعمال، مشاہدہ اور غور و فکر ضروری ہیں۔ مگر ہم نے اسلام کے زیادہ تر نظریات کو غلط کر دیا ہے۔ مثلاً امام غزالیؒ، اپنی کتاب ''مراقبہ کی حقیقت'' میں لکھتے ہیں۔ ''فقہ کا اصل مطلب گہری سوچ پر مبنی علم اور پوری سمجھ ہے مگر لوگوں نے اسے صرف قانون یا فقہ کے لیے خاص کر دیا ہے۔'' یعنی مطلب الٹ کر دیا۔

امام غزالی کی اس بات سے ہمیں یہ دل سے تسلیم کر لینا چاہیے کہ وقت کے ساتھ ہمارے مذہب میں بھی غلط خیالات اور تصورات مل گئے ہیں مگر ہم انہیں اسلام ہی سمجھ رہے ہیں۔ ان غلط خیالات کی پہچان اور اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً نئے سرے سے سوچ بچار اور مراقبہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ جس کے لیے لگاتار محاسبہ اور اپڈیٹ کرنا

ضروری ہوتا ہے۔ ان میں موجودہ عقائید، عادات اور رسومات کا قرآن وسنت کے دائمی اصولوں سے مقابلہ کر کے ٹھیک کرنا شامل ہونا چاہئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ سو سال یعنی دو یا تین نسلوں کے بعد مجتہد بھیجتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ مجتہد صرف دینی معاملات میں ہی ہو بلکہ زندگی کے کسی شعبے اور علم کی شاخ کے لیے ہو سکتا ہے۔ جیسے ہندوستان میں سر سید احمد خان کو مسلمانوں کو دنیاوی تعلیم کی ضرورت کے احساس دلانے اور مائل اور قائل کرنے کی سمجھ دے کر بھیجا گیا تھا۔ علامہ اقبال کو دل شکستہ اور مردہ مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے شاعری دے کر کے بھیجا۔ سیاسی فیلڈ میں رہنمائی کے لیے قائداعظم کو بھیجا۔

اس سے ہمیں یہ بھی یقین کر لینا چاہیے کہ ہر دو تین نسل کے بعد ہمیں پھر سے دین اور دنیا دونوں کے سسٹم، رسوم، عادات اور قوانین کو دوبارہ چیک کر کے، اصلاح اور اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ دنیاوی معاملات میں بھی گھر، دفتر، کمپنی اور کام کی عادات کو بھی وقفے وقفے سے تجزیہ کر کے بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ کام میں بھی چپکے سے بری عادات آ شامل ہو جاتی ہیں۔ سوشل رسوم میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ان معاملات میں بھی لگاتار نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ گھر میں بچوں کی عادت پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے۔ باہر سے غلط عادت سیکھنے کا چانس ہوتا ہے ان کو ساتھ ساتھ ٹھیک کرتے رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

فطرت یا دنیا کا قانون بھی یہی ہے کہ ہر چیز بتدریج بدلتی رہتی ہے۔ ہم یا تو ترقی کر رہے ہوتے ہیں یا پھر زوال پذیر ہو رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں میں سے ایک نہ ایک چیز کرنی ہوتی ہے۔ ہم ایک جگہ پر زیادہ دیر تک ساکن نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہمیں شعوری طور پر ہر روز ترقی کرنے کی عادت کو اپنانا چاہئے۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے اک زمانے میں
اقبال

نبی کریم ﷺ نے توان تھک، لگاتار محنت سے ۲۳ سال میں اسلامی سلطنت

قائم کردی تھی۔ انہی کے نقش قدم پر چلتے قائداعظم، ان کے رفقاء اور ہمارے بزرگوں نے شدید مخالفت کے باوجود پاکستان بنا دیا تھا۔ ہم نے بھی ایوب خان کے دور حکومت میں ترقی کرنی شروع کی تھی مگر نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے برعکس، جلد ہی اپنی فطرت کے مطابق سوچ غلط ہوگئی اور اب ہر روز پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔ اب بھی سیاسی اور مذہبی لیڈرشپ اور عوام کو حقیقت پسند بننا ہوگا اور مل کر اس سنت پر عمل کرنا ہوگا اور ہر فرد کو بھی لگاتار ترقی کا سوچنا ہوگا تا کہ پاکستان ایک حقیقی معاشی، سیاسی، فوجی طاقت بن جائے۔ اور دنیا کی قوموں میں عزت کا قام حاصل کرلے۔

سبق:

اس زندگی کا اصول ہی یہ ہے "Survival of the Fittest" سب سے بہتر اور طاقتور ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ تبھی ممالک، یا مذاہب کا، یا ذاتی یا خاندانی لیول پر غلبہ رہ سکتا ہے۔ اس لیے ہم کو ہر لحاظ سے، ہر فیلڈ میں دوسروں سے طاقتور ہونے کے لیے لگاتار ترقی کرتے رہنا ہوگا۔ اپنے آپ کی ذاتی اور قومی لیول پر ترقی کو چیک کرنے کے لیے لگاتار خود احتسابی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ذاتی خود احتسابی رات کو سونے سے پہلے کریں کہ آج کیا غلطی کی تھی اور اس سے کیا سیکھا تھا یا کیا اچھی بات کی تھی تا کہ دل بڑھے کہ اچھی پراگرس ہو رہی ہے۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے ہر زمانے میں اپنے عمل کا حساب

اس اسوۃ حسنہ پر عمل بھی تھوڑا مشکل ہوگا۔ اگر آپ کسی اصول اور پروگرام سے چلنے کی کوشش کریں گے تو دوسرے ایڈجسٹ نہیں کریں گے بلکہ آپ کو واپس لانے کی کوشش کریں گے۔ مگر اپنے پروگرام میں استقامت رکھیں تو دوسرے مجبوراً ایڈجسٹ کرلیں گے۔ سیاسی اور مذہبی لیڈرشپ کو اپنے ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر اجتماعی سوچ کو ڈویلپ کرنا ہوگا۔ تبھی ہم لگاتار ترقی سے طاقتور بن سکیں گے۔

۱۷۔عملیت پسندی یا پریکٹیکل ہونا بھی آپؐ کی سنت ہے

صلح جوئی بھی سنت ہے۔اجتماعی مفاد میں لچک دکھانا بھی سنت ہے۔

''خلیفہ یا حکمران کو وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگ حکمران کی اطاعت پر راضی ہو جائیں۔ یہ اطاعت رضا کارانہ ہونی چاہیے۔ جبری اطاعت کے ذریعے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔قریش کو سینکڑوں سال سے سرداری کا درجہ اور تجربہ حاصل تھا۔اس لیے عوامی سیادت آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی جو قریش سے ہوتا......آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''الائمۃ من قریش'' کوئی ابدی حکم نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہو جائے وہاں اسی قوم کے کسی گروہ کو حاکم مقرر کیا جائے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عملیت یا pragmatism بھی رسول اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ انفرادی معاملے میں ایک شخص کو نظریاتی معیار سامنے رکھنا چاہیے مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا اس لیے ایسے معاملات میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلے کئے جائیں۔اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔'' (مولانا وحید الدین خان؛ مطالعہ سیرت۔ص ۸۹)

کمزور ہونے کے باوجود ہم سب ممالک کو چیلنج کرتے رہتے ہیں۔جبکہ نبی کریم ﷺ نے مکہ میں کمزور ہونے کی وجہ سے کسی سے لڑائی مول نہیں لی تھی۔حدیبیہ کا

دس سال جنگ نہ کرنے کا معاہدہ لانگ ٹرم پلاننگ، اور عملیت پسندی کی بہترین مثال ہے۔ جب معاہدہ لکھتے یہ لکھا گیا کہ یہ معاہدہ محمد الرسول اللہ اور قریش کے درمیان ہے، اور مکہ والوں نے یہ اعتراض کیا کہ محمد رسول اللہ نہیں لکھا جانا چاہیئے تو حضور ﷺ فوراً مان گئے اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ میں ہوں۔ مگر جو نہیں مانتے ان کیلئے نہیں ہوں۔ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ محمد بن عبداللہ بھی ہوں۔ تو یہ لکھ دینے سے بات تو وہی رہتی ہے۔ کہ معاہدہ میرے اور مکہ والوں کے درمیان ہوا ہے۔۔ یہ عملیت پسندی یا پریکٹیکل ہونے کی بہترین مثال ہے۔

قائداعظم کو بھی اللہ نے سچ بولنے والا اور مومن والا ذہن دیا ہوا تھا۔ ایک بار ایک جلسے میں انہوں نے تقریر کے دوران کہا کہ ''مسٹر گاندھی نے مجھے یہ کہا'' تو جلسہ میں موجود ہندوؤں نے شور مچا دیا کہ مسٹر گاندھی نہیں بلکہ مہاتما گاندھی کہیں۔ اس پر قائد نے، نبی کریم ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے، کچھ لمحے انتظار کے بعد کہا کہ ''وہ مہاتما تمہارے لیے ہے اور میرے لیے صرف مسٹر گاندھی ہے اور میں مسٹر گاندھی کیلئے کوئی غیر پارلیمنٹری الفاظ استعمال نہیں کر رہا۔ میں اسے مسٹر گاندھی ہی کہتا رہوں گا۔'' کیونکہ انہوں نے اصول کی بات کی تھی اور جو سچ پر مبنی تھی، اس لیے ہندو چپ ہو گئے۔ اس بات کو ایشو نہیں بنایا۔

قائداعظم انگلینڈ میں نماز پڑھنے گئے تو لوگوں نے پہلی صف میں جگہ خالی کر دی۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ اس جگہ بیٹھنا پہلے آنے والوں کا حق ہے۔ یہ اصول پسندی کی بات تھی۔ نبی کریم ﷺ کی عملیت پسندی اور اصول پسندی کی سنت پر عمل ہی تھا جس سے ہی قائداعظم پر مسلمانوں کو مکمل یقین تھا کہ وہ ان کے مفادات پر کسی بھی قیمت پر دشمن سے سمجھوتہ نہیں کریں گے۔

کیا ہمارے تمام لیڈروں اور ہم عوام کی غیر حقیقت پسندانہ سوچ اور رویئے اور بے اصولی ہی ہمارے زیادہ تر سوشل مسائل کی وجہ نہیں ہے۔؟ بے اصولی اور پاگل پنے

کی مثال دیکھیں کہ ہم غریب ملک ہیں مگر قرضہ لے کر عیاشی کر رہے ہیں مگر اپنی اوقات میں رہ کر زندگی نہیں گزارنی۔ کیا یہ حقیقت پسندی ہے؟

ہم عوام بھی اپنی ذاتی حیثیت سے بڑھ کر رہ رہے ہیں اور گزارا نہ ہونے کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ رشوت اور کرپشن شروع ہی ذرائع سے زیادہ خرچ کرنے کی عادت کی وجہ سے ہوتی ہے

حقیقت یا عملیت پسندی، دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے اور قومی عزت نفس کی حفاظت کی اصول پسندی کی ایک بہترین مثال چین کی ہے۔ آزاد ہونے کے بعد ان کے پاس شوگر امپورٹ کرنے کے لیے فارن ایکسچینج نہیں تھا تو تمام آبادی نے شوگر کھانی بند کر دی۔

آزاد ہونے کے بعد بھی ہم میں حقیقت پسندی نہیں آسکی کہ معاشی قوت بنے بغیر طاقتور بننا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم میں ترقی کرنے اور طاقتور بننے کا خیال اور جذبہ پیدا نہیں ہوسکا اور نہ ہی اپنے وسائل میں رہنے اور قربانی دینے کی سوچ پیدا ہوسکی۔ اور **"یہ صدی ہماری ہے"** کا جذباتی نعرہ لگانے کے باوجود ہم نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ معاشی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے طاقتور بنے بغیر یہ ممکن نہیں۔

ہمارے برعکس جاپان کی مثال دیکھیں۔ اگرچہ امریکہ جاپان کا دشمن تھا اور اس نے ان کے ملک پر ایٹم بم گرایا تھا مگر جاپان میں کسی جگہ بھی امریکہ کے خلاف نعرہ بازی بازی دیکھنے میں نہیں آئی، جیسے ہمارے یہاں، امریکہ مردہ باد، یا ایران میں مرگ بر امریکہ، کے نعرہ لگتے ہیں۔ ایسے کیوں ہے،؟ ایک جاپانی نے پوچھنے پر کہا کہ نعرہ بازی کمزور لوگ کرتے ہیں، جو عملا کچھ نہیں کر سکتے یا انتقام لینے کی نیت نہیں رکھتے۔ آج امریکہ کے صدر کے دفتر میں پیناسینک کی ٹیلیوژن اور سونی کا ٹیلیفون ہے جو ہماری ان پر برتری کی مثال ہے۔ اور اب امریکہ جاپان کا مقروض ہے۔ یہی ہمارا انتقام لینے کا طریقہ ہے۔

اگر جاپان کا طرز عمل بے مثال ہے۔ ردعمل ظاہر نہ کرنا بلکہ ارادوں کو خفیہ رکھ کر

دشمن سے دوستی لگا لینا، سٹیٹس کو status quo کو مان لینا کہ ہم شکست خوردہ اور کمزور ہیں اور تیاری کے لیے وقت کے حصول کے لیے صلح حدیبیہ کی طرز پر، جنگ نہ کرنے اور اپنے آپ کو مسلح نہ کرنے کا معاہدہ کر لینا، لانگ ٹرم ترقی کا پروگرام بنا لینا۔ دشمن سے تعلقات بحال کر کے اسی سے مالی مدد لے لینا وغیرہ۔ یہ حقیقت پسند اور بالغ نظر قوم کی نشانی ہے۔ کیا یہ نبی کریم ﷺ کے اسوہ کے مختلف پہلوؤں پر عمل نظر نہیں لگتا۔؟

سبق:

جب تک زندگی کسی اصول کے مطابق نہ گزاری جائے تو امن، سکون، اور ترقی نہیں ہو سکتی۔ امن کے لیے دوسروں کے ساتھ معاملات میں برداشت، عملیت پسندی، صلح جوئی ضروری ہے۔ ہم جب یہ کریں گے تو سنت پر عمل کر رہے ہونگے۔ آپ کا ہی فرمان ہے کہ جو غلطی پر ہونے کی وجہ سے بحث نہ کرے اس کا گھر جنت کے کنارے پر ہوگا۔ جو صحیح ہونے کے باوجود بحث نہ کرے اس کا گھر جنت کے درمیان ہوگا اور جو اپنا کرکٹر بہتر بنائے اس کا گھر جنت میں بلندی پر ہوگا۔ ترمذی

آمدنی سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہئے، یہ مالی اور معاشی اصول ہے مگر ہم اس اصول کے خلاف کر رہے ہیں۔ ناک نہ کٹ جائے اس کی فکر رہتی ہے چاہے بعد میں کتنی مشکلات میں نہ گھر جائیں۔ اگر سچ اور اصول پرستی پر جائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم غریب ہیں یہ afford نہیں کر سکتے۔ مسلمان کا کام ہی حقیقت پسند بننا ہے کیونکہ اسے سچ پر عمل کا حکم ہے۔ جو اللہ کو دل سے مانے تو وہ پھر اصول پرست بن جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا اور نہ ڈرتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہمیں اللہ پر بھروسہ کرنا سیکھنا ہوگا تب لیڈرشپ کر سکیں گے۔ ہمارے لیے ان سنتوں پر عمل بہت مشکل ہے۔ ہم ہر وقت دوسروں سے مقابلے کی ذہنی حالت میں رہتے ہیں۔ اس لیے صلح جوئی آ ہی نہیں سکتی اور نہ ہی برداشت۔ چھوٹی سے بات پر جھگڑ پڑتے ہیں۔ امن کی خواہش ہی نہیں رہی۔

☆......☆......☆

۱۸۔ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو کسی کام یا مقصد کے لیے پیدا کرتا ہے پھر اس کے مطابق اسے تیار کرتا ہے

اللہ پاک قرآن مجید میں فرماتے ہیں: **"جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے یاد کرتے ہیں اور غور کرتے ہیں کائنات کی پیدائش میں اور کہتے ہیں کہ اللہ یہ سب کچھ تُو نے بغیر مقصد کے تو نہیں بنایا"** (3-191)

اس آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک بھی معاشرے میں بغیر کسی مقصد کے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ کسی خاص کام، رول، فرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کا شوق بھی اس کے دل میں پیدا کیا جاتا ہے کہ میں نے یہ بننا ہے۔ کوئی پائلٹ بنتا ہے کوئی ٹیچر، کوئی فوجی، کوئی ڈاکٹر یا استاد یا پروفیسر، کسان، صنعت کار۔ اس لیے ہر ایک سوسائٹی کے لیے اہم فرد ہوتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک اپنی زندگی پر غور کرے تو یہی نتیجہ نکالے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے ہی یہ کیا جاتا ہے تو سو فیصد درست فرمایا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ہر آدمی کو جس مقصد کے لیے پیدا کرتا ہے تو پھر اس کے لیے اسے تیار کرنے کے لیے اسے انہی مراحل سے گزارتا ہے۔ جیسے قائداعظم کا رول انڈیا کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی جنگ میں لیڈر کا تھا۔ اس لیے انگریزوں کے طور طریقے، طرزِ حکومت، کردار کی سمجھ دینے کے لیے بچپن سے انگلینڈ بھیجا گیا تاکہ وہ پھر ان کے ساتھ آزادی کی جنگ ان کے ہی کلچر اور اصولوں کے مطابق لڑ سکیں اور ان کو مات بھی دے سکیں۔ یہ جنگ کوئی مذہبی آدمی نہیں جیت سکتا تھا۔ اسی لیے ان میں سے کوئی آدمی پاکستان موومنٹ کی سیاسی رہنمائی کے لیے چنا نہیں گیا تھا۔

ہر معاشرے میں بادشاہ سے لے کر ایک عام آدمی معاشرے کو چلانے میں اپنی اپنی جگہ اہم کل پرزے ہوتے ہیں۔ عام آدمی بادشاہ کی لیڈرشپ کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جبکہ عام آدمی کے ٹیکس کی رقم کے بغیر بادشاہ سسٹم نہیں چلا سکتا۔ دونوں اہم ہیں۔ صفائی والا ایک ہفتہ نہ آئے تو محلے میں گندگی پھیل جاتی ہے۔ بجلی چلی جائے تو تب پتہ چلتا ہے کہ لائین مین کتنا اہم بندہ ہے۔

مغربی دنیا نے یہ کر کے دکھا دیا ہے کہ ملک کا ہر شخص اہم ہے۔ اور برابر کا انسان ہے صرف اللہ نے اس کے ذمے معاشرہ چلانے کے لیے خاص رول دیا ہے۔ امریکہ ٹرینگ کے دوران دیکھا کہ صفائی والا صفائی کر رہا ہوتا تو تمام آفیسر کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کو گڈ مارننگ مسٹر جانسن کیسے ہو، کہتے تھے۔ وزیر اعظم جب چھٹی پر جاتا ہے تو وہ اس وقت عام آدمی کی طرح ہی بازار جاتا ہے شاپنگ کرتا ہے۔ ہوٹل کھانا لینے لائین میں لگتا ہے۔

صحابہ کرام نے بھی یہی کر کے دکھایا تھا۔ آج ہم مسلمانوں کو ان باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی کہ کوئی پیشہ، کام نیچ نہیں ہے۔ سب پیشے اہم اور عزت والے ہیں اور سمجھے جانے چاہئیں۔ میرے خیال میں ہر ایک کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ دریافت کرنا ہے کہ میں کیوں پیدا کیا گیا ہوں۔ دوسرا یہ کام کہ جو بھی ہوں، اس میں بہترین کام کروں اور خوش رہوں اور اللہ کا شکر ادا کروں۔ اور آخرت میں اس کی خوشنودی لے سکوں

سبق:

ہم میں سے جو بھی رزق کمانے کے لیے جو بھی پیشہ اختیار کرے اس میں اسے بہترین مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ پیشے کے علم میں بھی اپنے تجربے سے اضافہ بھی کرے۔ تبھی زندگی کا مقصد پورا ہوگا۔ اور اسے اپنے پیشے پر فخر بھی ہونا چاہیئے۔ کم تری کا احساس نہیں ہونا چاہیئے۔

میرے خیال میں سب سے اہم رول عورتوں کا ہے۔ اور ہر لڑکی کو ماں بننے

کے عظیم رول کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیئے۔ ان کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے اگلی نسلوں کی تعلیم، تربیت، آداب، کردار کی تربیت، اسلامی کلچر، تہذیب، رسوم کی حفاظت کا فرض سونپا ہے۔ اس کے بدلے ہی ان کے پاؤں کے نیچے جنت ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات کے تحت آج کی ماں یہ فرض بھولتی جا رہی ہے۔ اور گھر سے باہر کی دنیا میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔

ہمارے رہنماء، اسوۂ حسنہ کی لیڈرشپ کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔ ہم عوام بھی اللہ کا نائب بن کر رہنے کی بجائے مرضی کرنے پر تل گئے ہیں۔ یہ کتاب ہم سب کی یاددہانی کے لیے ہے۔ کہ ہم کون ہیں، ہمارا کیا رول ہے۔ جس کی جواب دہی ہو گی۔ اور ہم نے اپنی قوم کی ترقی میں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ ہم نے طاقتور بن کر اپنا اور بچوں کا مستقبل محفوظ بنانا ہے۔

☆......☆......☆

۱۹۔زندگی کے رول کو پوری ذمہ داری اور خلوص سے ادا کرنا بھی سنت ہے اور اچھی ادائیگی پر نبی کریم ﷺ کا یہ کہنا کہ ''یا اللہ گواہ رہنا کہ میں نے پیغام پہنچا دیا ہے۔'' بھی سنت ہے

یہ باب پچھلے باب ہی کی تصدیق اور تشریح کے لیے لکھا گیا ہے۔

ہر ایک اس بات، رول یا ڈیوٹی کے کرنے کے لیے ذمہ دار اور جواب دہ ہوتا ہے جو اس کے حوالے کی جاتی ہے۔اور یہ پیشے سے منسلک ہوتی ہے۔ نبوت، لیڈری، رہنمائی بھی پیشہ اور ذمہ داری بن جاتی ہے۔اسی کی جواب دہی ہوگی۔

''آپ ﷺ کہہ دیں کہ ''اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسول کا حکم مانو۔اگر تم نہیں مانتے تو رسول تو صرف اس ڈیوٹی کے لیے ذمہ دار ہے جو اس کے حوالے کی گئی ہے۔اور تم اس کے لیے جس کے لیے تم ذمہ دار بنائے گئے ہو۔اگر تم اس کی بات مانو گے تو تم سیدھے راستے پر ہو گے۔رسول کا فرض اور ڈیوٹی تو صرف پیغام کا صاف صاف پہنچا دینا ہے۔''(سورہ نور۔24،آیت نمبر 54)

خطبہ حجۃ الوداع: خطبہ کے آخر پر آپؐ نے فرمایا:۔

''لوگو! تم سے میرے بارے میں (خدا کے ہاں) سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے'لوگوں نے جواب دیا'' ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپؐ نے امانت (دین) پہنچا دی اور آپؐ نے حق رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔'' یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: "خدا گواہ رہنا، خدا گواہ رہنا، خدا گواہ رہنا۔" (انسان کامل ڈاکٹر خالد علوی)

اوپر کی آیت اور حجۃ الوداع سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ پوائنٹ آئے ہیں۔

یہی اس دنیاوی زندگی کا بھی اصول ہے، چاہے گھر ہو، سکول، دفتر یا فیکٹری۔ ہر انسان کو کوئی نہ کوئی رول ادا کرنا ہوتا ہے اور ہر ایک کو جو فرض سونپا جائے تو اسے یہ ڈیوٹی دل سے مان کر اچھی طرح کرنے، یا نہ کرنے، یا بے دلی سے کرنے کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور اس کے مطابق ہی اسے انعام یا سزا ملتی ہے۔ آخرت میں بھی یہی ہو گا۔

قائداعظم نے بھی، خطبہ کے آخری الفاظ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے، نبی کریم ﷺ کی ہی طرح، یہی کہا تھا کہ "میں اس لیے محنت کر رہا ہوں کہ قیامت کے دن اللہ سے یہ سن سکوں کہ "Well Done Jinnah." ۔کیا یہ ثبوت نہیں کہ قائد ہر بات میں اسوۂ حسنہ کی نقل کرتے تھے۔؟ جنید جمشید نے بھی یہی کہا تھا کہ **"میں اللہ سے یہی سننا چاہتا ہوں کہ شاباش جنید۔"**

اب یہ ہم سب کا کام ہے کہ آیا ہم رسول کریم ﷺ کی طرح اپنے آپ میں یہ احساسِ ذمہ داری پیدا کر لیتے ہیں کہ نہیں، کہ جو کوئی کام، مقصد اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ہمارے ذمے لگایا ہے یعنی زندگی میں جس پیشے سے منسلک ہو کر ملک، قوم اور معاشرے کی خدمت کر رہا ہے وہ اس کو پوری نیک نیتی، توجہ، دیانتداری، محنت سے کر رہا ہے تاکہ وہ اللہ کے سامنے جا کر کہہ سکے کہ "یا اللہ جن انسانوں سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ جن میں میں نے رول ادا کرنا تھا ان سے پوچھ لے کہ میں نے پوری ذمہ داری سے کام کیا ہے۔"

Work honestly and sincerely and be faithfuk and loyal to pakistan ,I can assure you that there is nothing greater in this world than your own conscience and when you appear before God, you can say that you

performed your duty with the highest sense of integrity, honesty and with loyalty and faithfulness”.
Muhammad Ali Jinnah- Quaid-e-Azam

سبق:

ہر آدمی کو ذاتی اور نیشنل لائف میں جو پیشہ، رول ملا ہو، اسے پوری ذمہ داری سے اس مقصد کے تحت سرانجام دینا چاہیے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ اسے آخرت میں کہہ سکیں۔ شاباش میرے بندے شاباش۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا انعام ہوسکتا ہے۔

دنیا میں انعام یا تمغے ملنے کی امید کی جگہ اللہ سے یہ سننے کی تمنا اور امید رکھنا تب ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری سوچوں کا محور ہو۔ اور اللہ تعالیٰ سے شاباش کا لفظ سننے کی تمنا ہو اور نیت بھی ہو یا پھر یہ تب ہوتا ہے کہ ملک اور قوم سوچ اور عمل کا مرکز بنے۔

ہر ماں اور باپ کو چاہیے کہ وہ بچوں کی دینی اور دنیاوی، کردار سازی، تعلیم اور تربیت اس احسن طریقے سے اور اس مقصد سے کرے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ سے شاباش سن سکیں۔

اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ بات صحیح سوچ کی ہے۔ ہر ایک کی اپنی چوائس ہے۔ کہ اللہ سے شاباش سننا چاہتا ہے یا کہ نہیں۔

☆......☆......☆

۲۰۔ جفا کشی سنت ہے۔

ہمیں بچوں کو محنت والی عادات ڈالنی چاہئیں۔ چاہے والدین کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں

''اہل مکہ کے صاحبِ حیثیت و استطاعت لوگ اپنے بچوں کی رضاعت صحرائی ماحول میں کراتے تھے۔ تاکہ وہ خالص عربی سیکھ کر فصیح البیان ہوں اور اِن کی جسمانی و قلبی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہوں۔ فطرت کے دلدادہ، حقیقت پسند بن جائیں۔'' (پیغمبرِ اعظم و آخر 183)

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عربوں کو پتہ تھا کہ پیدائش سے بچپن کے پانچ چھ سال بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی قائل ہو کر پہلے پانچ چھ سال میں تربیت پر پوری توجہ دیں جیسے کہ مغربی ممالک جاپان وغیرہ ترقی یافتہ ملک دیتے ہیں۔

''دراصل یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ یتیم بچے عقلی اور شعوری طور پر عام بچوں سے کہیں پہلے تکمیل کے مراحل طے کر لیتے ہیں کیونکہ انہیں پیار اور لاڈ پیار کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی ان کے چہرے سے غم کا غبار دھونے کی کوشش کرتا ہے۔'' (کتاب۔ عکس سیرت: کونسٹن ویرژیل، ص ۱۵)

''وہ بچہ جس کا باپ ہو، نہ ماں، اور جو آٹھ سال کی عمر میں محنت اور مزدوری کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیتا ہے کہ اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے پر بھروسہ نہ کرے اور اپنی مشکلات کا حل خود ہی تلاش کرے۔'' (ص ۱۵)

''آپ ﷺ کے عہد طفولیت میں تحقیق کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قابلیت اور استعداد کہ جس کی بنا پر وہ طفل یتیم، اللہ کی طرف سے پیغمبری کے لیے چنا گیا تھا، بچپن ہی سے اس میں موجود تھی۔ اور اسی زمانے سے جب آپ جزیرۃ العرب کے گرم صحراؤں میں گلہ چرانے جاتے تھے تو ان کی یہ عادت بن چکی تھی کہ اپنے آپ میں کھو کر سوچوں میں ڈوب جائیں۔ اور صحرا غور وفکر کرنے اور اپنے آپ میں ڈوب جانے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ اسی لیے دنیا کے قدیم اور عظیم مذاہب تپتے صحراؤں سے ظہور پذیر ہوئے کہ ان ادیان کے لانے والوں کو یہ صلاحیت حاصل تھی کہ وہ لامتناہی صحراؤں میں اللہ، اس کی خلقت اور بشریت کے بارے میں غور و خوض کر سکیں۔'' (ص ۱۴)

تاریخ عالم میں صرف انہی قوموں نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں جو جسمانی، قلبی لحاظ سے مضبوط تھے۔ اسی لیے تاریخ میں چینی، منگول، ترک، عرب، ایرانی، رومی یا یورپین، مصری مشہور ہیں۔ اور یہ تمام قومیں جسمانی، قلبی۔ علمی لحاظ سے اپنے اپنے زمانے میں بڑھی ہوئی تھیں۔ آج کل اہل یورپ یا مغربی دنیا کا ہر جگہ بول بولا ہے۔ چین نیا نیا پھر سے شامل ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی کب باری آتی ہے یہ اللہ کی مشیت پر ہے مگر اس کے لیے بھی اس کا اصول مقرر ہے: **''اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی قلبی حالت نہ بدلیں۔''** (سورہ رعد۔ ۱۱)

مغربی ممالک میں عورتیں اور مرد یکساں طور پر جسمانی کھیلوں، ورزشوں میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ برف میں بھی وہ ایسے کھیل ایجاد کر لیتے ہیں جو اُن کو مشغول اور صحت مند رکھے۔ محنت اور جفاکشی رضا کارانہ اختیار کرتے ہیں۔ گھر کے اندر رہنے کی بجائے وہ باہر کھلے میدان میں کھیلنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اِن کے برعکس شہروں کے مسلمان مرد بھی ورزش کے قریب نہیں جاتے۔ نہ ہی جسمانی صحت، محنت و جفاکشی پیدا کرنے کے لیے وہ اپنے معاشرے میں کھیل کی جگہیں

رکھتے ہیں۔ نہ ہی سیر گاہیں یا پارک، محنت اور جفاکشی کو وہ اہمیت ہی نہیں دیتے۔ اِسی لیے آرام پسندی ہی ان کی نارمل زندگی کی عادت بن گئی ہے۔عورتوں کا ورزش کرنا ہمارے کلچر کا حصہ ہی نہیں ہے۔ ہندو عورتیں ہمیشہ یوگا کی ورزشیں کرنے سے جسمانی لحاظ سے فٹ ہوتی ہیں۔

مغربی ممالک میں مساوات کی وجہ سے، امیر اپنے بچوں کو عام بچوں کی طرح پرورش کرتے ہیں۔ لاڈ پیار سے خراب نہیں کرتے۔ عام سکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ سکول بس میں جاتے ہیں۔ دوسرے گریڈ میں ہی بچوں کو ایک دن کے لیے کسی گاؤں میں لے جاتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ انسان صدیوں سے کھیتی باڑی کر کے کیسے رہتا رہا ہے۔گرمیوں میں کیمپنگ پر لے جاتے ہیں جہاں بجلی نہیں ہوتی۔ جیسے پرانے زمانے میں لوگ رہتے تھے، تا کہ بچوں کو پتہ لگے کہ اگر سہولیات میسر نہ ہوں تو کیسے رہنا ہے بلکہ یہ احساس دلانا کہ یہی اصل زندگی ہے جو لوگ صدیوں سے گزارتے رہے ہیں۔ صنعتی زندگی تو صرف تین چار سو سال پرانی ہے۔آپ ٹی وی پر دیکھ لیں کہ دنیا میں ایڈونچر کے کام صرف گورے مرد اور عورتیں ہی کرتے ہیں باقی قومیں نہیں کرتیں۔عربوں کو بھی اس زمانے میں فتوحات میں ان کے بڑھنے کو ٹیکنالوجی نہ ہونے سے سمندروں نے روکا تھا، یا افریقہ میں گھنے جنگلوں نے ورنہ سارا افریقہ مسلمان ہو چکا ہوتا۔انہوں نے ایشیاء کے برفانی سنٹرل ایشین سٹیٹس کو بھی فتح کر لیا تھا۔

سبق:

ہمیں حضور اکرم ﷺ کی زندگی سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہر لڑکی اور لڑکے کو بچپن سے ہی محنت کرنے، جسمانی صحت، ورزش، جسمانی کاموں میں حصہ لینا چاہیے، سوچ سمجھ کر فیصلے کرنا سکھانا چاہیے۔ کیونکہ بڑے ہو کر زندگی کی جنگ ہر ایک نے خود لڑنی ہوتی ہے۔ مستقبل میں کیسے حالات بنتے ہیں، کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔لڑکیوں کو خصوصاً تعلیم دے کر، ہنر سکھا کر یا پروفیشنل ایجوکیشن دینا ضروری ہو گیا ہے۔

والدین بچوں کو بچپن سے ہی حکمت یعنی سوچ پر مبنی اپنے فیصلے کرنے اور ذمہ داری اٹھانے کی تعلیم اور تربیت سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں دے سکتے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی حکمت ملنے کو سب سے بہتر دولت ملنا قرار دیا ہے

ہمیں اس دنیا میں اگر اسلام کے علمی،نظریاتی اور سیاسی غلبہ کو دوبارہ دیکھنا ہے تو پھر ہمیں دنیا کی ہر قوم سے دنیا کے ہر فیلڈ میں برتری حاصل کرنی ہوگی اور خاص کر،کردار میں اعلیٰ ترین بننا ہوگا۔

اس سنت پر عمل کی عادت ڈالنے کے لیے قومی سوچ اور مقاصد اور پالیسی کی ضرورت پڑے گی۔جس کے لیے پہلے لیڈرشپ لیول پر سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔مگر ذاتی لیول پر بھی سوچ اپنائی جاسکتی ہے۔

اب تک میں نے چند کامن نظریاتی سوشل سنتوں کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد ذاتی،اور اجتماعی سنتیں بیان کی جائیں گی۔

پہلے میں صرف چند ذاتی کردار کی سنتوں کو زیر بحث لاؤں گا۔

☆......☆......☆

۲۱۔ سچ......سب سے اہم سوشل سنت

صفات نبوی ﷺ سے شروع کرنا ہی برکت کا باعث ہوگا۔ بلکہ یہ حق بھی بنتا ہے کہ ان دو صفات نبوی ﷺ کو سرفہرست رکھا جائے۔ جو کہ نبوت سے پہلے ان کی وجہ شہرت بھی تھیں۔ اور ان میں سے ایک پر انہوں نے اپنی نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کر کے سب کو نہ صرف قائل بلکہ لاجواب بھی قرار دیا تھا۔

''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ حضرات بہت ہی اچھے رفیق ہیں۔''

(سورہ نساء آیت 8)

صدیقین انبیاء کے بعد انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

''تم سچائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے اور آدمی جب ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچائی کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ مقام صدیقیت تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کے یہاں صدیقین میں لکھ لیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور بدکاری اس کو دوزخ تک پہنچا جاتی ہے۔ اور آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور جھوٹ کو اختیار کر لیتا ہے تو انجام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں کذابین میں لکھ لیا جاتا ہے۔'' (صحیح بخاری مسلم۔ص409)

حضور علیہ وسلم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت اسی وقت تک سرسبز رہے گی جب تک یہ تین خصلتیں اس میں باقی رہیں گی۔ **ایک** تو یہ کہ جب وہ بات کریں تو سچ بولیں۔ **دوسرے** یہ کہ جب وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں تو انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ **تیسرے** یہ کہ جب ان سے رحم کی درخواست کی جائے تو وہ کمزوروں پر رحم کریں۔ (متفق علیہ۔ ابی یعلی۔ ص 408)۔

> حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''مسلمانو! اگر تم چھ باتوں کا ذمہ کر لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ دار ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تم بولو تو سچ بولو۔ دوسرے یہ کہ جب تم وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو۔ تیسرے یہ کہ جب تمہارے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت نہ کرو۔ چوتھے یہ کہ تم اپنی نظریں نیچی رکھا کرو۔ پانچویں یہ کہ ظلم کرنے سے ہاتھ روکے رکھو۔ چھٹے یہ کہ اپنے نفسانی جذبات کی باگ ڈھیلی نہ ہونے دو۔ (مسند احمد۔ حاکم۔ ص 408)

تمام انسانی تعلقات کی بنیاد اور کردار اور اخلاق کی بنیاد سچ بولنا ہے۔ سچ کو تسلیم کرنا ہے۔ سچ کو برداشت کرنا ہے۔ اسی پر باہمی اعتماد و یقین قائم رہ سکتا ہے جو کہ تعلقات کی بنیاد ہوتا ہے۔ سچ سے ہی انسانی مساوات کی سمجھ آسکتی ہے۔ انصاف بھی سچ پر مبنی گواہی پر منحصر ہے۔ وعدہ نبھانا بھی دراصل سچ ہی کی extension ہے۔ امانت دار ہونا بھی سچ کی وجہ سے ممکن ہے۔ سچ ہی کی بنیاد پر ہی امن قائم ہوسکتا ہے۔ تعلقات بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔ غلطی مان لینا بھی سچ بولنے پر ہی منحصر ہے۔ غرضیکہ اخلاقیات کی بنیاد صرف سچ بولنا ہے۔ تجارت کی بنیاد سچ پر ہو تو ہی ترقی ممکن ہے۔ کوئی قوم سچ کی عادت کے بغیر نہ علم سیکھ سکتی ہے نہ امن قائم کرسکتی ہے نہ سکون سے رہ سکتی ہے۔ نہ سائنس اور ٹیکنالوجی سیکھ کر ترقی کرسکتی ہے۔

سچ کے مخالف جھوٹ ہے۔ جھوٹ بولنا دراصل اپنے خیالی مفادات کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے یا ممکنہ نقصانات سے بچنے کیلئے ہے۔ سچ کا انکار ہی کفر کہلاتا

ہے۔میں نہ مانوں والی بات ہوتی ہے۔جبکہ سچ کو چھپانا منافقت کہلاتا ہے۔

تمام علوم کی بنیاد، سائنسی تحقیقات کی بنیاد سچ اور حقیقت کی تلاش سے ہی ممکن بنی ہے۔ سچے نتائج سے ہی علم حاصل ہوتا ہے جو انسانی مفادات کیلئے استعمال ہوسکتا ہے۔علم کا معنی ہی حقیقت ہے۔

اللہ تعالیٰ صرف سچ بولنے والی قوم کو ہی علم عطا فرماتا ہے۔ جو شخص یا قوم اگر سچ بولنا اور قبول کرنا شروع کر دیں تو اللہ اس آدمی یا قوم کے لیے ہر علم اور روحانی ترقی کی راہیں کھول دیتا ہے۔کیونکہ علم نام ہی سچ اور حقیقت کا ہے۔ نئے آئیڈیاز بھی صرف سچے لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔

سچ کی ہمیشہ سے مخالفت کی جاتی رہی ہے اسی لیے مشہور ہے کہ:

Truth is First ridiculed, then vehemently opposed and finally accepted as truth

نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے آج بھی کسی کے ساتھ یہی ہوگا جو سچ کی تلاش کرلیگا۔اس لیے سچ بولنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے ہوتی ہے۔سچ کے لیے تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں بلکہ کئی دفعہ زہر کا پیالہ بھی پینا پڑتا ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں مغربی دنیا میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ Ultimate truth ہے۔یعنی اللہ کی موجودگی ہی اصل سچائی ہے۔جس کو ماننے کے بعد دوسری سچائیاں جنم لیتی ہیں۔ یا ان کا پتہ لگتا ہے۔جس میں رسالت دوسری سچائی ہے۔ کہ پروردگار نے انسانوں کی پیدائش کے بعد انہیں بغیر رہنمائی کے نہیں چھوڑا۔ بلکہ اپنے چنے ہوئے انسانوں کو اپنا پیغام دے کر بھیجا کہ وہ انسانوں کو بتائے کہ اللہ اس زمین پر گزارے ہوئے وقت میں کس قسم کی زندگی اور اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔

سچائی کا مطلب دل اور زبان کی ہم آہنگی اور اس بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔یعنی جو بات زبان پر آئے وہی دل میں بھی ہو۔اور وہ بات درست بھی ہو۔اگر ان دونوں شرطوں میں ایک بھی شرط نہ ہو تو پھر کہنے والا صدیق نہیں ہوسکتا یا

کہلا سکتا۔ صدیق اسی لیے اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی فطرت میں سچ بولنا ہو اور عادت کے طور پر بھی سچ بولتا ہو اور کوئی مصلحت اسے سچ بولنے سے روک نہ سکے۔

ہر انسان چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے ساتھ سچ بولیں تا کہ وہ اس پر اعتبار کر کے عمل کر سکے اور اسے کسی قسم کا مالی۔ جذباتی نقصان نہ پہنچے۔ اور اسی طرح سچ بولنے والے کی عزت بھی کرتا ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ کیونکہ سچ میں حسن کی تاثیر ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات میں یا کام میں سچائی ہو تو وہ اس صدیق کے لیے عزت کا باعث بن جاتی ہے اور اس کے کہنے پر وہ کام ہو جاتا ہے یا مان لیا جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں سچ کو آنچ نہیں۔

حضور اکرم ﷺ نبوت سے پہلے بھی ہمیشہ سچ بولنے کی وجہ سے صادق کہلاتے تھے۔ لوگ ان سے فیصلے بھی کرواتے تھے۔ اور آپؐ نے اپنی نبوت کے اعلان کا ثبوت اپنے سچ بولنے ہی کو بنایا کہ اب جو میں نبوت کا دعوی کر رہا ہوں تو یہ بھی سچ ہی ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا صادق ہونا ہی دلیل، مدد کرنے والا اور سفارشی بن گیا تھا اور لوگوں کے دلوں میں مقبول ہو گیا اور آپ کی نبوت قبول کرنے پر لگا تار مدد کرتا رہا۔

دنیا کے تمام انسانی تعلقات اور تجارتی کاروبار اعتماد پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور اعتبار سچ بولنے سے بنتا ہے۔ جہاں سچ کم بولا جاتا ہو وہاں ہر قدم پر نقصان ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے کہ قیمت صحیح نہ ہو، یا ناپ تول پورا نہ ہو، چیز دو نمبری نہ مل جائے۔ ہمارے یہاں ہر ایک نقصان اٹھا رہا ہے۔ عدالتوں میں جھوٹے مقدموں اور جھوٹی گواہیوں سے انصاف ملنا ناممکن بن گیا ہے۔ اور سچ ہی مسلمانوں میں غائب ہو گیا ہے۔ اور سچ بولنے کو کوئی پسند نہیں کرتا اور سچ بولنا اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنے کے مترادف بن گیا ہے۔

سچائی کا پریکٹیکل اثر آج کل مغربی سوسائٹی میں دیکھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے ان کے سسٹم کام کر رہے ہیں۔ قوانین بنانے اور ان پر عمل آسان ہوتا ہے اگر کوئی مدد مانگے تو فوراً مل جاتی ہے کیونکہ ہر ایک کو یقین ہوتا ہے کہ اسے واقعی مدد کی ضرورت ہے۔ تجارت ہو، یا حکومتی کاروبار، یا فرائض ہوں یا حقوق کی ادائیگی سب سچ پر مبنی ہونے

سے زندگی میں آسانی، خوبصورتی اور امن ہے۔

ملائشیاء کے مہاتیر محمد نے جب ترقی کی بنیاد رکھی تو سب سے پہلے زور دیا کہ گھروں، سکولوں دفتروں میں سچ بولنے کی عادت ڈالو کیونکہ یہی ترقی کی بنیاد ہے۔ اگر ہم نے بھی معاشرے کی اصلاح کرنی ہے، امن قائم کرنا ہے، آپس میں محبت، اتفاق سے رہنا ہے تو پھر سچ کو سب سے پہلے اپنانا ہوگا۔

ہم لوگوں کو جھوٹ کی ایسی عادت پڑی ہے کہ جہاں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ بھی ہو وہاں بھی بولتے ہیں جسے compulsive liars کہتے ہیں، اس لیے کوشش کریں کہ جہاں سچ بولا جا سکتا ہے وہاں بولنے کی عادت ڈالنا شروع کریں اس طرح سچ بولنے کی عادت پڑنے لگے گی۔

سبق:

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ سے سچ بولیں تو آپ بھی دوسروں سے سچ بولیں۔ اگر جنت جانے میں سنجیدہ serious ہیں تو سچ بولنے سے ہی ابتدا کرنی ہوگی۔ اگر درجات چاہتے ہیں تو بھی سچ بولنا ہوگا۔ اگر مسائل پر ریسرچ کر کے حل ڈھونڈنے ہیں تو سچی تحقیق و تفتیش سے شروع ہونا پڑے گا۔ اگر ترقی کرنی ہے تو سچ کا کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ اگر بگڑے تعلقات پھر سے استوار کرنے ہیں، تو سچ بولنا اور برداشت کرنا ہوگا۔ پاکستان میں اس اسوہ پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے پہلے اس جگہ سچ بولنے سے شروع کریں جس میں مشکل میں نہ پڑیں۔ بتدریج اسے بڑھاتے رہیں۔ ہمیں دین اور دنیا کے علوم، رسومات، کتابوں میں بھی پھر سے سچ تلاش کرنا ہوگا کیونکہ ان میں جذباتیت اور جھوٹ کی بہت ملاوٹ ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے اجتناب کرنا ہوگا۔ تبھی جہالت، غربت، محکومی، ذہنی غلامی سے نجات ملے گی۔ سچ بولنا ہمیں سوشل ضرورت کے تحت کرنا پڑے گا، جھوٹ سے نفرت کرنی ہوگی۔

☆......☆......☆

۲۲۔امانت اور دیانت

یہ بھی بہت ہی اہم سنت ہے۔ یہ سچ سے ہی جنم لے سکتی ہے ورنہ نہیں۔

TRUST WORTHINESS

ہمارے کلچر میں، بچپن سے ہی امانت یا دیانت کا تصور صرف مال کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔ کسی دوسرے کے پاس زیورات اور پیسے امانت رکھنے کی ہی مثال دی جاتی ہے دکان دار صحیح تول کر، بلا ملاوٹ اچھا سودا دے تو وہ ایمان دار کہلاتا ہے۔ اس لیے تھوڑی تفصیل بتانا ضروری بن جاتا ہے۔

کلامِ پاک: ''اللہ کا پیغام پہنچانے والے حضرت جبرائیل اور حضور اکرم ﷺ ہیں جو کہ امانت دار ہیں۔'' (یعنی اللہ کا پیغام ہو بہو پہنچاتے ہیں)(سورہ تکویر 81-19)

سورہ شعراء میں تمام پیغمبروں نے اپنی قوم کو یقین دلایا کہ وہ امانت دار ہیں:

(26-107) "I am a trustworthy Messenger to you."

یہ آیات امانت کے تصور کو بڑا وسیع کر کے بیان کرتی ہے۔ یعنی پیغام پہنچانے میں بھی امانت چاہیے ہوتی ہے، جو صرف سچ بولنے والا کر سکتا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بھی ہمیں خطبہ دیتے تو فرماتے ''جس میں ایمانداری نہیں اس میں ایمان نہیں۔ جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔''(مسند احمد: جلد ۳ ص ۱۳۵)

حدیث:۔ تین باتیں جس میں ہوں وہ منافق ہے اگر چہ وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور یہ دعوٰی کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ ایک یہ کہ جب بات

کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، امانت رکھائی جائے تو خیانت کرے۔ (یہ دراصل جھوٹ ہی کی مختلف شکلیں ہیں) (بخاری مسلم)

'عہدے بھی امانت ہیں' کیونکہ انہوں نے عوام کے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مجلس میں صحابہ کرام سے گفتگو کر رہے تھے کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے پوچھا، قیامت کب آئے گی؟ نبی کریم ﷺ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ بعض لوگوں نے کہا: اس اعرابی نے جو کہا ہے وہ آپ نے سن لیا ہے۔ لیکن آپ نے اس کی بات کو ناپسند فرمایا اور بعض نے کہا: آپ نے اس کی بات نہیں سنی۔ حتیٰ کہ جب آپ نے اپنی بات مکمل فرمالی تو فرمایا: قیامت کے متعلق سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اعرابی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا: جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ سائل نے پوچھا: امانت کیسے ضائع کی جائے گی؟ آپ نے فرمایا جب کوئی منصب نا اہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ (بخاری)

اس بات کو تفصیل سے بتانے کی ضرورت ہے۔ ہر دفتر میں سٹاف کا کام عوام کی خدمت ہوتا ہے جس کے لیے انہیں عوام کے ٹیکسوں سے ہی تنخواہ دی جاتی ہے تو اس طرح ان کا عہدہ ان کے پاس امانت ہوتا ہے کہ وہ عوام کی صحیح رہنمائی کر کے ان کے کام میں آسانی پیدا کریں گے اور ان کے حقوق جو اس دفتر نے دینے ہیں اس کی انفارمیشن بھی دیں گے اور بروقت ادا بھی کریں گے۔ چونکہ ہم آج کل روپے پیسے کے لالچ میں گرفتار ہیں، اس لیے ہمارے یہاں حقوق کی صحیح انفارمیشن کو چھپایا جاتا ہے اور کام کو مشکل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ بار بار چکر لگوائے جاتے ہیں تاکہ بندہ تنگ آ کر سٹاف کو رشوت دے کر کام کرانے پر راضی ہو جائے۔ سیاسی پارٹیاں ہر عہدے پر اپنے نا اہل بندے لگاتے ہیں تاکہ وہ اس عہدے کو استعمال کر کے ان کے فائدے اور اپوزیشن کو نقصان پہنچا سکیں۔ نبی کریم ﷺ اسی کو امانت کو ضائع کرنا قرار دے رہے ہیں۔

حدیث: مجالس بھی امانت ہیں۔ صرف مال ہی نہیں باہمی گفتگو بھی امانت ہوتی ہے۔

حدیث: جب آدمی کوئی بات کہے اور چلا جائے تو یہ امانت ہے۔
(ابو درداء، ترمذی۔ جابرؓ)

حدیث: یعنی راز امانت ہے۔ تمہاری باہمی گفتگو امانت ہے۔
(ابن ابی الدنیا۔ ابن شہاب ص 209)

حضرت حسنؓ: ''کسی بھائی کو وہ بات جسے وہ راز رکھنا چاہے ظاہر کر دینا بھی خیانت ہے۔''

حضرت معاویہؓ: ''کسی کا راز ظاہر کرنا خیانت ہے اور یہ حرام ہے اگر اِس میں کسی کا ضرر ہوتا ہو، اگر ضرر نہ ہو تب بھی یہ کمینگی کی علامت ہے۔''

ہمارے کلچر میں، بچپن سے ہی امانت یا دیانت کا تصور صرف مال کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔ کسی دوسرے کے پاس زیورات اور پیسے امانت رکھنے کی ہی مثال دی جاتی ہے دکان دار صحیح تول کر، بلا ملاوٹ اچھا سودا دے تو وہ ایمان دار کہلاتا ہے۔ اس لیے تھوڑی تفصیل بتانا ضروری بن جاتا ہے۔

اسلام کا ہر حکم اور کسی مسلمان کی ہر چیز یا بات یا اللہ کا دیا علم اور آئیڈیا زاس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہوتے ہیں کیونکہ وہی اس لیے عطا کرتا ہے کہ دوسروں تک پہنچائے تاکہ خلق خدا کو فائدہ پہنچے۔ اس حکم کا تعلق کسی غیر کی ملکیت سے ہو یا اپنی ذات سے، دنیاوی معاملات سے ہو یا مذہبی عبادات سے، کسی عہدے سے ہو یا کسی اختیارات سے، الغرض ہماری زندگی کا ہر سانس، ہمارے منہ کا ہر بول اور ہمارے ہاتھ کا ہر فعل ہمارے پاس امانت ہے اور کسی بھی امانت کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس کو پورے آداب اور لوازمات کے ساتھ دوسروں تک پہنچا کر ادا کیا جائے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی اور ناانصافی نہ کی جائے، یعنی سچ پر مبنی ہو۔ اس حکم میں امیر و غریب اور حاکم و محکوم سب برابر کے ذمہ دار ہیں۔

ہر ایک راعی ہے:

حضرت عبد اللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو

فرماتے ہوئے سنا:

''تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے، اور ہر شخص سے اس کے ماتحت لوگوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، سربراہ مملکت اپنے عوام کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کے عوام کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ مرد اپنی بیوی کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی بیوی کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کے گھر کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ خادم اپنے مالک کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس مال کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ ایک شخص اپنے باپ کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس مال کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کے ماتحت لوگوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ (بخاری)

صرف مال میں ہی امانت نہیں ہوتی، کام بھی امانت ہے۔ کام میں بھی دیانتداری ضروری ہے اسی لیے انگریز کہتے ہیں کہ:

BE HONEST WITH YOUR WORK

جب ہم کسی سے کوئی کام کروانے کی اُجرت طے کر لیتے ہیں تو وہ کام اس پیسے کے بدلے امانت بن جاتا ہے اور پیسے واپس کرنے کی جگہ وہ یہ کام مکمل کر کے ہمیں واپس کرتا ہے تو یوں یہ کام بھی امانت ہوا۔ مگر ہم اسے امانت نہیں سمجھتے اور پوری دیانت داری سے کرنے کی بجائے ٹرخانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے ایک کہانی پڑھی تھی کہ ایک آدمی نے گھر میں رنگ روغن کے لیے پینٹر کو ٹھیکے پر رکھا تو وہ کچھ کام کر کے دُور جا کر دیکھتا تھا پھر دوبارہ صحیح کرتا تھا تو اس شخص نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو تو ان کہا کہ رنگ تو لوگ دُور سے دیکھتے ہیں اس لیے میں دور جا کر دیکھتا ہوں کہ کیسے لگتا ہے مجھے خود اچھا نہیں لگا تو پھر ٹھیک کیا۔ کام میں دیانت داری ایسے کی جاتی ہے۔

قیامت کے دن ہر ایک سے پانچ سوال پوچھے جائیں گے کیونکہ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں ان کو کیسے استعمال کیا ہے اس پر اللہ سبحانہ تعالیٰ پوچھیں گے۔

حدیث ترمذی۔ حضورﷺ نے فرمایا جب تک تم سے چار سوال نہیں پوچھ لیے جائیں گے تمہارے قدم نہیں ہلیں گے۔ پہلا سوال:۔تم نے عمر کیسے گزاری؟ (یہ وقت کی اہمیت بارے ہے کہ جو وقت تمہیں اس دنیا میں امانت کے طور دیا گیا ہے وہ تم نے وقت کیسے گزارا؟ فارغ وقت کیسے گزارا) دوسرا سوال: جوانی کیسے گزاری؟ تیسرا سوال: تم نے علم کیسے استعمال کیا؟

اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے کہ ''اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کی نظر میں یہ سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم کہتے کچھ ہو اور اس پر عمل نہیں کرتے۔'' (61:2-3)

چوتھا سوال: تم نے پیسہ کیسے کمایا اور پانچواں سوال۔ دولت کیسے خرچ کی؟

ہماری ذات بھی ہماری ملکیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی امانت ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے ساتھ بھی امانت کے تصور کو سمجھنا ضروری ہے؛ ہم اپنے جسم کو اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتے اس لیے ہر عضو کے صحیح استعمال کے لیے بھی ہمیں اللہ کو جواب دینا ہوگا۔ اسے انگریز Be Honest with your self کہتے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو بھی دھوکہ نہیں دینا چاہیے بلکہ سچ اور حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے، مگر ہم آزادی کے بعد سے اپنے آپ کے ساتھ بھی دیانت داری کا ثبوت نہیں دے رہے اور من حیث القوم اپنے کو دھوکہ دے رہے ہیں کہ ہم امیر ملک ہیں ہم بہت لائق اور اچھے مسلمان ہیں۔ سچ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ہم غریب ملک ہیں۔ ہمیں گڈ گورنس کا پتہ نہیں۔ ہم انگریزوں کے چھوڑے سسٹم چلا بھی نہیں سکتے۔

وقت بھی اللہ کی امانت ہے اس بارے بھی سوال ہوگا۔ رزق اور بچے بھی امانت ہیں۔ ان بارے بھی پوچھا جائے گا کہ پیسے کیسے خرچ کیے۔ بچوں کی کیسے تربیت کی۔ ہم اپنی ذات، اللہ تعالیٰ اور اس کی دوسرے مخلوقات و کائنات کے ساتھ بھی کتنی ایمان دار سے سلوک کرتے ہیں اس پر بھی احتساب ہوگا۔ دراصل ایمانداری سوچوں

سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بھی جب ہر ایک کے شعور میں بچپن سے ہی بویا جائے تو تب جا کر ہمیں اس کا پھل عمدہ، راست باز، ایماندار افراد پر مبنی معاشرے کی شکل میں ملے گا۔ اپنے دل اور ذہن کے اندر ایمانداری لانی پڑے گی۔ ہمیں ہر دفعہ، ہر موقع پر اپنے آپ سے ایماندار بننا پڑے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اچھی سوچوں پر بھی ایک ثواب دیتا ہے۔ خراب سوچ پر صرف تب گناہ ہوتا ہے جب اس پر عمل بھی کر لیا جائے

اللہ تعالیٰ نے جو کام سونپا ہو وہ بھی امانت ہے، جیسے ہم کسی کو اچھا کام کہنے پر شاباش دیتے ہیں۔ ہر تعلق بھی امانت ہے۔ اگر ہر موقع پر، ہر آدمی، عورت، رشتہ دار، کام، برتاؤ میں جیسے کہ اس کا حق ہے ویسے برتاؤ کریں تو ہم ایمانداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایسا سلوک کرے تو تبھی ایمان دار معاشرہ بنے گا۔

امانت میں خیانت کی بہترین مثال ہمارے سیاست دان ہیں اور عوام کو بھی پتہ ہی نہیں کہ ووٹ بھی ایک امانت ہے۔ ووٹ دراصل ایک رائے اور گواہی ہوتی ہے کہ ووٹر کہہ رہا ہے کہ یہ سیاسی امیدوار بالکل صحیح آدمی ہے چاہیے تو یہ کہ وہ صادق اور امین شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجیں جو تمام فیصلے ملک، قوم اور عوام کی بھلائی میں نیک نیتی سے کرے۔ نبی کریم ﷺ نے عہدے کو بھی امانت اسی لیے کہا ہے جیسے کہ سیاست دان جب منتخب ہو کر اسمبلی میں جاتا ہے تو قانون سازی نہیں کرتا تو خیانت کر رہا ہے۔ وزیر بنتا ہے اور محکمے کو سچ اور عوام کے مفاد میں نہیں چلاتا تو کام جو اس کو سونپا گیا ہے اس امانت میں خیانت کر رہا ہے۔ عوام کے مسائل حل کرنا اور آسانیاں لانا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ مگر وہ یہ نہیں کرتا بلکہ پہلے مسائل پیدا کرتا ہے پھر احسان جتا کر کام کرتا ہے تا کہ اگلے الیکشن میں پھر اس کو ووٹ یہ طریقہ بھی امانت ادا نہیں کر رہا۔

بس، ویگن ڈرائیور کے پاس مسافروں کی جانیں امانت ہوتی ہیں، جن کو حفاظت سے منزل پر پہنچانا ہے مگر اس کو احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ امانت ہے۔ اگر ہوتا تو ہمیشہ ڈرائیونگ میں سیفٹی کو ترجیح دیتا، احتیاط کرتا تا کہ ایکسیڈنٹ نہ ہو۔

کرائے دار کے پاس مکان امانت ہوتا ہے مگر وہ اسے امانت سمجھتا ہی نہیں۔

اس کو بے دردی سے استعمال کرتا ہے۔

تمام عہدے داروں، تھانیدار، ڈپٹی کمشنر کے پاس لوگوں کی جان، مال، عزت امن سلامتی، امانت ہوتی ہے۔ جس کے لیے جواب دہ ہونگے۔ مگر وہ عوام کو محکوم، غلام سمجھتے ہیں تو خیال کیا خاک کریں گے۔ اور یوں اپنے کام کی امانت میں خیانت کرر ہے ہیں۔

سکول اور ٹیچرز کے پاس بچے علم سیکھنے کے لیے جاتے ہیں تو پیسے لینے کے بدلے علم سکھانا ان کے لیے فرض اور امانت ہوتا ہے۔ ٹھیکیدار کے پاس مکان کی تعمیر امانت ہوتی ہے۔ وہ جائز منافع پر قناعت نہیں کرتا میٹیر ل میں بھی خیانت کرتا ہے۔

میٹنگ میں جو کچھ بات چیت یا فیصلے ہوتے ہیں وہ سب کے پاس امانت ہوتے ہیں، راز ہوتے ہیں۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ صحافی کسی نہ کسی طرح بات معلوم کر کے راز فاش کر دیتے ہیں۔ مثلاً میرا ایک اپنا ایڈمن منیجر، میٹنگ کے فیصلے لیبر یونین کو بتا دیتا تھا جس سے مجھے بار بار ناکامی ہوتی تھی۔ اگر آپ کسی کے دفتر میں بیٹھے ہیں اور اس دوران دفتر والا کسی سے ٹیلیفون پر بات کرتا ہے جو آپ سن رہے ہیں وہ امانت ہے۔ باہر جا کر دوسروں کو بتا دیا تو آپ نے خیانت کی۔

یہ چند مثالیں دی ہیں تا کہ امانت کا نظریہ سمجھ آ جائے باقی آپ خود غور کر لیں۔ میرے مطابق یہ سب سے اہم ذاتی صفت ہے جس کو بچپن سے ہی تعلیم دینے، سمجھانے اور پریکٹس کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ عادت بن جائے تو ملک ترقی کرنا شروع ہو جائے گا۔ معاشرے میں امن، سکون اور خوش حالی آ جائے گا۔

سبق:

امانت کا تصور دراصل کسی دوسرے کی ملکیت، حقوق سے منسلک ہے۔ اس لیے دوسروں کی جان، مال، عزت، کے معاملات بھی امانت میں شامل ہوتے ہیں ان کے علاوہ وقت بھی اللہ کی ملکیت ہے۔ وقت بہت قیمتی اثاثہ ہوتا ہے کیونکہ ہر آدمی اور عورت کے پاس نا معلوم اور محدود وقت ہوتا ہے جس میں اس نے نیک اعمال کرنے

ہوتے ہیں۔تو اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ کا وقت ضائع نہ کریں تو آپ بھی دوسروں کے وقت کو امانت سمجھیں۔اور کسی کا وقت ضائع نہ کریں۔

انسان کے بارے کوئی انفارمیشن، جو اس کی جان، مال، عزت کے لیے خطرہ بنے وہ بھی امانت ہے۔

کسی دفتر میں سرکاری چیزیں، جیسے کاغذ، پنسل، فرنیچر، گاڑی، کار وغیرہ سٹاف کے پاس لوگوں کی امانت ہیں کیونکہ ٹیکس کے پیسے سے خریدی گئی ہیں۔ان کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا خیانت بنتی ہے۔یہی بات کسی کمپنی کی چیزوں کے لیے بھی ہے۔

کوئی رائے مانگے تو صحیح رائے دینا بھی امانت میں آتا ہے۔حکومت کو سچ پر مبنی رپورٹ دینا امانت ہے۔کسی کے مفاد میں غلط رپورٹ دی تو امانت میں خیانت کی۔

کسی پبلک جگہ جیسے سڑک، سائین بورڈ، واش روم، پارک، مسجد، ریلوے سٹیشن، ہسپتال وغیرہ کو غلط استعمال کیا یا اس کا نقصان کیا تو خیانت کی۔جیسے سڑک کے سائین بورڈ پر اشتہار لگا کر نام چھپا دیا تو پبلک سے خیانت کی۔سڑک پر گھر کا پانی ڈال کر خراب کر دی تو خیانت کی۔پارک کو استعمال کے بعد گندہ چھوڑ دیا تو خیانت کی۔واش روم استعمال کر کے صاف چھوڑنے کی بجائے گندہ چھور دیا تو خیانت کی۔دکاندار اپنی دکان کے سامنے فٹ پاتھ کو اپنے استعمال میں لے آیا تو پیدل چلنے والے کے حق میں خیانت کی۔

کسی سے ادھار چیز، موٹر سائکل، کار لے کر غلط استعمال کی تو خیانت کی۔

یہ صرف چند آئیڈیاز دیئے ہیں باقی آپ خود سوچیں۔

اس اسوۂ حسنہ پر عمل چونکہ ذاتی عمل ہوتا ہے تو آسانی سے اس پر عمل کیا جا سکتا ہے، بات صرف سوچ، احساس، اور اللہ کو جواب دہی کی ہے۔اگر ہمارا نیشنل مائنڈ سیٹ امانت والا ہو تو حکومت کی چیزیں جو اجتماعی استعمال کے لیے ہوتی ہیں، کبھی خراب نہیں ہوں گی۔ورنہ آج کل تھوڑے عرصے میں ہی چیز خراب ہو جاتی ہے۔

☆......☆......☆

۲۳۔ وعدہ نبھانا بھی اہم سنت ہے

سورہ بنی اسرائیل: آیت 4۔ ''بے شک عہد کی باز پرس ہونے والی ہے، تم سے وعدے بارے سوال کیا جائے گا۔''

"and fulfill the promise, surely (every) promise shall be questioned about." (Surah al-'Isra', 17:34)

اچھے انسانی خصائل جس کی وجہ سے انسانی معاشرت میں بھائی چارہ کی فضاء تشکیل پاتی ہے۔ ان میں سے ایفائے عہد یعنی اپنے وعدہ کا پورا کرنا ایک اہم خصلت ہے۔ اسلام نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس بارے میں ہدایات بڑی واضح ہیں۔ اسوہ رسول ﷺ میں اس کی بڑی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی الحسماء رضی اللہ عنہ حضور سید عالم ﷺ کی بعثت مبارکہ سے پہلے کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ ''میں نے جناب رسالت مآب ﷺ سے ایک معاملہ طے کیا اور اور ان کو کہا کہ آپ اسی جگہ تشریف رکھیے گا، میں ابھی آ کر حساب کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے وعدہ فرما لیا۔ میں وہاں سے چلا آیا لیکن مجھے واپس جانا یاد ہی نہ رہا۔ تین دن کے بعد یاد آیا تو دوڑا دوڑا اس جگہ پر پہنچا جہاں میں آپؐ کو بٹھا کر آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ اسی جگہ پر تشریف رکھتے ہیں۔ میں بڑا شرمسار ہوا اور معذرت کی۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: میں تین دن سے یہاں پر تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ اگرچہ تم نے مجھے بڑی اذیت دی، لیکن میں تمھیں معاف کرتا ہوں، اللہ بھی تمھیں معاف فرمائے۔ (ابوداؤد، ص 52)۔

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں نے معاف کیا اللہ بھی تمہیں معاف فرمائے، بڑی اہم statement یا بیان یا نصیحت ہے جس پر ہمیں عمل کرنا چاہئے۔ یعنی کہ اگر

ہم کسی کو معاف کر دیں تو یہ بھی ضرور کہیں کہ اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔

منافق کی تین نشانیاں پہلے بیان ہو چکی ہیں جھوٹ بولنا۔ وعدہ خلافی کرنا۔امانت میں خیانت کرنا۔

سورہ بقرہ کے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ انسانوں کی تین اقسام بیان فرماتا ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو کہ کسی بھی آئیڈیا، نظریہ، پلان کو دل سے مان لیتے ہیں۔ دوسرے وہ انسان جو بالکل ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ کافر کہلاتے ہیں۔ پہلے دو کا آپس میں دشمن ہونا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔تیسرے وہ جو ہوا کا رخ دیکھتے رہتے ہیں کہ مومن اور کافر میں سے کون کامیاب ہوتا ہے، اور اپنے مفاد کو یقینی بنانے کے لیے دونوں کو ہی وفاداری کا یقین دلاتے رہتے ہیں تو یہ منافق کہلاتے ہیں۔ منافقت کو اللہ فساد کہتا ہے۔ اس لیے کہ منافق وعدہ خلافی کر کے دراصل سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو کامیابی سے دھوکہ دے کر بہت چالاک ثابت ہو رہا ہے مگر اللہ تعالیٰ دراصل اسے بتا رہے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اور آخر میں اسے یہ کھیل یا تجارت بالکل فائدہ نہیں دے گی

اپنی آسانی کے لیے وعدہ توڑنے کی عادت کی وجہ دوسرے کی پرواہ نہ کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی حالات کی مجبوری کی وجہ سے وعدہ نہ نبھا سکے اور دوسری پارٹی کو بتا دے تو یہ وعدہ خلافی نہیں گنی جاتی۔ میٹنگ میں کسی جائز وجہ سے لیٹ ہو رہا ہو اور وہ کال کر کے بتا دے تو یہ کال کر کے بتانا دراصل وعدہ نبھانے میں ہی آتا ہے کیونکہ بعض اوقات بعض باتیں انسان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہیں۔

وعدہ کر کے وقت کی پابندی نہ کرنا، یا ٹیلیفون کا کہہ کر فون نہ کرنا سب سے کامن اور تکلیف دہ وعدہ خلافی کی عادات ہیں۔ سب سے بڑی عام ہونے والی وعدہ خلافی اور جھوٹ شادی کی دعوت میں ہوتی ہے۔ ٹائم 7 بجے کا لکھا ہو گا مگر شروع دو گھنٹے بعد ہو گی اگر آپ وقت پر گئے تو گھر والوں میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو گا۔ یہ دراصل ایسی وعدہ خلافی ہے جو کہ سخت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

ایئر لائن والے جب اناؤنس کرتے ہیں کہ فلائٹ اتنے بجے جائے گی۔ تو یہ دراصل مسافر سے وعدہ ہوتا ہے۔ فارن ایئر لائن یہ وعدہ نبھانے کی کوشش کرتی ہیں مگر کبھی لیٹ ہو جاتی ہیں۔ مگر پاکستانی ایئر لائنز وعدے کی زیادہ پرواہ نہیں کرتیں۔ جب پاکستانی وی آئی پی نے جانا ہو تو اس کے لیٹ آنے کے انتظار میں فلائٹ لیٹ کر دیتے ہیں۔ اس تاخیر سے مسافروں کو اور ان کے لینے والوں کو تکلیف ہوتی ہے یا جن کے آگے کنکشن ہوتے ہیں وہاں تکلیف ہوتی ہے۔ مگر کسی کو اپنے گاہکوں کی بالکل پرواہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمارا عمومی رویہ ہے کہ مسافر مجبور ہیں کیا کر لیں گے

ہم سب بنیادی طور پر ایک دوسرے کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے اور استحصال پسند لوگ ہیں۔ exploitive mentality رکھتے ہیں۔ پاکستان میں عمومی رویہ ہے، کہ جب آپ کسی کے پاس کام کے لیے جاتے ہیں وہ فوراً آپ کو مرغہ سمجھ لیتا ہے یا مجبور اور یہ کہ پھنس گیا ہے اس سے فائدہ اٹھالو۔ آپ اس کی شرائط پر سودا طے کر لیں مگر وہ کرے گا اپنی مرضی۔ ہمارے یہاں سروس، خدمت یا دوسروں کا خیال رکھنے کا کلچر نہیں ہے۔

ریٹائرمنٹ کے Procedure میں لکھا ہوتا ہے کہ آپ کی پنشن ریٹائرمنٹ ڈیٹ سے اگلے دن شروع ہو جائے گی۔ اس حکومتی وعدے کے باوجود لوگ مدتوں خوار ہوتے رہتے ہیں۔

یہی حال ہر کاریگر کا بھی ہوتا ہے۔ الیکٹریشن، ٹیلر، پلمبر، مزدور کوئی بھی ورکر وعدے کی پابندی نہیں کرتا۔ پیسے مرضی کے لے گا، کام بھی اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کرے گا۔ آپ ہسپتال، ریلوے، ہوٹل، کسی کمپنی، حکومتی ادارے سے ڈیل کر کے دیکھ لیں تو آپ کو ہر جگہ وعدہ خلافی نظر آئے گی۔ اب تو لڑکی والے بھی شادی سے پہلے مظلوم بنتے ہیں۔ شادی ہوئی تو لڑکے والے مظلوم بن جاتے ہیں۔

کوئی بھی سیاسی یا مذہبی لیڈر کبھی بھی مقررہ وقت پر تقریر کرنے نہیں آئیں گے۔ اور جب شروع کریں گے تو ختم نہیں کریں گے۔ سامعین کی تکلیف کی کسی کو پرواہ

نہیں ہوتی۔ یعنی پوری قوم کو وعدہ خلافی کی عادت ہے۔ نہ ہی دوسروں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ نہ ہی احساس ہے کہ وعدہ خلافی پر پکڑ ہوگی۔ نہ ہی وعدہ خلافی سے جو فساد پھیلا ہوا ہے، اس کی فکر ہے۔ ہم لاپرواہ اور بے حس قسم کے لوگ بن گئے ہیں۔

ہر آدمی زبانی معاہدے کی خلاف ورزی کو اپنا حق سمجھتا ہے کیونکہ گواہی قائم کرنی مشکل ہوتی ہے۔ آج کل لوگوں نے اپنے کو سچا ثابت کرنے کے لیے ایک نئی دلیل نکال لی ہے کہ میں نے تو صرف بات کی تھی، وعدے کا لفظ تو نہیں بولا تھا۔ اب تحریری وعدہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی خلاف ورزی بھی عام ہے۔ شادی بھی ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ یک طرفہ کھڑے کھڑے طلاق دے دینا وعدہ خلافی ہوتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی معاہدہ ختم کرنے کی بھی دوطرفہ شرائط اور طریقہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق طلاق کا پلے ارادہ ظاہر کرنا ہوتا ہے پھر فیملی کی مصالحتی کمیٹی کو شادی بچانے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ کوشش فیل ہونے پر صرف ایک طلاق گواہوں کی موجودگی میں دینی ہوتی ہے۔۔ مگر اس طریقہ کی خلاف ورزی کر کے اپنی مرضی سے تین طلاق دینے سے وعدہ خلافی بنتی ہے۔

شناختی کارڈ، پاسپورٹ آفس، ہاؤسنگ سوسائٹیوں وغیرہ بھی تحریری معاہدوں کو آنر نہیں کرتے۔ ان کے پاس سو بہانے ہوتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ احتساب کا ڈر جاتا رہا ہے۔ ہماری قوم دور جاہلیت کی طرح اپنی مرضی کرنے پر لگ گئی ہے۔ قانون پر عمل کرنا کمزوری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ قانون توڑنا یا پرواہ نہ کرنا، صاحب اثر ہونے کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ دیر سے آنا وی آئی پی کی نشانی ہوتی ہے۔ اس لئے دوسرے کے حقوق کی حفاظت یا حفاظت کا احساس تک نہیں رہا۔

سبق:

وعدہ خلافی دراصل جھوٹ بولنے کے برابر ہے۔ جب تک ہم سچ بولنا شروع نہیں کرتے تو وعدہ نبھانا پریکٹس میں نہیں آئے گا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے وعدہ خلافی کر کے آپ کو تکلیف نہ پہنچائیں تو پھر آپ کو بھی وعدہ نبھانے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

اس سنت پر عمل کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔اس سنت پر عمل کرنا آسان اس لیے ہے کیونکہ آپ کا ذاتی فعل ہوتا ہے۔صرف بات شعوری فیصلے کی ہوتی ہے کہ دل سے طے کر لے کہ میں نے وعدہ خلافی نہیں کرنی کیونکہ گناہ ہے تو پھر وعدہ نبھانا آسان بن جاتا ہے۔

مشکل اس لیے ہے کیونکہ جو وعدہ نبھانا چاہے گا جب اسے بدلے میں وعدہ خلافی ملے گی تو وہ آہستہ آہستہ مایوس ہو جائے گا اور عادت بدلنے کا سوچنے لگے گا مگر صبر کریں اور اپنی وعدہ نبھانے کی عادت کو مت بدلیں کیونکہ آپ نے اللہ کو جواب دینا ہے یہ امتحان جتنا بڑا ہے اجر بھی اسی نسبت سے بڑا ملے گا انشاءاللہ۔

☆......☆......☆

۲۴۔انسانوں سے انسانیت کی بنا پر محبت کرنا اور رحمت بننا، بنیادی سنت ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (سورة انبیاء. آیت 107)

''ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔'' تفہیم القرآن

نبی کریم ﷺ کو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔اس لیے آپ کی سب سے اہم اور بنیادی سنت رحمت بننا ہے۔انسانوں سے پیار،اور محبت ہو تو اس کے ذریعے ہی رحمت بنا جا سکتا ہے۔انسانوں سے انسانیت کی بنا پر محبت کرنا سنت ہے یہ حدیث پہلے دی جا چکی ہے۔عقل میرے دین کی اصل ہے اور محبت میری بنیاد ہے۔

حدیث پاک:۔''ایمان کے بعد سب سے بہتر عمل انسانوں سے محبت ہے۔'' کنز العمال نمبر (24653)

حدیث پاک:''تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔'' (مشکوٰۃ کتاب الادب 613/2)

''اللہ کے نزدیک وہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کے لیے فائدہ مند ہو۔'' (جامع صغیر، کنز الحقائق)

حدیث مبارک۔ (راوی حضرت بلالؓ) ''اسلام اللہ کے سامنے مکمل تابعداری اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کا پابند بنانا ہے۔اس اللہ کے سامنے

جو اکیلا ہے اس کا کوئی ساتھی نہیں۔ اسلام ہر انسان کے ساتھ بھلائی کا نام ہے۔ ہر انسان سے مطلب ہے چاہے وہ کسی نسل، رتبہ یا رنگ کا ہو۔ اسلام میں تمام انسان برابر ہیں۔ اسلام کو ہی اللہ نے تمام انسانوں کا مذہب و دین منتخب کیا ہے۔" (ریفرنس کتاب "بلال" ترجمہ، مسٹر کریگ)

انسانوں اور سب ذی روح مخلوق کے لیے رحمت بننے کی کوشش کریں:

دوسری حدیث میں ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ نے کائنات پیدا کی تو اللہ تعالیٰ نے کتاب میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غصہ پر حاوی ہے۔"

(Bukhari 9:501)Bukhari, Vol 4, Book 54. Beginning Of Creation. Hadith 416. Bukhari, Vol 8, Book 73. Good Manners And Form (Al-Adab). Hadith 029.

ایک اور حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کیے اور ننا وے حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ دنیا میں بھیجا جس کی وجہ سے ہی سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ یا ماں کی بچے کے لیے محبت سے ستر گنا زیادہ اللہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔" (Al-Muwatta 51.15)

حدیث قدسی: حضرت ابو ہریرہؓ کے مطابق رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کہے گا کہ آدم کے بیٹے میں بیمار تھا اور تم نے مجھے آ کر نہیں دیکھا تو وہ آدمی کہے گا کہ آپ تو دنیا جہاں کے مالک ہیں تو میں کیسے آپ کو مل سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں فلاں بندہ بیمار ہوا تھا تو تم نے اسے جا کر نہیں دیکھا تھا۔ کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ اگر تم اسے جا ملتے تو مجھے وہاں پر اس کے پاس ہی پا لیتے۔ پھر کہے گا کہ میں نے تم سے کھانا مانگا اور تم نے نہیں کھلایا تو وہ کہے گا کہ میں آپ کو کیسے کھلا سکتا تھا جبکہ آپ تو سب کے مالک ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا تو تم نے نہیں کھلایا۔ اگر تم نے کھلایا ہوتا تو اس کا اجر میرے پاس موجود

پاتے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تمہیں پانی پلانے کے لیے کہا تھا مگر تم نے نہیں پلایا تو وہ آدمی کہے گا کہ میں کیسے آپ کو پانی پلا سکتا تھا جبکہ آپ تو تمام جہاں کے مالک ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے فلاں فلاں بندے نے پانی مانگا تھا مگر تم نے نہیں پلایا اگر پلاتے تو تم اسے میرے پاس موجود پاتے۔'' (قدسی، حدیث، نمبر 13 (بخاری، ص۔438)

اس حدیث میں صرف مسلمانوں کے لیے بات نہیں ہو رہی بلکہ تمام انسانوں کی ہو رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب انسانوں کو چاہے کسی مذہب کا ہو، ان کو اپنی عیال یعنی فیملی کہتا ہے۔ یعنی انسان کی مدد کرنے کے لیے مذہب کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا اور نہ بننا چاہئے۔ اس لیے جنت انسانوں کی خدمت سے ملے گی کیونکہ اللہ انسانوں کو اپنی عیال یا فیملی کہتا ہے۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہی ہیں مردوں کی شمشیریں

ایک دوسرے سے محبت ہی تمام خوشگوار تعلقات کی بنیاد ہوتی ہے جس سے پیار ہو، اسی سے تعلقات رکھے جاتے ہیں ورنہ انسان ملنا تو کجا بلکہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہے گا۔ جس سے نفرت ہو یا جس کا خیال نہ ہو۔ ماں کی محبت مشہور ہے مگر اللہ کی محبت انسانوں کے لیے اس سے بھی ستر گنا زیادہ ہے۔

معلوم سے نامعلوم ہی سیکھنے کا سائینسی طریقہ ہے۔ والدین کی محبت اپنی اولاد کے لیے سب کو معلوم ہے تو اللہ کی اپنی مخلوق کے لیے جسے وہ اپنی عیال کہتا ہے کتنی محبت ہوگی اس کا خود اندازہ لگا لیں۔ محبت کی وجہ سے ہی والدین ساری عمر بچوں کی غلطیاں، زیادتیاں معاف کرتے ہیں۔ اللہ کی معافی ستر گنا زیادہ ہے۔ اسی لیے اللہ کہتا ہے کہ

''میں تم کو سزا دے کر کیا کروں گا۔ اگر تم میرے شکر گزار بندے بن جاؤ۔''

(4-147) یعنی سزا بھی دوسرے کو ٹھیک کرنے کے لیے دی جاتی ہے کہ ڈر کر غلط عادت چھوڑ دے جو کہ اسی کی بھلائی کے جذبے سے کیا جاتا ہے۔

اس لیے ہمارا بھی اللہ کے ساتھ محبت کا درجہ ماں باپ سے محبت سے زیادہ ہونا چاہئے اور جیسے والدین کی بات اور نصیحت پر عمل کرتے ہیں، چاہے جی چاہے یا نہ، کیونکہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ہمارے فائدے کی بات ہی کریں گے تو اسی طرح اللہ کی ہر بات پر بھی یقین کر کے عمل کرنا چاہئے، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ ہمارے فائدے کی ہی بات بتا رہا ہے اور اس کا دنیا اور آخرت میں نتیجہ اچھا ہوگا۔

رسول کریم ﷺ سے محبت اور ان کی فرمانبرداری بھی دراصل اللہ کی ہی فرمانبرداری ہے۔ اور آپ ﷺ سے محبت بھی دراصل اللہ سے ہی محبت کا ثبوت ہے۔

Say: "If you love Allah, then follow me and Allah will love you and forgive your sins." (Surah Al 'Imran: 31).

اسی لیے حضور پاک ﷺ کی اللہ سے محبت بہت زیادہ تھی، اور اسی کو انہوں نے دوسروں کے لیے بنیاد بنایا تھا۔ ان کو لوگوں کا کتنا خیال تھا کہ آگ سے بچ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا کہ آپ کیوں اپنے آپ کو فکرمند اور ہلکان کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو ہدایت دینا میرا کام ہے آپ ﷺ کا کام صرف میرا پیغام پہنچا دینا ہے۔

جہاں محبت ہوتی ہے، صرف وہاں ہی خیر خواہی، ہمدردی، معافی اور رحمت ایثار، قربانی ہوتی ہے۔ محبت ہو تو سب سے پہلے فرمانبرداری مانگتی ہے اور منع کی گئی چیزوں سے بچنے سے، نافرمانی سے۔ اسی لیے ہمیں حکم ہے کہ رسول کریم ﷺ سے محبت اپنی جان، والدین، خاندان کی محبت سے زیادہ ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے تم اپنے آباء کی یاد سے بھی زیادہ یاد کیا کرو۔ (سورہ بقرہ)

جس مرد یا عورت سے محبت ہو تو کوئی ایسی بات نہیں کرتے کہ وہ ناراض ہو جائے تو یہی بات اللہ کے ساتھ بھی ہونی چاہیے کہ اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ نہی عن المنکر یا جس بات سے منع کیا ہے اس سے رک جانا چاہئے۔ اس سے بچا جائے۔ پیروں سے مریدوں کی محبت دیکھ لیں۔ ہم دوست کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کے ساتھ پھر بھی دوست رکھتے ہیں کیونکہ اس سے محبت ہوتی ہے۔ والدین بھی بچوں کی

اچھائیوں برائیوں کے ساتھ ان سے محبت کرتے ہیں۔ یہی حال اللہ کا بندوں کے ساتھ ہے کہ وہ بار بار معاف کرتا ہے جب تک وہ بالکل باغی نہ ہو جائیں۔

حضور اکرم ﷺ نے بھی کفار کے دل محبت سے جیتے تھے۔ برائیوں کے بدلے اچھائی اور محبت کے اظہار سے۔ جیسے کہ کانٹے بچھانے والی عورت بیمار ہوگئی تو اس کی تیمارداری کے لیے گئے تو اسی محبت کی وجہ سے وہ مسلمان بھی ہوگئی تھی۔

اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ کی محبت انسان کی روح میں موجود ہے اور اسے پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا الہ ہے۔ تو اللہ کی محبت کی یہ ڈیمانڈ ہے کہ اس کی مخلوقات خصوصاً، انسانوں سے محبت کی جائے۔ یعنی ان سے ہمدردی، احسان، عدل کیا جائے۔ ایثار قربانی کی جائے۔ جب محبت بنیادی جذبہ بن جائے تو پھر یہ سب کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کی دوسروں سے تعلق کی بنیاد محبت پر ہی تھی اس لیے آپ سب کے لیے رحمت بن گئے تھے۔ اسی لیے آپ کو رحمۃ اللعالمین کہا گیا ہے۔ اور آپ کی سنت اور اسوۂ پر عمل کے لیے ہمیں بھی سب کے لیے رحمت بننے کی نصیحت ہے اور ہم سب کو پتہ ہے کہ بڑوں کی نصیحت بھی حکم کا درجہ رکھتی ہے

اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی دراصل محبت کی بنیاد پر ہونا چاہیے تاکہ ہمیں اس کی محبت چھن جانے کا ڈر ہی اس کی فرمانبرداری پر مائل کرے نہ کہ سزا کا ڈر۔ جیسے کہ بچوں کی والدین سے محبت ہی ان میں یہ ڈر بھی پیدا کرتی ہے کہ کہیں ماں باپ ناراض نہ ہو جائیں۔۔ اللہ سے محبت ہو تو انسان کو اپنے آپ سے بھی محبت ہو جانی چاہیے تاکہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا سے بچائے۔

حسن یا خوبصورتی دراصل محبت کے جذبے کی محرک ہے۔ اس لیے حسن اور محبت لازم وملزوم بن جاتے ہیں۔ اس لیے جس انسان کے دل میں حسن ہوگا تو اس میں دوسروں کے لیے محبت ضرور ہوگی۔ یہی حال معاشروں میں بھی صادق آتی ہے جس معاشرے میں لوگوں میں خودغرضی کی جگہ اپنے لوگوں کے لیے دل میں محبت ہوگی وہ معاشرہ اچھا اور حسین کہلا سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ جس معاشرے کے دلوں میں محبت ہوگی

وہ دنیاوی ترقی بھی کرے گا۔ ورنہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کلام پاک میں فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کے دلوں میں دشمنی کی جگہ ایک دوسرے کی محبت ڈال دی تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ نرم دل تھے جو محبت سے جنم لیتی ہے۔ اگر نہ ہوتے تو وہ آپ سے بھاگ جاتے۔۳۔۱۵۹۔ یہ ثبوت ہے کہ محبت ہی ایک دوسرے کو جوڑے رکھتی ہے۔ انسانوں سے محبت میں ملک، زبان، نسل کا فرق نہیں آنا چاہیے۔

انسانوں سے محبت کرنے کی مثال

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ پر ہمارے سکول کے زمانے میں، میٹرک میں مسٹر ہنٹ کی ایک انگریزی نظم پڑھائی جاتی تھی۔ جس میں ان کے پاس فرشتہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ان کی فہرست بنا رہا ہوں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں تو ان کے پوچھنے پر فرشتہ بتاتا ہے کہ آپ کا نام نہیں ہے تو آپ نے کہا کہ پھر میرا نام ان لوگوں میں لکھ لو جو اللہ کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔ اگلی رات فرشتہ آیا اور بتایا کہ ان کا نام فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ نظم سے نکلا سبق دیکھیں۔ آپ ضرور انجوائے کریں گے۔

Abou Ben Adhem BY LEIGH HUNT

Abou Ben Adhem (may his tribe increase!)

The overall meaning is that to be a really good and therefore holy person, it is more important to love other people than anything else. The angel in the poem appears to be concerned with asking whether people are religious, but in fact it turns out that God is not concerned with that: Ben Adhem loves his fellow men, and this is what God wants him to do rather than following the forms of religion. The idea, I think, is that 'holiness' or goodness is a human quality and we should look for and love the goodness in humans rather than turning to ideas of an abstract holiness outside ourselves. Hope this helps

Class XI, ENGLISH, Summary, "Abou Ben Adhem"
Moral:This poem conducts the idea that we should love humanity and care for people. "To get love from God, love the board."

سبق

ہمیں حکم ہے کہ رحمۃ اللعالمین ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی نقل کر کے تمام انسانوں کے لیے رحمت بنیں۔ رحمت بننے لیے ہر ایک انسان کو پسند کرنا اور محبت کا جذبہ پیدا کرنا پہلا قدم ہے۔ محبت سے ہی دوسروں کی غلطیاں معاف کرنے کا جذبہ بنتا ہے۔ دوسروں کے لیے ایثار اور قربانی جنم لیتی ہے۔ ہماری موجودہ حالت اس ہدایت خداوندی کے برعکس ہے۔ دوسروں کی بات چھوڑیں ہم تو اپنوں سے بھی محبت نہیں کرتے، کوئی نہ کوئی عذر یا وجہ نکال لیتے ہیں۔ انسان کو انسان سمجھ کر ہی محبت ہوسکتی ہے، بنی آدم کا فرد ہونے سے وہ بھائی بنے گا۔ اگر اس کے ساتھ کسی دوسری پہچان کو نتھی کریں گے، خصوصاً مذہب کی، تو پھر محبت نہیں ہوسکتی۔ یا کسی کو یہ کہیں گے کہ ہم صحیح ہیں اور تم غلط تو پھر محبت کیسے ہو سکتی ہے۔ چونکہ ہمیں دوسروں کا دل جیت کر انہیں مسلمان بنانے کے سنت طریقے کا حساس ہی نہیں، لوگ ہم سے، ہمارے اخلاق لین دین سے متاثر ہوئے بغیر مسلمان کیسے ہونگے؟ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ سے محبت اور ہمدردی کا سلوک کریں تو پھر آپ کو بھی دوسروں سے محبت اور ہمدردی میں پہل کرنی چاہئے۔

اس سنت پر عمل کرنا بہت آسان ہے کیونکہ یہ ذاتی فیصلہ ہوتا ہے۔ دنیا میں واسطہ تو لوگوں سے ہی پڑتا ہے تو ان سے پیار محبت کا رشتہ ہو تو یہ زندگی خوشگوار گزرے گی۔ اس لیے دوسروں کی پرواہ نہ کریں کہ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں یا کہ نہیں۔ آپ سنت پر عمل کرتے جائیں۔ جانور بھی محبت کو پہچانتے ہیں اور ان کو پیار سے سدھایا جا سکتے ہیں۔ انسان تو انسان ہے وہ کیوں نہ محبت سے بدلے گا۔

☆......☆......☆

۲۵۔انسانی مساوات پریکٹس کرنا بھی بہت اہم اور بنیادی معاشرتی سنت ہے۔

یہ ہر انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ دوسروں سے برابری کی بنیاد پر سلوک اور عزت چاہتا ہے۔اور یہ ہے بھی سچ پر مبنی بات کیونکہ آدمؑ کی اولاد ہونے کے ناطے سب انسان ایک دوسرے کے بہن بھائی لگتے ہیں اور بہن بھائیوں میں تفاوت نہیں ہوتی۔

حدیث: ''مساوات پیدا کرو اور امتیاز نہ آنے دو تا کہ دلوں میں اختلاف نہ پیدا ہو۔'' (کنزالعمال (۲۰۵۹۵)

''لوگو سنو۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے بہت سے خاندان اور قبیلے بنا دئے ہیں۔تا کہ تم پہچانے جا سکو۔یعنی باہم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔'' (سورہ حجرات ۴۹۔آیت ۱۳)

''کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت اور برتری نہیں اور نہ کسی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر۔فضیلت اور برتری ہے صرف پرہیز گاری کی بنیاد پر ہے۔اور تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔'' (حجۃ الوداع)

''اے گروہ قریش، قیامت کے دن ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کا بوجھ اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے آؤ اور لوگ آخرت کا سامان لے کر آئیں یاد رکھو کہ اگر ایسا

ہوا تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکوں گا۔ خبردار زمانہ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے پیروں کے تلے روندی جا چکی ہیں۔'' (خطبہ حجۃ الوداع)

''ہم نے بنی آدم کو عزت دی، یعنی ہر انسانی بچہ، عورت مرد، مساوات اور برابر کی عزت کا حق رکھتا ہے۔ (ریفرنس۔70-17)

اور ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق ہونگے۔ و لـــــکـــــل درجات مما عملوا۔ (ریفرنس۔19-46)

''کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ کہے کہ اللہ کی بجائے میری غلامی اختیار کرو۔ چاہے اللہ نے اسے قانون دیا ہو یا ان کو نافذ کرنے کی پاور یا نبوت دی ہو۔'' (سورہ آل عمران۔۳۔۷۹)

انسانوں نے کلاس سسٹم خود ہی ایجاد کر لیے ہیں جن میں ایک برتر ہوتا ہے دوسرا کم تر۔ ہندوؤں میں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کے بعد اب دلت بھی ہیں۔ ۔ جہاں مساوات اور انسان کی عزت نہ ہوگی، وہاں غربت، جہالت، غصہ، نفرت، حسد، فرسٹریشن، چور ذہنیت، ناانصافی، ظلم ہوگا، یہ بنیاد ہے امن اور سکون کی تباہی کی۔

ہم بھی ہندوؤں کے ساتھ رہنے سے کلاس سسٹم کی پریکٹس کرتے تھے۔ ہمارے سارے کمی مسلمان ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ زمین پر بیٹھتے تھے۔ پاکستان بننے کی برکت سے تیس چالیس سال بعد اب ان کی بھی عزت کی جاتی ہے چارپائی پر بیٹھتے ہیں۔

ہمارا سارا معاشرہ، سیاسی لیڈران، گاؤں کے چوہدری، سرکاری افسران، مذہبی رہنما، عالم، پیر اور گھر یا خاندان کے بزرگ مساوات پر یکٹس نہیں کرتے، عقیدت کے نام پر، پروٹوکل کے نام پر۔ جبکہ حضور ﷺ صحابہ کی ساری عقیدت کے باوجود خود مساوات پریکٹس کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ اگر صدیوں پہلے ہم بھی مساوات کی پریکٹس پر اصرار شروع کرتے تو یہاں کلاس سسٹم ختم ہو چکا ہوتا اور شودر مسلمان ہو چکے ہوتے، مگر پھر بھی ہمارا دعویٰ ہے کہ:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز

ہماری مساوات صرف نماز میں اکٹھے کھڑے ہونے تک محدود ہے اور بس۔آج بھی کلاس سسٹم اور نسلی امتیاز موجود ہے۔ بلکہ اب تو ہم نئے سے نئے مالی، علمی، سیاسی اثر رسوخ کے حساب سے بھی نئے کلاس سسٹم بنا رہے ہیں۔اشرافیہ قانون سے بالاتر ہے۔آج بھی مسلمان ملکوں میں بنیادی انسانی حقوق کا تصور ہی نہیں کہ آپ یہ حق ڈیمانڈ کر سکیں۔اب آ کر لوگوں نے لکھنا شروع کیا ہے۔عورت کے حقوق کی بات کرنا اب بھی مشکل میں ڈالنے کے برابر ہے۔

جب ہم مخلوقات کے ساتھ تعلق کی بنیاد ہی کو نہ سمجھیں تو مساوات کیسے آ سکتی ہے۔انسانوں سے محبت کیسے ہو سکتی ہے۔گھروں میں، ملک میں امن کیسے ہو سکتا ہے۔جب تک ہم سچ نہیں بولیں گے تو ہم اللہ کے بیان کردہ تعلق کہ سب آدم کی اولاد ہیں اور وہ مٹی سے پیدا کئے گئے تھے یعنی کسی میں بھی فخر والی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے، کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہمارا اصل مسئلہ سچ نہ بولنے اور سچ کو تسلیم نہ کرنے سے ہی شروع ہوتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں انسانی مساوات کی پریکٹس کرنے میں اصل رکاوٹ تکبر ہی بنتا ہے۔اپنے آپ کو دوسروں سے برتر یا دوسروں کو حقیر سمجھنا ہی انسانی مساوات کی نفی کرتا ہے یہ غرور کئی وجہ سے ہو سکتا ہے۔نسلی، لسانی، خاندانی، مالی، علمی، خوبصورتی، طاقت، چاہے جسمانی یا مرتبے عہدے کی ہو۔ ابوجہل کو بھی نبی کریم ﷺ سے یہی شکایت تھی کہ قریش یعنی حکومت کرنے والی فیملی سے ہونے کے باوجود آپ مساوات کی تعلیم دیتے، پریکٹس کرتے اور نیچی ذات اور غلاموں کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں۔اسی لیے غرور سے بچ کر تواضع اختیار کرنے کی ہدایت ہے تا کہ مساوات پریکٹس کی جا سکے۔

مساوات کی صحیح سمجھ اور پریکٹس دیکھنی ہو تو مغربی ممالک میں دیکھی جا سکتی ہے۔مساوات کے اصول کے تحت ان کے ہر ملک میں ہر آدمی اپنی جس بھی حیثیت،

پیشے، مقام، میں ہو، برابر کی عزت اور سلوک کا مستحق اس لیے ہوتا ہے کہ ہر ایک کو دوسرے پر کسی کام کے لیے انحصار کرنا ہوتا ہے۔ ملک کا صدر یا وزیر اعظم بھی ایک قومی ذمہ داری یا پیشہ ہے۔ برتری کی نشانی نہیں۔

سبق

اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہمارے ساتھ برابری کی بنیاد پر عزت اور مساوات کا سلوک کریں تو پھر پہلے ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ انسانی برابری، عزت اور مساوات ہی کا سلوک کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔

ہمارا بڑا مسئلہ معاشرتی لیول پر غرور، تکبر ہے اور مذہبی لیول پر اپنے مسلک کو صحیح اور دوسروں کو غلط کہنے سے ناپسندیدگی اور نفرت ہی جنم لے سکتی ہے محبت نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ بقائے باہمی کی بنیادیہ اصول ہے۔ لکم دینکم و لی دین تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ عقائد کے اختلافات کا فیصلہ اللہ نے آخرت میں کرنا ہے۔ ہم نے اس دنیا میں نہیں۔ یہ پالیسی ہوتو پھر ہم ہر مذہب اور مسلک کے انسان سے محبت سے سلوک کریں گے۔

اس سنت پر عمل کرنا بہت آسان ہے کیونکہ یہ ذاتی فیصلہ اور فعل ہوتا ہے۔ جتنے زیادہ لوگ مساوات پریکٹس کرنے لگیں گے تو تبھی معاشرہ بدلے گا۔ اور اللہ کے سامنے بھی سرخرو ہونگے۔ انسانوں کو اللہ کی فیملی سمجھ کران سے اچھا سلوک کریں گے تو ثواب بھی ہوگا اور اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوجائے گا۔ اور دنیا بھی خوشگوار بنجائے گی۔ غیر مسلموں پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔

☆......☆......☆

۲۶۔انصاف یا عدل بھی اہم معاشرتی سنت ہے۔

یہ بھی دراصل مساوات اور سچ کی ہی extension ہے۔ ہر معاملے، رشتے، لین دین، برتاؤ میں برابری اور سچ کی بنیاد پر تعلق سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ ہر فرد اپنے تمام تعلقات میں انصاف سے کام لیے تو وہاں پر پھر مقدمہ بازی نہیں ہوسکتی ۔حکومتی محکمے ہر ایک کے حقوق انصاف سے ادا کرتے ہیں تو اس معاشرے میں ہی امن سکون پیار محبت ہوتا ہے۔ نہ ہی وقت ضائع ہوتا ہے نہ تکلیف ہوتی ہے

کلام پاک:۔(اللہ) انصاف کے دن کا مالک ہے ۔(سورہ فاتحہ) 16-90َ ۔ان اللہ یامر بالعدل و لاجل اللہ تعالیٰ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے ۔(سورہ مائیدہ42) اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان میں عدل کے مطابق فیصلہ کریں بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ (تفسیر) اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو صرف پسند ہی نہیں کرتا بلکہ محبت کرتا ہے۔

(سورہ بقرہ۔آیت48) ’’اور ڈرو اس دن سے جب کوئی آدمی دوسرے کی مدد نہیں کر سکے گا، نہ ہی سفارش چلے گی، نہ ہی کوئی مالی معاوضہ لے کر اسے چھوڑا جائے گا اور نہ ہی کسی کی مدد مل سکے گی۔‘‘

انصاف کا قتل ان چار چیزوں سے ہی کیا جاتا ہے۔ سفارش (تعلقات کو استعمال کر کے سفارش یا جھوٹی گواہی)، پیسے یا مفادات کی رشوت، طاقت سے جان، مال، عزت کے نقصان کا ڈر پیدا کر کے (جج کو قتل کروا دیا تو دوسرے جج کیس لینے سے انکاری ہو گئے)۔ اس لیے اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انصاف کے علم بردار بنو جو تمھارا

کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کیلئے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا یہ مقام ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کو جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ کو اس کی خبر ہے۔'' (نساء آیت 135)

جو انصاف نہیں کرتا، اس بارے اللہ تعالیٰ کا اعلان یہ ہے:

(مائیدہ 44) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ کافر ہیں۔ (45) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ ظالم ہیں۔ (47) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ فاسق ہیں۔ (49) اور تحقیق لوگوں میں سے اکثر فاسق ہوتے ہیں۔ (50) کیا یہ لوگ پھر زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہوگا یقین رکھنے والوں کے نزدیک۔

خشکی و تری میں فساد کی وجہ لوگوں کے اعمال ہوتے ہیں (سورہ روم، 41۔) ''فساد ظاہر ہو کر پھیل گیا خشکی میں اور سمندر میں، یہ سبب اس چیز کے کہ کمایا ہے ہاتھوں لوگوں کے نے، تا کہ چکھادے ان کو بعض (ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے) تا کہ وہ رجوع کریں (باز آ کر پھر جاویں)۔''

فساد سے بچنے کے لئے حکم ہے کہ لیے نیکی میں معاونت اور گناہ میں عدم تعاون کرو۔

(مائدہ 2:5) ''اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

(16:90): ''قیامت کے دن ہر ایک کو انصاف سے اجر دیا جائے گا۔''

انسانوں کی انہی حربوں سے ناانصافیوں کی پریکٹس وجہ سے اللہ تعالیٰ یقین دلا رہا ہے کہ آخرت میں یقینی انصاف ہوگا۔ اور کوئی بھی دنیاوی حربے استعمال نہیں کر سکے گا ہر ایک کے ساتھ مساوات کا سلوک ہوگا یعنی ہر انسان برابر ہوگا۔ کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوگا کہ چھوٹا پکڑا جائے بڑا چھوٹ جائے۔ اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے بھی فرمایا تھا کہ پرانی قومیں اسی لیے تباہ ہوگئیں کہ بڑے چھوڑ دیئے جاتے تھے اور چھوٹوں کو سزا ہو جاتی تھی۔ یعنی بے انصافی کا دور دورہ تھا۔ اس کا پریکٹیکل ثبوت دیکھیں۔ جب جنگ عظیم دوم میں جب انگریز پر بڑا سخت وقت آن پڑا تھا اور جرمنی، انگلینڈ پر بمباری کر کے شہروں کے شہر تباہ کر رہا تھا تو لوگوں نے گھبرا کر مسٹر چرچل سے پوچھا کہ کیا ہم جنگ جیت سکیں گے؟ تو اس نے پوچھا کہ کیا ہماری عدالتیں انصاف کر رہی ہیں تو لوگوں نے اثبات میں جواب دیا اس پر چرچل نے اعتماد سے کہا کہ ہم ضرور جنگ جیت جائیں گے۔ یعنی انصاف پسند قومیں مشکلات سے نکل آتی ہیں کیونکہ لوگوں میں محبت، قربانی اور ایثار کا جذبہ ہوتا ہے۔ کیا ہماری عدالتیں انصاف کر رہی ہیں۔؟ ہماری حالت اس کا جواب نفی میں دے رہی ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے اپنے ملکوں میں انصاف ہی کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ میرٹ اور انصاف پر کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ ہر فیصلے کے پیچھے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ جبکہ غیر ممالک میں اسے مساوات، انصاف، حقوق ملنے کا یقین ہے، اس لیے لوگ وہاں چلے جانے کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مشہور تھا کہ غیر مسلم ممالک کے لوگ مسلمانوں کو دعوت دیتے تھے کہ آئیں اور ہمیں اپنے ظالم حکمرانوں سے

نجات دلائیں۔ انگلش کے پہلے ناول کی ہیروئین اپنے باپ سے کہتی ہے کہ ہمیں مراکش چلے جانا چاہیے کیونکہ وہاں ہمارا مال محفوظ رہے گا، انگلینڈ یا فرانس میں بالکل محفوظ نہیں۔ آج کل الٹ ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہمارے یہاں بے انصافی کا ہر طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ چاہے گھر ہو، سکول، کالج، دفتر، سیاست، تجارت، مذہب ہر شعبہ زندگی استحصال سکھاتا ہے۔ اس لیے ہمارے معاشرے میں بشمول جج، وکلاء کو انصاف کا سینس ہی پیدا نہیں ہوسکا۔ انصاف کے طریقے اتنے مشکل اور مہنگے اور تاخیر کرنے کے ہیں کہ کسی نے صحیح کہا ہے کہ انصاف کے لیے قارون کا خزانہ، حضرت ایوب کا صبر چاہیئے۔

تمام معاشرے کے تمام لوگ بشمول، مذہبی لوگ، اداروں کے کارکن بھی اپنوں کو سزا سے بچانے اور سپورٹ کے لیے نا انصافی کرنے سے نہیں جھجکتے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں انصاف کے علمبردار بننے کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک بیوہ برٹش ماں کو جب شک ہو کہ اس کا بیٹا ایک جرم میں ملوث ہوسکتا ہے تو اس نے پولیس کو ٹیلیفون کر کے بتا دیا اور انھوں نے اس پر نظر رکھ کر گرفتار کرلیا۔ یہ 1992 کی بات ہے میں جب وہاں تھا۔ جبکہ ایک پنجابی فلم میں ایک ماں بھی ایسا ہی کام کرتی ہے تو سارا سینما ہال چیخ اٹھا کہ ''اوئے تو ماں ہے یا ڈائین ہے' اپنے ہی بچے کو کھا گئی ہو۔'' یہ ہے ہمارا معاشرتی انصاف کا عمومی رویہ۔

یہاں گناہ گار رشتہ دار کو جرم کی سزا سے بچانے کیلئے ہر حربہ استعمال کرنا وفاداری کا ثبوت ہوت ہونے کی وجہ سے قابل ستائش اور قابل ترجیح عمل گنا جاتا ہے۔ انصاف کی گھروں میں نہ ہی بات کی جاتی ہے نہ ہی اس کو سراہا جاتا ہے اپنے مفاد کی حفاظت صحیح طرز عمل گنا جاتا ہے اپنوں کی ہر حال میں حمایت ضروری ہے۔ سیاسی جماعتیں، مذہبی جماعتیں، گھرانے، محکمے سب یہی کرتے ہیں پیٹی بھائی کو ضرور بچانا ہے چاہے انصاف کا قتل بھی کر دیں۔ تو پھر ہمارا معاشرہ کیسے ترقی کرسکتا ہے یا سدھر سکتا ہے؟ یہاں یہی حربے استعمال کر کے انصاف سے بچ نکلنے سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا

ہو جاتے ہیں کہ اگلے جہاں بھی کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اپنی تسلی کے لیے وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح نیک لوگوں ،علماء، زاہدوں، وفات پانے والے بزرگوں، سیدوں کو وسیلہ بنانے کے طریقے سے سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد سے بچ جائیں گے۔ انہی غلط خیالوں اور حربوں کی اللہ تعالیٰ نفی فرماتا ہے کہ یہ سارے طریقے اللہ کی عدالت میں نہیں چلیں گے بلکہ یہ سب بزرگ ہر ایک اپنے ہی حساب کتاب میں پریشان ہو گا۔ اس کو دوسروں کا سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہو گی۔ اس لیے مسلمانوں کی سوچ کو درست کرنا ہی صحیح اعمال پر مائل کرنا ہے۔

غالباً امام غزالی کا کہنا ہے کہ اگر کسی بھی کتاب کی جگہ خدا صرف ایک لفظ یعنی انصاف کا حکم دیتا تو تب بھی معاشرے ٹھیک ہو جاتے امن سے رہتے۔ اسی لیے انصاف کرنے والے چار حربوں سے بچنا چاہیے۔ ان سے بچنے کے لیے انگریزوں نے قانون بنایا تھا کہ تمام جج اور مجسٹریٹ کسی کی پارٹی شادی وغیرہ میں نہیں جائیں گے۔ تاکہ نہ تعلقات بنیں، نہ انصاف میں رکاوٹ کا خیال لائیں۔

سبق

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمیشہ آپ کے ساتھ انصاف کریں تو پھر آپ بھی سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کریں۔ اگر ہر گھر سے انصاف کرنا سیکھنا شروع ہو جائے۔ ذاتی لیول پر ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے تو عدالت جانے کی ضرورت پڑے نہیں گی۔ سچی گواہی دیں تو انصاف فوری مل جائے گا تو ہم میں انساف کا سینس ڈویلپ ہو جائے گا۔

”جو قوم اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہ کرے اللہ تعالیٰ ان کے درمیان غربت اور افلاس عام کر دیتا ہے۔“ (معجم الکبیر)

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا پھر تم سے کام دنیا کی امامت کا

☆......☆......☆

۲۷۔ انسانوں کے مختلف ہونے کو نفرت کا باعث نہیں بنایا جا سکتا۔ نہ کسی کو کسی پر فوقیت ہوتی ہے۔

آپؐ کے فرمان کے مطابق کہ کسی گورے کو کالے پر یا عرب کو عجمی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ سوچ رکھنا اور عمل کرنا بھی سنت ہے۔

آپ نوٹ کریں کہ فطرت میں کہیں بھی یکسانیت نہیں ہے۔کوئی دو پھول، درخت، گھاس کے پتے ایک جیسے نہیں ہوتے۔اسی طرح ایک ہی ماں باپ کے بچے مختلف شکل، رنگ، قد، ذہنی قابلیت کے ہوتے ہیں، ایک جیسی فطرت اور عادات بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے مختلف شکل اور رنگ کے انسان، مختلف مذاہب، کلچر، رسوم، زبانیں، فطرت کا ہی ڈیزائین ہیں اور اللہ کی مشیت اور سنت ہے۔ اس لیے مختلف ہونے کی وجہ سے ہم ان سے نفرت نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک پھول سے محبت اور دوسرے سے نفرت نہیں کرتے۔

> ''اختلاف دراصل ذہنی طور پر زیادہ ہوتا ہے جبکہ انسان شکل وصورت میں بھی مختلف ہوتے ہیں مگر اپنی جسمانی ساخت میں بہت کم مختلف ہوتے ہیں۔ ذہنی لحاظ سے اس سے زیادہ، اور جذبات میں سب سے زیادہ اختلاف ہوتا ہے۔ دو آدمی ایک طرح سوچ سکتے ہیں مگر ایک ہی جیسا محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت انتہائی واضح ہے۔ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اسی اختلاف میں مزا ہے۔شعور ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے۔اور ذاتی شعور کا مطلب ہوتا ہے۔''میں''۔''میرا''۔ اس شعور کی اچھائی کا انحصار ہر انسان پر علیحدہ ہوتا ہے مثلاً ایک حبشی کا اپنے

بارے میں شعور مختلف ہوگا۔ بہ نسبت ایک تہذیب یافتہ آدمی کے مقابلے میں۔ ہر انسان فیکٹری کی کار کی طرح نہیں ہوتا۔ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ قدرت خود ہی یکسانیت نہیں چاہتی۔'' (ریفرنس، ''انسانی فطرت''، مسٹر کیسن)

اسی لیے ہر گھر، ہر فیملی، صوبے، ملک کا کلچر مختلف ہوتا ہے۔ ہر گھر میں ایک ہی والدین کی تربیت کے باوجود بچوں کی عادات مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لیے ہر ایک کا بنیادی مذہب ایک ہونے کے باوجود تفصیل میں جاتے مسلک مختلف ہوتا جاتا ہے۔ ایک ہی مسلک کے لوگوں میں بھی بعض معاملات میں سوچیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ذاتی سوچ کی آزادی کا حق ہے جو ہر مرد اور عورت استعمال کرتا ہے۔ اور اس حق کو تسلیم کرنا چاہیے اور برداشت بھی کرنا چاہیے کہ اختلاف رائے دشمنی نہیں ہوتا۔ یہی سوچ کا اختلاف زندگی میں تنوع لاتا ہے۔ نئے آئیڈیاز بھی اسی سلسلے کی کڑی ہوتے ہیں۔ ہر انسان ایک ہی چیز کو مختلف نظر سے دیکھتا ہے۔

اسی کو علامہ اقبال انسانی خودی کہتا ہے کہ کوئی دوسے انسان ایک جیسے تجربات سے نہیں گزرتے اور نہ ان سے اخذ نتائج ایک جیسے ہونگے۔ اسی سے اجتماعی دانش نکلتی ہے۔ جس کے استعمال سے ہی قومیں ترقی کرسکتی ہیں۔ ہم اجتماعی دانش پر یقین نہیں رکھتے ہم افراد کی سوچ کے ذہنی غلام بن جاتے ہیں۔ یعنی صدیوں سے شخصیت پرستی پریکٹس کررہے ہیں۔ اور آج بھی ذہنی آزادی کے قائل نہیں ہوئے۔

اسی تفاوت کی وجہ سے لیے ہر ملک میں یکساں فیملی لاز نہیں ہوسکتے مگر ملکی قانون ایک ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ صرف مثبت سوچوں کو بقا ہوتی ہے۔ وہی اتحاد اور اتفاق کا باعث بنتی ہیں۔

مودی نے ہندواتا پروگرام کے تحت انڈیا میں ملکی لیول پر یکسان فیملی لاز کی ڈیماند کی تھی مگر خود ہندوؤں نے ہی اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہاں تو اتنی زیادہ قومیں، زبانیں، ہندو مسالک، رسوم ہیں کہ یکساں فیملی لاز بنائے ہی نہیں جاسکتے۔ یہ مخالفت، مذہب کی بنا پر نہیں کی گئی تھی بلکہ غیر فطری ہونے کی بنا پر کی گئی تھی کیونکہ فطرت کا پورا نظام

یکسانیت نہ ہونے اور تنوع کے اصول پر قائم ہے۔کوئی بھی فطرت سے لڑ کر جیت نہیں سکتا، چاہے فرد ہو یا حکومت۔ کامیابی اور امن سکون فطرت سے موافقت پر ہوتی ہے۔ فطری اصولوں کو دیکھیں کہ؛۔ امن کو بقا ہے، جنگ کو نہیں ؛۔ عدل بہ نسبت ظلم قائم رہے گا۔تواضع کو بقا ہے، تکبر کو نہیں۔ متکبر کی عزت بھی نہیں کی جاتی ۔فراخ دلی کو بقا ہے تنگ نظری کو نہیں۔لوگ فراخ دل کو قبول کرتے ہیں تنگ نظر کو نہیں۔

تاریخ میں بہت سے لوگوں، ہلاکو، ہٹلر سٹالن، نادر شاہ، بھٹواور شاہ ایران نے اپنی مرضی سے نقشہ بدلنا چاہا تو ہمیشہ ہار گئے۔ یکسانیت صرف ملکی قوانین میں ہونی چاہیے جو تمام مذہب، کلچرز پر مساوات کے اصول کے تحت لاگو ہو کیونکہ اتفاق اور اتحاد صرف کامن مقصد اور مستقبل کی بنیاد پر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی حکومت میں تمام مختلف قبائل، مذاہب، میں میثاق مدینہ کی بنیاد ملکی شہریت، کامن مستقبل، اندرونی امن، بیرونی جارحیت کے خلاف متحدہ جدوجہد کو بنیاد بنا کر سب کو ایک امت قرار دیا تھا۔ جبکہ یہ سب گروپ اپنے مذہب اور قبائلی کلچر پریکٹس کرنے میں آزاد تھے۔سٹیٹ اس میں دخل نہیں دیتی تھی۔

مندرجہ ذیل آیت کے مطابق اختلاف کا مقصد ہی یہ ٹسٹ کرنا ہے کہ اختلاف کے باوجود، ایک دوسرے سے انسان ہونے، اللہ کی عیال ہونے کی بنا پر۔ بہترین سلوک کرتے ہو یا کہ نہیں۔اللہ تعالیٰ کو تنوع پسند ہے۔ہمیں بھی پسند ہونا چاہئے۔ ہر ایک کے پیغمبر کے لیے علیحدہ شریعت بھی پروگرام کے مطابق تھی۔

Verse (5:48)- To each of you We prescribed a law and a method. Had Allah willed, He would have made you one nation , but [He intended] to test you in what He has given you; therefore strive with one another to hasten to virtuous deeds;

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ اگر میں چاہتا تو سب ایک ہی مذہب پر ہوتے۔ مذہب کے اختلاف کا فیصلہ صرف قیامت کے دن ہوگا کہ کون صحیح ہے

اور کون غلط۔اس لیے اس دنیا میں نسل، زبان، رنگ، علاقے، مذہب، مسلک کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ایک دوسرے سے تعلق کی بنیاد صرف اور صرف انسانیت ہو سکتی ہے کہ ہم سب آدم کی اولاد ہیں۔قدرتی تنوع کو انجوائے کرنا چاہیے، تبھی زندگی کا مزہ آتا ہے۔جو بھی سیاسی، معاشرتی، نسلی، مذہبی لیڈر اپنی لیڈری چمکانے کے لیے اختلافات کو ہوا دے اور اپنے کو صحیح اور برتر قرار دے کر دوسروں سے نفرتیں سکھائے، عوام کو اسے رد کر دینا چاہیے کیونکہ وہ ہماری دنیا خراب کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

سبق

ہم مسلمانوں کو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت بن کر اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اس لیے ہمیں تمام انسانوں کو مذہب کی بجائے اللہ کی مخلوق، عیال اور اپنے انسانی بھائی سمجھ کر تعلق قائم کرنا چاہیے تا کہ ہم ان کو کردار سے متاثر کر سکیں تا کہ وہ اللہ کے پیغام کو سمجھنے پر مائل ہو جائیں۔

اس سنت پر عمل کرنا بہت آسان بھی ہے اور قدرے مشکل بھی۔آسان اس طرح کہ یہ ذاتی فیصلہ ہوتا ہے، کہ آج سے میں نے انسانوں سے محبت کرنی ہے۔تو کچھ عرصہ شعوری سوچ سے پریکٹس شروع کریں گے تو پھر عادت بن جائے گی۔جبکہ فیملی اور دوستوں، کام کے ساتھیوں کی طرف سے مخالفت سے مشکل آ سکتی ہے۔

☆......☆......☆

۲۸۔ملک کے ساتھ محبت کرنا سنت ہے۔

حدیث: ''حب الوطن من الایمان'' وطن کی محبت ایمان میں سے ہے۔

(Hubbul-Watan Min al-Eemaan)Translation: "Love of one's homeland (country) is from faith"Source: Kashf al-Khafa' wa Muzil al-Ilbas (1102), al-Silsilah al-Hadeeth ad-Da'eefah (36) and reported by al-Saghaanee in his al-Mawdhoo'at (81)

اگر چہ اس حدیث بارے اختلاف ہے کہ یہ ضعیف ہے، بعض کہتے ہیں یہ صرف قول ہے۔مگر چاہے یہ ضعیف حدیث ہو، یا قول، اپنی جگہ یہ ایک سچائی اور حقیقت بیان کر رہی ہے۔اگر کسی ضعیف حدیث میں بھی سچائی بیان ہو رہی ہو تو اسے سچ مان لینا چاہیئے

وطن گھر کی طرح ہوتا ہے۔ جو ایک قطعہ زمین سے منسلک ہوتا ہے۔وہ ہماری ملکیت ہوتی ہے۔اسی کے اندر ہماری زندگی پروان چڑھتی ہے۔یہی ہماری پہچان ہوتا ہے اسی سے عزت ہوتی ہے۔اسی میں حفاظت ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر عورت کی پہلی خواہش اپنا مکان ہوتا ہے جس میں رہ کر بچے پال سکے۔گھر کی حفاظت کے لیے گھر والے جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔

بڑے لیول پر ہر ایک کے لیے بقاء کے لیے ایک وطن کی ضرورت ہوتی ہے۔دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری پہچان چونکہ وطن سے ہی ہوتی ہے کہ ہم کون ہیں۔وطن ہی جائے پناہ ہوتی ہے، وہیں پر زندگی گزارتے ہیں یعنی ملک بھی ہم سب کا

اجتماعی گھر ہی ہوتا ہے۔اس لیے اس سے محبت اور وفاداری ایسی ہی ایک سوشل حقیقت ہے، جیسے گھر سے محبت، اور اس کی حفاظت اور طاقتور بنانے کے لیے ہر ایک کو جو کچھ بھی بن آتا ہے کرتا ہے۔اور کرنا چاہیے۔یہ ایک سوشل اور معاشرتی سچائی ہے۔آبائی گاؤں، شہر یا ملک چھوڑنا بڑی جذباتی قربانی مانگتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے بھی مکہ چھوڑتے دکھ محسوس کیا تھا اور اس کا اظہار بھی کیا تھا۔اس لیے ہی میں نے اسے سنت یا اسوۂ حسنہ کے سلسلے میں شامل کیا ہے۔

بیعت عقبہ ثانی میں مدینہ کے وفد نے ابوالہیثم کے ذریعے ایک خدشے کا اظہار یہ کہہ کر کیا تھا کہ ''یا رسول اللہ ہم یہود کے حلیف ہیں اور اس بیعت کے بعد ہمارے ان سے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔کہیں ایسے نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن واپس لوٹ جائیں تو آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں، تمہارا خون میرا خون ہے تم میرے اور میں تمہارا ہوں۔'' (میثاق مدینہ۔ طاہر القادری، صفحہ ۳۸) اس سے بہتر ثبوت میں کیا پیش کر سکتا ہوں کہ وطن کی محبت ایک حقیقت ہے اور یہ کہ حدیث متن کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔کہ وطن سے محبت ہر انسان کے دل میں ایمان کا حصہ ہوتا ہے۔میثاق مدینہ کا معاہدہ بھی ایک نئے وطن کے ساتھ تھا جس کا دفاع سب نے، بشمول یہود نے کرنا تھا۔کیونکہ مدینہ کی سٹیٹ کے سب رہنے والوں کا وطن تھا۔اس سے ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ اگر کوئی ترک وطن کرتا ہے تو اس کی وفاداری نئے وطن کے ساتھ ضرور ہونی چاہیے کیونکہ وہ اس کے مستقبل کا محافظ ہوتا ہے۔اگرچہ آبائی وطن کے ساتھ جذباتی تعلق رہنا بھی قدرتی امر ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے کہ اللہ اور رسول کے علاوہ حاکم وقت کی اطاعت کرو۔''اے ایمان والو؛ حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا، اور جو اختیار والے ہیں تم میں۔'' (نساء۔5)

تو حاکم کسی ملک اور قوم کا ہی ہوتا ہے اور اس کی زمینی حدود کا بھی تعین ہوتا ہے، جب کسی سے پوچھا جائے تو وہ اپنی پہچان اپنا ملک ہی بتاتا ہے۔جیسے ہماری پہچان دنیا

میں پاکستانی کی ہے تو پھر اپنے ملک سے محبت، اس پر ایمان یا دوسرے الفاظ میں یقین ہی کا درجہ رکھتی ہے۔اور یہ حدیث ایک انسانی فطرت کو ہی بیان کرتی ہے۔

ہمارا اپنے وطن اور ملک سے محبت کا انداز بھی صرف جذباتی اور شوشا والا ہے۔ محبت کا اظہار صرف ترانے گانا، یوم آزادی پر چراغاں، پریڈ، ہر جگہ جھنڈیاں لگانا، ٹی وی پر وطن سے محبت کے گانے تک محدود ہو گیا ہے۔غرضیکہ مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح سے ہماری محبت کے اظہار کے دعوے شوشا پر مبنی ،جعلی اور جذبات پر مبنی ہیں۔اسے ہی جاہلیت کہتے ہیں۔ وطن دراصل مشترکہ گھر ہوتا ہے جس میں ہی ہم سب مل کر زندگی گزارتے ہیں۔جیسے کہ ذاتی گھر ماں باپ، بچوں سب کا مشترکہ ہوتا ہے،کوئی فرد بھی گھر کی کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچاتا۔گھر کی عزت کی بھی حفاظت کی جاتی ہے۔اس کو بتدریج ترقی دی جاتی ہے۔ یہ تب ہو سکتا ہے کہ اسے اپنا سمجھا جائے۔وطن کو بھی اپنا گھر سمجھنا بڑا ضروری ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرون دریا کچھ نہیں

ہم ملت کو صرف مذہبی اُمہ سمجھتے ہیں جبکہ یہ ملک کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔اس غلط خیال سے نکلنے کی ضرورت ہے۔

انگریزوں کی حکومت کے دوران، ہر ایک سرکاری چیز کو دشمن کی ملکیت سمجھتا تھا اور اسے نقصان پہنچانے سے اسے کبھی جرم یا گناہ کا احساس نہ ہوتا تھا بلکہ اسے نیکی سمجھتا تھا۔ بدقسمتی سے ہم میں اب بھی وہی سوچ کارفرما ہے کہ حکومت ہماری نہیں۔ہمیں یہ سوچ بدل لینی چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ اپنے ملک کی ہر چیز کے لیے پیسے ہم نے ہی اپنی جیب سے دیئے ہیں۔اگر ہم جلوسوں کے دوران کوئی توڑ پھوڑ کرتے ہیں تو ہم اپنی ذاتی ملکیت کو ہی نقصان پہنچا رہے ہیں اور حکومت اس کو دوبارہ بنانے کے لیے ہماری جیبوں سے پیسے نکالے گی۔کیا کوئی غصے میں آ کر کبھی گھر کی چیزوں کو بھی نقصان اٹھاتا ہے۔؟

قائداعظم نے اسی لیے فرمایا تھا کہ ''قومی خدمت اوراحساس ذمہ داری کے شعور کی نشوونما، یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم آنے والی نسلوں کو پورے طور پراس قابل بنادیں کہ وہ اقتصادی زندگی کے مختلف شعبوں میں اس طرح حصہ لیں کہ جو پاکستان کے لیے باعث عزت ہو۔'' (کراچی ۲۷نومبر۱۹۴۷۔تعلیمی کانفرنس سے خطاب)

بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں میں احساس ذمہ داری پیدانہیں ہوسکا اورانہوں نے ابھی تک ہم عوام کواپنانہیں سمجھا بلکہ اپناغلام سمجھتے ہیں، یہ چوہدری بننے کی خواہش کے مائینڈ سیٹ کا نتیجہ ہے جبکہ جمہوری حکمران قوم کا خادم ہوتا ہے۔سیدالقوم خادمھم۔اسی لیے انہوں نے ستر سال ضائع کر دئے ہیں اور بنیادی ضروریات یعنی پانی،بجلی،گیس، سستی خوراک،تعلیم کو یقینی نہیں بنایا۔ نہ ہی ٹیکس کے پیسوں کو امانت سمجھا ہے بلکہ ملکی خزانے کو باپ کی جاگیریا ملکیت سمجھتے ہیں۔

عوام کوبھی سمجھ لیناچاہیے کہ حکومت جب بھی ترقیاتی کام کرتی ہے جیسے سڑک بنانا،سکول کھولنا،گیس مہیا کرنا،تو یہ وہ ہم پراحسان نہیں کررہے ہوتے، بلکہ ہمارے ٹیکس کے پیسوں سے ہماری خدمت کرنااس کا فرض تھااسی لیے ہم نے انہیں ووٹ دے کراپنا حکمران خود بنایا تھا۔تو یہ ہماراعوام کا ان پراحسان ہے جس کے بدلے وہ ہمارا خیال رکھیں گے۔اور ملک اور وطن کو ترقی دینے،اور ہر لحاظ سے طاقتور بنانے میں کوشش کریں گے۔اگرنہیں کرتے تو پھر ہمیں اگلے الیکشن میں ان کو رد کر دینا چاہیےاور بار بار دھوکہ نہیں کھانا چاہیے بلکہ نئے آدمی کو لانا چاہیےتو تبھی نئے کو نصیحت ہوجائے گی کہ اگرعوام کی خدمت نہ کی تو مجھے عزت نہیں دیں گے۔

وطن سے اصل محبت تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے، نہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جس سے ملک،قوم،اس کے شہریوں کو معاشرتی، مالی جذباتی،نقصان پہنچے۔ ملک،اس کے نام کی شہرت کو نقصان نہ پہنچے۔پاکستانیوں کی پہچان کو نقصان نہ پہنچے۔ اپنے اچھے کردار سے ملک کی نیک نامی کا باعث بنیں،ملک کو معاشی،معاشرتی،لحاظ سے مضبوط بنائیں اور ہر شہری ملکی قانون پر سختی سے عمل کرے،اسی کا ہمیں حکم بھی ہے،جب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے ایمان والو؛ حکم مانو اللہ کا، اور حکم مانو رسول کا، اور جو اختیار والے ہیں تم میں۔'' (نساء۔5)

''اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔'' (سورہ بقرہ۲۔۲۸۴) یہ حکم اللہ، اس کے رسول ﷺ اور حاکم وقت سب کے احکام کے لیے یکساں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملک، میں حاکم وقت ہی نے اس دنیا کی زندگی کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ وہی قوانین بناتا ہے وہی عمل کرواتا ہے۔ اور اختلاف رائے میں فیصلے کرتا ہے۔ وہی عوام کے مسائل حل کرتا ہے۔ اسی کے پاس عوام اپنے مسائل لے کر جاتے ہیں۔ اسی طرح ملکی قوانین کے تحت ہی دوسرے ادارے قوانین بناتے ہیں۔ جو کہ لوگوں کی زندگیوں، ان کی جان، مال، عزت کی حفاظت اور آسانیوں کے لیے ہوتے ہیں۔

اس لیے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس آیت کے مطابق ملکی قوانین پر عمل کرتے دراصل ہم اللہ کے حکم کی ہی فرمانبرداری کر رہے ہوتے ہیں اور اس لیے ملکی قوانین پر عمل پر اسی طرح ثواب بھی ملے گا، جیسے دوسرے مذہبی احکام پر ثواب بیان ہوا ہے۔ اور ساتھ ہی دنیا بھی جنت بن جائے گی۔

بدقسمتی سے ملکی قوانین پر عمل سے ثواب ہونے کا ہمیں گھر، سکول، مسجد میں بتایا ہی نہیں جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین اس پر خود سوچ کر، پوچھ کر اس اہم نظریئے کی تشہیر کریں گے کہ ملکی قوانین پر عمل آخرت میں کامیابی میں مدد دے گا اور ملک بھی پر امن ہو جائے گا۔ مغربی ممالک میں لوگ ملکی قوانین پر دل سے عمل کرتے ہیں۔ مثلاً چاہے پولیس والا کھڑا ہو یا نہ ہو، چاہے دن ہو یا رات ہو۔ چاہے ٹریفک بہت ہو یا بالکل نہ ہو تو سرخ لائٹ ہو تو ٹریفک لائٹ پر رک جاتے ہیں۔ ان کی جگہ ہم ہر جگہ خود فیصلے کرنے لگتے ہیں کہ ٹریفک نہیں ہے تو ریڈ لائٹ کے باوجود نکل جاؤ۔ ہم ہر وقت جلدی میں ہوتے ہیں۔ اگر مغربی ممالک کے لوگ عمل کرتے ہیں، تو وہ بے وقوف تو نہیں، وہ عقل مند ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے عادت توڑی تو انہیں قانون توڑنے کی عادت پڑ جائے گی۔

تمام پیغمبر اسی لیے بھیجے جاتے تھے تا کہ وہ دنیا میں مثالی معاشرہ قائم کر کے دکھائیں اور اس دنیا کی زندگی کو امن اور سکون کی جگہ بنائیں۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نصیحت کی ہے کہ دعا مانگو۔ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی آخرة حسنة کہ دنیا میں اچھے اعمال، حقوق العباد کی ادائیگی اور معاملات کی درستگی سے جنت کے مستحق بنیں۔یعنی دنیا ہی جنت کے لئے jumping ground ہے۔

ملکی ترقی، طاقت کے لیے قومی غیرت کا نظریہ سمجھنے کی ضرورت ہے

جیسے ہم اپنے نبی کی صرف ظاہری نقل کرتے ہیں اور اسوۂ حسنہ جیسے اخلاق، کردار کی مضبوطی کی فکر نہیں۔حقوق العباد اور معاملات بہت ہی خراب ہیں۔اسی طرح ہم مغرب کی بھی صرف ظاہری باتوں کی نقل کرتے ہیں۔ہم آج تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ مغربی مما لک کیوں ترقی یافتہ ہیں۔آدھا ملک کھونے کے باوجود نہ ہی ہم نے قومی عزت اور غیرت کا صحیح ادراک کیا ہے کہ کیا ہونی چاہیے او بدلے لینے یا بقیہ حصے کی حفاظت اور ترقی اور طاقتور بنانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔اور کونسی قومی عادات اپنانی چاہئیں۔ذاتی اور قومی زندگی کن اصولوں پر مبنی ہونی چاہئے۔

یہ سمجھنے کے لیے میں جاپان کی مثال دینا چاہتا ہوں کہ اس نے دو دفعہ شکست کھانے کے باوجود، صرف قومی غیرت اور مقاصد کی یک جہتی کی وجہ سے کیسے پھر سے طاقت ور بنے ہیں۔جب 8، جولائی 1853 کو، جاپان کا ملک، امریکہ کے کموڈور پیری کے صرف چار بحری جہازوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اسے ہار مان کر امریکہ کی من مانی شرائط پر صلح کرنی پڑی اور جاپان کو امریکی تجارت کے لیے کھولنا پڑا جو امریکہ کا مقصد تھا۔مگر اس بے عزتی سے جاپان کے باشندوں میں قومی غیرت اتنی جاگی تھی کہ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ہم نے ان کے مقابلے کی قوم بننا ہے تو سب سے پہلے مرحلے میں انہوں نے بغاوت کر کے پرانی تمام لیڈر شپ سے جان چھڑالی اور نئے رہنما چنے۔

اس کے بعد نئے لیڈروں نے باقاعدہ سٹڈی کر کے صحیح نتیجہ نکالا کہ جاپان کی

نیشنل سوچ، ملکی تنظیم اور ادارے، اس کی فکری، ملکی سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی تنظیم، بہت پرانی اور دقیانوسی ہیں جو موجود وقت کے مطابق نہیں ہے اور یہ کہ اسے بدلے بغیر وہ کبھی بھی مغرب کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ مقابلے کے لیے ہر قسم کی سوچ، فلاسفی، سیاسی، معاشی اور فوجی طاقت اور ہتھیار ہر لحاظ سے دشمن کے برابر کے ہونے چاہئیں صرف تب جذبہ کام آ سکتا ہے۔ صرف جذبے کے زور پر جنگ نہیں جیت سکتے۔

تیسرا نتیجہ یہ نکالا کہ ہم صرف اپنے دشمن امریکہ اور مغربی ممالک سے ہی سیکھ کر ترقی کر سکتے ہیں کیونکہ سب مشرقی ممالک یا خود بھی پسماندہ ہیں اور یا ان پر مغربی طاقتوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ ان سے سیکھنا ممکن نہیں ہے۔

یہ سوچ کر انہوں نے امریکہ کے علاوہ انگلینڈ، فرانس، ہالینڈ سے مدد مانگی۔ اور ہر فیلڈ میں ان ممالک کے استاد جاپان آئے اور جاپانی سٹوڈنٹ وہاں گئے اور ہر شعبے میں خصوصاً صنعتی تیز رفتار ترقی کو ممکن بنا سکے۔ (جیسے ہم نے بھی ایوب خان کے دس سالہ دور میں کر کے دکھا دیا تھا مگر ہم قومی مقاصد کو بھول گئے۔) اور صرف تیس سال میں مغرب کے مقابلے کی معاشی، فوجی طاقتور قوم بن گئے اور ہر فیلڈ میں برابری کرنے لگے۔ 1895 میں یعنی شکست کے صرف چالیس سال بعد جاپان اتنا ترقی یافتہ اور طاقتور ہو چکا تھا کہ اس نے چین کو شکست دے کر کوریا پر قبضہ کر لیا۔ اور 1905 کی جنوری میں روس کے بحری بیڑے کو شکست دی، جس سے تمام مغربی دنیا حیران رہ گئی کہ مشرقی ممالک میں سے صرف جاپان اب ان کے مقابلے کی پاور بن گیا ہے۔

جاپان نے دوسری بار جنگ عظیم دوم میں شکست کے بعد بھی پرانا طریقہ استعمال کیا اور اپنے دشمن امریکہ کی ہی مالی مدد سے پھر اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر وہ پھر سے دنیا کی ایک بڑی معاشی قوت بن گیا۔ چین بھی ہم سے دو سال بعد آزاد ہو کر دنیا کی بڑی طاقت بن گیا ہے۔ اس نے بھی جاپان کی طرح تمام پرانے ملکی سسٹم بدل دئے اور مغربی طریقے اپنا لئے۔

ہم نے بھی ایوب خان کے دور میں صرف دس سال میں بے پناہ ترقی کی تھی۔

جنوبی کوریا نے ہمارے ہی دو پانچ سالہ منصوبے لے کر ترقی کی بنیاد رکھی تھی اور ہم سے سیکھ کر معاشی قوت بن گیا ہے۔ مگر ہم سے یہ غلطی ہوئی کہ ہم نے مغربی ممالک کی ترقی یافتہ ہونے کی اصل وجہ معلوم نہ کر سکے۔ نہ ہی سر سید احمد خان کی مثال سے سیکھا کہ علی گڑھ کی تعلیم اور تربیت پر مبنی انسان سازی پاکستان موومنٹ کی کامیابی بنی تھی۔ نہ ہی جاپان ماڈل کو چنا بلکہ امریکی مشورے پر صرف صنعتی ترقی کی طرف توجہ دی اور انسان سازی کی طرف توجہ نہ دی۔ جو کہ عورتوں مردوں کی یونیورسل تعلیم اور کردار سازی، ذاتی لیول پر سچ اور امانت سے شروع ہوتی ہے۔ اور معاشرتی لیول پر مساوات، انصاف، اخلاق، حقوق العباد، معاملات، پیشہ ورانہ تعلیم، تربیت، معاشی ترقی، صنعت کاری، ایکسپورٹ پر مبنی آمدنی وغیرہ پر ختم ہوتی ہے۔ مذہب کو ذاتی لیول پر پریکٹس کیا جاتا ہے۔ معاشرے کی سوشل تنظیم نو کی طرف توجہ نہ دی اور نہ ہی مغربی ممالک کی مدد سے فوری طور پر تمام ادارے ان کے سٹینڈرد کے بنائے۔ یو، اے، ای کے عرب ممالک نے بھی 1971 میں آزاد ہونے کے بعد، ملک کو ترقی دینے کے لئے، مغربی ممالک سے ہی مدد لے کر تیس سالوں میں یورپ کے برابر ترقی یافتہ بن گئے ہیں۔ مگر ہمارے سیاسی اور مذہبی لیڈررز، آج تک یورپ کے برابر آنے کا شوق بھی پیدا نہیں کر سکے۔

ترقی کے یہ سب سوشل ماڈل ہمیں نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں ملتے ہیں مگر ہم نے اس سے کچھ نہیں سیکھا۔ آپ کو پتہ تھا کہ مدینہ کی تیز رفتار تجارتی اور معاشی ترقی کے لیے امن کی ضرورت تھی، تو آپ نے ظاہری طور پر کمزوری دکھا کر بھی صلح حدیبیہ یا دس سالہ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ten years no war pact کیا تھا۔ اسی سے تجارت میں رکاوٹیں دور ہوئیں اور مدینہ کے لوگ مالی اور معاشی لحاظ سے خوش حال اور طاقتور ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کو علم تھا کہ معاشی ترقی سے ہی فوجی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اسلام پھیلانے، سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے سیاسی طاقت چاہیے تھی جو اس معاہدہ سے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت تسلیم کروالی گئی تھی۔ یہ سب اقدامات اس دنیا کی زندگی بہتر بنانے کے لیے کیئے گئے تھے۔ خلفائے راشدین

کی فتوحات کا سلسلہ بھی ترقی اور غلبے کے شوق کا ہی ثمر تھا۔

اگر آج ہم بھی، جاپان اور صلح حدیبیہ کی طرح وقتی طور پر انا کی قربانی دے کر ،طاقتور بننے کے،قومی مقاصد کو اپنا لیں، اور امن اور حقیقت پسند پالیسیاں لے کر شروع ہوئے تو ہم انشاءاللہ بیس سال بعد جا کر طاقت ور بن سکیں گے۔ یہ بالکل ممکن ہے مگر اس کے لیے سیاسی، مذہبی، معاشی، علمی رہنماؤں میں مقاصد کی یک جہتی ہونا ضروری ہے۔ جو بدقسمتی سے نہیں ہو رہی۔ ہم ذاتی مفادات کے لیے آپس میں ہی لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ہم بھول گئے ہیں کہ یہ ملک ہم نے کتنی مشکلوں اور قربانیوں سے بنایا ہے۔ قائید اعظم اس بارے کہہ گئے ہیں:

> Making of Pakistan was a difficult task; I could not have accomplished it alone. It was Rohani Faiz of Rasulullah(Saw) that Pakistan came into being.Now it is the responsibility of every Pakistani to make it an example of khilaft e Rashida.(Ziarat 1948)

> ''خیالی دنیاؤں سے نکل آئیں اور اپنے دماغ ایسے پروگراموں کے لیے وقف کر دیں جن سے زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے لوگوں کے حالات بہتر ہوں صرف اسی ہی صورت میں ہم اتنے مضبوط اور طاقتور ہو سکیں گے تا کہ ان مخالف اور ضرر رساں قوتوں کا مقابلہ کر سکیں جو ہمارے خلاف کام کر رہی ہیں۔'' قائداعظم

اس ملک کو ترقی دینا ہمارا ہی کام ہے جو ہم بھول گئے ہیں۔ یہ کتاب یاددہانی کر رہی ہے کہ اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ ورنہ قیامت کے دن جواب دہی ہو گی۔

جیسے ہر گھر کے فرد کے عمل سے ہی گھر کی عزت بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے، اسی طرح ہر پاکستانی کے ہر عمل سے ہی ہماری عزت بڑھے گی یا گھٹے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو کسی کے نام کا پتہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی پہچان کے حوالے سے سب کو جنرلائز کر کے اچھا یا برا کہتے ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ گورے ایسے کرتے ہیں، جاپانی بڑے محنتی ہیں وغیرہ۔ اسی طرح باہر کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ پاکستانی ایسے ہیں، ویسے ہیں۔

مسلمان دہشت گرد ہیں۔ اس لیے ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ انٹرنیشنل لیول پر ہماری دو پہچانیں ہیں۔ایک پاکستانی ہونا، دوسرے مسلمان ہونا۔ان دونوں پہچانوں کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

سبق:

ہم میں سے ہر ایک مرد اور عورت کو چاہیئے، کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر، اپنے ملک سے بھی وفاداری کا حلف اٹھائیں تا کہ ہمیں یاد رہے کہ یہی ہمارے مستقبل کا ضامن ہے۔ یہی دنیا میں ہماری پہچان ہے۔اس کے ساتھ وفاداری ہی سے ہم اپنے تمام ہم وطنوں سے محبت کا سلوک کر سکیں گے جس سے ہماری دنیاوی زندگی جنت بن سکتی ہے،جس کے لیے **فی الدنیا حسنۃ** کی دعا کرنے کی خدائی نصیحت قرآن میں پہلے سے موجود ہے۔ دنیا کو جنت بنانے کی خواہش اور شوق پیدا کرنا حکم ہے۔

مدینہ منوہ میں اسوۂ حسنہ کا زیادہ حصہ معاشرتی، معاشی، کردار سازی، امن، محبت پر مبنی ہے مگر ہم اسے صرف مذہبی لحاظ سے سٹڈی کرتے ہیں جو بالکل غلط سوچ ہے۔ مثلاً آسان حل تلاش کرنے کی معاشرتی سنت کو ہی سٹڈی کرتے تو ہم ملکی سسٹم بناتے عوام کی سہولت اور آسانی کو ترجیح دیتے تو سب سے پہلے بنیادی ضروریات، پانی، بجلی گیس کی فراہمی کو یقینی بنایا جاتا جبکہ ان تینوں کی ہمارے حکمرانوں کو آج بھی فکر ہی نہیں۔اسی طرح آبادی کے بڑھنے کے ساتھ باقی سہولیات جیسے سکولوں ہسپتال کی تعداد بڑھائی جاتی۔ اسوہ حسنہ کو نئے انداز سے دنیاوی ترقی کے لیے سمجھنے کے لیے سوشل سائینٹسٹ کو آگے آنا پڑے گا اور معاشرتی زندگی کی تنظیم نو کرنی ہوگی۔ جیسے میں نے ان چند سنتوں کو سامنے لا کر دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ان کو ہم نے زندگی میں کیسے استعمال کرنا ہے۔ یہ ہم جیسے سب عام مسلمانوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ خود بھی سٹڈی کریں اور اپنی زندگیاں بہتر بنائیں۔اور علماء کرام کا بھی ہاتھ بٹائیں۔

☆......☆......☆

۲۹۔ملک کے باشندوں سے محبت بھی سنت ہے

جب وطن سے محبت ایمان کا حصہ ہے تو وطن کے تمام باسیوں اور رہنے والوں سے اور اس ملک کی ہر چیز سے محبت بھی نیچرل اور ایمان کا حصہ بن جاتا ہے کیونکہ ملک تو انسانوں سے ہی بنتے ہیں۔اس لیے محبت کی بنیاد یہ ہونی چاہیے۔

ملک تمام شہریوں کی جان، مال عزت کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ان کے مستقبل کی ضمانت بھی۔اور اس کے بدلے تمام شہری ملک چلانے کے لیے ٹیکس دیتے ہیں۔۔شہری ملک کی ترقی میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں، اس کی حفاظت کے لیے سب مل کر جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔اس لیے ان کی آپس میں یک جہتی، محبت یقینی بنائی جاتی ہے جو ان کے حقوق برابر ہونے سے بنتی ہے جیسے اپنے ذاتی گھر کے ہر فرد سے محبت برابری کی بنیاد پر ہوتی ہے۔اسی سے sense of belonging ڈویلپ ہوتی ہے۔اپنا ہٹ کا پتہ لگتا ہے۔وفاداری جنم لیتی ہے۔مشترکہ مفادات کا احساس ہوتا ہے۔

ہر ملک میں تیز رفتار ترقی کے لیے امن ضروری ہوتا ہے اور اس کے لیے آبادی میں محبت اور اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک مشترک مقصد کا ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے، جو کہ سب شہریوں کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتا یعنی ملک کے شہری ہونا اور وطن سے منسلک سب کا مشترکہ مستقبل ہی بنیادی قومی مقصد ہو سکتا ہے۔

ہم نسلی اعتبار سے اپنی پہچانیں بناتے ہیں جیسے صدیقی، فاروقی، عثمانی اور مذہبی لحاظ سے حنفی، شافعی، اور روحانی لحاظ سے قادری، نقشبندی وغیرہ۔ یہ سب کی سب ہمیشہ ماضی کی کسی ہستی کی طرف نسبت رکھتی ہیں اور قومی لحاظ سے ہماری پہچانیں عربی، افغانی، ایرانی وغیرہ۔اس اصول سے ہم اس دنیا میں ایک دوسرے سے تعلقات رکھنے کے لیے

یہ پہچانیں بنائیں گے۔

قومی لحاظ سے پاکستانی، جس میں ہر نسل، زبان، کلچر، مذہب کے لوگ شامل ہونگے۔ اس دنیا میں انسانی بقاء کا جذبہ سب سے اہم ہوتا ہے یہ اس دنیا میں بقاء کے لیے سب سے اہم پہچان ہے اس لیے ملک کے ساتھ ہماری وفاداری بغیر شک وشبہ کے ہونی چاہیئے۔ اور ہر شہری ہمارے لیے اہم ہونا چاہیئے۔ اس کی جان مال، عزت کی حفاظت سب کی مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ اس لیے شہری ہونے کے ناطے ہمیں پاکستان کے ہر شہری سے محبت کرنی چاہیئے

اسی لیے مغربی اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں باشندوں کے آپس میں تعلق کی بنیاد ہمیشہ ملکی شہریت ہی ہوتی ہے۔ اور مذہب، زبان، نسل، کلچر، ذاتی ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ اس فلاسفی کی بنیاد ہمارے نبی کریم ﷺ نے میثاق مدینہ کے ذریعے ہی رکھی تھی جس کو مغرب، ''دنیا کے پہلے تحریری آئین'' کے طور مانتی اور اپنے لاء کالجز میں پڑھاتی ہے کہ اسی سے مختلف قسم کے لوگوں میں امن اور محبت پیدا کی جاسکتی ہے۔

ہماری ملکی آبادی میں بھی مختلف مذاہب، مسالک، نسل، زبان اور کلچر کے لوگ بستے ہیں۔ ہم بھی ایک مشترک مقصد کے تحت ہی دوسرے سے اتفاق، اور محبت سے تبھی رہ سکتے ہیں کہ ہمارے تعلق کی بنیاد بھی میثاق مدینہ کی سنت پر مبنی ہو اور صرف اور صرف انسان ہونا اور پاکستانی شہری ہونا آپس میں تعلق کی بنیاد ہو۔ مذہب، مسلک، کلچر، زبان کی پریکٹس ذاتی ہی رہنی چاہیئے۔

اسی میثاق مدینہ کو بنیاد بنا کر اور اسوۂ حسنہ اور سنت پر عمل کرتے ہوئے قائداعظم نے آزادی کے بعد فرمایا تھا؛

> "You are free; you are free to go to your temples. You are free to go to your mosques or to any other places of worship in this State of Pakistan. You may belong to any religion, caste or creed—that has nothing to do with the business of the state."

ہم نے اس دنیا میں ہی رہنا ہے اور دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ لین دین کرنا اور میل ملاپ رکھنا ہے، اس سے سیکھنا ہے اور سکھانا ہے، ان کو دینا اور کچھ لینا ہے۔ ہم isolation میں نہیں رہ سکتے۔ یہ اک حقیقت ہے کہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ اس لیے ہمیں دنیا کے انسانوں سے بھی رابطہ رکھنا پڑے گا اور رکھنا چاہیئے۔ تو تمام دنیا کے انسانوں سے تعقات کی بنیاد کے اصول یہ ہیں:

اگر مذہب کو بنیاد بنائیں تو یہ حضرت آدمؑ ہی کی نسبت سے ہوسکتی ہے۔ اس لیے آدمی ہونا ہی پہچان بنتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں اور اسی ناطے تعلق قائم کریں اور ایک دوسرے سے محبت کریں۔ جولوگ حضرت آدمؑ کو نہیں مانتے اور ان سے نسبت نہیں چلائی جاسکتی تو اس کے لیے ہمیں مشترک پہچان ڈھونڈنی ہوگی۔

6-38. There is not a moving (living) creature on earth, nor a bird that flies with its two wings, but are communities like you. We have neglected nothing in the Book, then unto their Lord they (all) shall be gathered

چونکہ ہم دنیا کی تمام مخلوقات میں سے انسانوں کی کیٹگری سے تعلق رکھتے ہیں تو اس نسبت سے ہم سب کی پہچان صرف انسان ہونا اور انسانیت بنتی ہے۔ یعنی دنیا کے انسانوں سے انسان ہونے کے ناطے تعلق قائم کیا جائے اور ان سے محبت کی چاہیئے۔ یعنی آپس میں تعلق کی بنیاد آدم کی اولاد ہونے کے ناطے اور، کامن انسانیت کی بنا پر انسانی مساوات اور انسانی اخوت سے برابری کا حسن سلوک کرنا چاہیئے۔ کائنات کے مالک بھی یہی کہتا ہے کہ رشتوں کا لحاظ کرو۔

''اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دئے اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر مانگتے ہو اور رشتوں کا لحاظ کرو۔ بے شک اللہ تمہیں ہر وقت دیکھ رہا ہے۔'' (۴۹۔۱۳) اے لوگو! ہم نے تمہیں

عورت اور مرد سے پیدا کیا ہے اور تمہیں شاخیں اور قبائل میں بانٹ دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔''

نبی کریم ﷺ بھی اسی بات کو یوں فرماتے ہیں۔

حدیث: ''انسان اللہ کی فیملی ہیں۔''

نبی کریم ﷺ نے، 632ء کو حجۃ الوداع میں بھی فرمایا تھا: ''تمام انسان آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ کسی عرب کو نان عرب پر کوئی فوقت نہیں اور نہ نان عرب کو عرب پر کوئی فوقیت ہے، اسی طرح کسی گورے کو کالے پر فوقیت نہیں اور نہ کالے کو گورے پر فوقیت ہے، سوائے تقوی اور نیک کاموں کے۔'' یہ خطبہ بھی انسان ہونے اور آدمی ہونے کی حقیت بیان کررہا ہے۔ یہاں بھی مذہب کی بات نہیں کی گئ۔ صرف انسانیت اور آدمیت کی بات کی گئ ہے۔ اگر کسی ایک انسان کو کسی دوسرے پر فوقیت ہوسکتی ہے تو وہ صرف بہترین انسان ہونے سے ہوسکتی ہے۔ مذیب کی بنیاد پر نہیں ہوسکتی۔

ہمارے نبی چونکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے نبی اور رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں تو پھر یہ ہماری ڈیوٹی بنتی ہے کہ ہم اپنے اللہ کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچائیں جو کہ ان سے میل جول، ان کو اپنے اخلاق اور لین دین میں دیانت داری سے متاثر کر نے، دوسرے تمام انسانوں کو بلا تفریق مذہب ہمدرد اور رحمت بن کر اسلام کی طرف راغب کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ تو ثابت ہوا کہ انسانوں سے محبت اور ان کے لیے رحمت بننا دراصل ہماری دینی مجبوری بن جاتی ہے اور فرض بھی بنتا ہے۔

اس دنیا میں انسانی بقاء کا جذبہ سب سے اہم ہوتا ہے۔ اور یہی تعلقات کو کنٹرول کرتا ہے۔ مذہب کی بنا پر تعلق کبھی بھی اتنا طاقتور جذبہ نہیں رہا کہ یہ پائیدار تعلق کی بنیاد بن سکتا۔ جیسے وقت کے ساتھ سگے بھائی بھی ذاتی مفادات کے تحت الگ اور ایک دوسرے کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی بقاء یا survival instinct یا زندہ رہنے کی خواہش سب دوسرے جذبات پر حاوی ہوتی ہے۔ صدیوں

سے ہم مذہب ہونے کے باوجود، قومیں، اپنے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے یا اپنی نسلی برتری قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے جنگیں کر کے دوسروں پر غلبہ پاتے رہے ہیں۔ مسلمان، عیسائی، ہندو بادشاہ ایکدوسرے سے معاشی، یا سیاسی غلبے کے لیے جنگیں کرتی رہی ہیں۔ عیسائیوں کی آپس میں آخری بڑی جنگ، جنگ عظیم دوم تھی۔ آج بھی مسلمان ملک ایکدوسرے سے جنگ کررہے ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نسلی، قومی، دنیاوی مفادات ہمیشہ مذہبی تعلق پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

سبق

آج کل دنیا ایک گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔ اس لیے اس میں رہنے کے لیے ہمیں معاشرتی علوم سے ایک دوسرے سے تعلق کے اصولوں کی سمجھ ہونی چاہیے تبھی ہم امن اور سلامتی سے رہ سکتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعلق اور لین دین کر سکتے ہیں۔ ہماری تعلیم میں معاشرتی علوم پر بالکل زور نہیں دیا جاتا جو کہ وقت کی ضرورت ہے۔ دنیا کی موجودہ سیاسی تنظیم کی حقیقت کو بھی تسلیم کر کے ہی ہمیں زندگی گزارنی چاہئے۔

مذہب کو ذاتی رہنے دیں اور سوشل مسائل اور ان کے حل پر بات کو ترجیح دینے لگیں تو پھر ہی زندگی بہتر ہوگی۔ ہماری خواہش کے مطابق دنیا نہیں بدلے گی۔ ہمیں ہی سمجھوتہ کر کے رہنا سیکھنا چاہیے جب تک ہم اتنے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ دنیا کے فیصلہ ہم کرنے لگیں۔ اسوہ حسنہ میں انسانوں سے محبت اور رحمت بننے کی ہمیں زندگی گزارنے کی زیادہ تر مواقع کی مثالیں مل جائیں گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اسوۂ حسنہ کو سٹڈی کر کے اس پر عمل کریں۔

☆......☆......☆

۳۰۔تواضع بھی بہت بڑی اہم سنت نبوی ہے

اس سے بندہ، غرور سے بچ جاتا ہے، تبھی مساوات پریکٹس ہوسکتی ہے

انسان کو اللہ رب العزت نے تخلیق فرمایا ہے۔اس کی زندگی میں اسے جتنے کمالات نصیب ہوتے ہیں، وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے نصیب ہوتے ہیں لیکن انسان اپنی نادانی کی وجہ سے انہیں اپنا کسب کمال سمجھتا ہے اور یہی اسے دوسروں سے بہتر سمجھنے پر مائل کرتا ہے اور وہ غرور وتکبر کو اپنا شعار بنالیتا ہے۔کسی کو اپنے جیسا نہیں سمجھتا۔جبکہ خدائے بزرگ وبرتر کو انسان کی یہ سوچ اور تکبر سخت ناپسند ہے۔

شیطان کی مثال سب سے اہم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قربت سے اپنی اوقات بھول گیا اور اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی صرف نسلی تکبر کی وجہ سے کی تھی کہ مٹی سے بنے انسان سے آگ سے بنی مخلوق برتر ہے۔قرآن نے بڑے واضح الفاظ میں تلقین فرمائی۔

کسی کے کسی بات میں کمال حاصل کرنے سے صرف اسے ہی فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسروں کو نہیں۔مثلاً اگر کوئی مالدار بن جاتا ہے تو اس کا فائدہ صرف اسے ہوتا ہے۔صرف مالدار ہونے کی بنا پر دوسروں پر حاکمیت کی خواہش، یا اس بنا پر اپنے کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھنا غلط سوچ ہے۔اگر اس کے پیسے سے عوام کو فائدہ پہنچے تبھی اس کی عزت کرنا صحیح طرز عمل ہوگا۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مالدار ہی حکمرانی کا دعوی بھی کرتے ہیں اور مال کے زور پر قبضہ بھی کر لیتے ہیں۔بنی اسرائیل میں حضرت طالوت کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہ مقرر کیا تو لوگوں نے کہا کہ ''وہ ہمارا بادشاہ کیسے بن سکتا ہے اس کے پاس کوئی دولت نہیں ہے یعنی غریب ہے۔''(۲۔۲۴۷) آج بھی ہمارے معاشرے میں یہی حال ہے۔

2-247. ." They said, "How can he be a king over us

when we are better fitted than him for the kingdom, and he has not been given enough wealth."

''اور لوگوں سے (غرور کے ساتھ) اپنا رُخ نہ پھیر اور زمین پر اکڑ کر مت چل، بے شک اللہ بڑے متکبر، اترا کر چلنے والے کو ناپسند فرماتا ہے۔''

(لقمان ۱۸)

آپؐ نے انسانوں کو عاجزی اور تواضع کی تلقین فرمائی اور خود بھی ہمیشہ عاجزی اور تواضع کو اختیار کیا۔صحابہ کرامؓ جس انداز میں آپؐ کی پیروی کرتے، آپؐ کا احترام کرتے اور پروانہ وار آپ پر نثار ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ان تمام باتوں کے باوجود حضور اکرم ﷺ بے حد خلیق اور متواضع ہی رہتے تھے۔مزاج مبارک میں انتہائی سادگی تھی۔

اپنے صحابہ کرام کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے اور اپنے لیے کسی مخصوص، امتیازی نشست یا امتیازی نشان کی قطعاً کوئی ضرورت نہ سمجھتے، نہ ہی اس کی اجازت مرحمت فرماتے۔یعنی مساوات کی پریکٹس خود بھی کرتے تھے اور اسی کی تعلیم اور تلقین بھی کرتے تھے۔۔جونہی کوئی صحابی غلطی سے تعظیم کے نام پر آپ کو بڑا بنانے کی کوشش کرتا تو اسی وقت اس کی تصحیح کر دیتے۔اور مساوات اور تواضع پر اصرار بھی کرتے تھے۔

سیاسی لیڈروں کو دیکھئے کہ سب میں فرعونیت ہی فرعونیت ہوتی ہے۔مساوات اور اخوت بالکل نہیں ہوتی۔یو ٹیوب دیکھیں تو مذہبی لیڈروں کے عقیدت میں پاؤں چومے جاتے دیکھ سکتے ہیں مگر وہ ان کو نہیں روکتے تو پھر عوام میں مساوات اور انسانی عزت کیسے پیدا ہو۔اور لوگوں کو مساوات کی کیسے سمجھ آئے گی۔لیڈروں کو ہی مثال سے سکھانا ہوتا ہے۔صرف نصیحت سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں قائد اعظم سٹوڈنٹ لیڈروں سے ملے تو ایک لڑکا مصافحہ کرتے قدرے جھک گیا جیسے کہ ہمارے کلچر میں رواج ہے تو قائد نے فوراً اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کرتے کہا۔کہ جھکو مت، ورنہ جھکنے کی عادت پڑ جائے گی۔اصل

لیڈر اپنے عوام کی ایسے ہی تربیت کرتے ہیں۔ قائد اعظم نے ہمیں یہ کر کے دکھا دیا ہے کہ مغربی کلچر میں رہتے ہوئے بھی ایک مسلمان اسوۂ حسنہ پر کیسے عمل کر سکتا ہے۔

نبی کریم ﷺ غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ جاتے، ان کے ساتھ کھانا تناول فرما لیتے۔ مجلس کے دوران کبھی آپؐ کو پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ غریب سے غریب آدمی کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ اپنے جانوروں کو بلا تکلف چارہ ڈالتے۔ ان کے بدن پر تیل ملتے۔ گھر کے روزمرہ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے اور اپنے کاموں کو امکانی حد تک خود انجام دینے میں بڑی خوشی محسوس فرمایا کرتے تھے۔ اپنے لباس مبارک میں خود پیوند لگاتے حتیٰ کہ اپنا جوتا بھی گانٹھ لیا کرتے تھے۔ گھر کی صفائی ستھرائی بھی فرما لیتے اور جانوروں کا دودھ دوہ لیا کرتے تھے۔ آپؐ اپنے کام خود کرتے تھے، تو ہمیں بھی خود کرنے چاہئیں۔ ابو جہل کو یہی بڑی تکلیف تھی اور کہتا تھا کہ آپ کی مساوات کی پریکٹس قابل قبول نہیں۔ کیا ہم بھی ابو جہل کی طرح نہیں بن گئے؟

دوسروں سے کام کرانے کی عادت ہی آہستہ سے اونچا سمجھنے کا باعث بنتی ہے۔ اپنے کام خود کرنے سے غرور اور تکبر پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بار سفر میں جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا، ایک صحابی نے درست کرنے کی پیش کش کی لیکن آپؐ نے فرمایا: نہیں یہ امتیازی بات مجھے پسند نہیں اور خود ہی جوتی کا تسمہ ٹانگ لیا۔ ٹی وی پر امریکن صدر بھی اپنی فائل اٹھا کر ہیلی کاپٹر میں جاتا دیکھا جا سکتا ہے تو اس میں تکبر کیسے پیدا ہو گا جبکہ ہمارے چھوٹے افسر کی فائل بھی چپڑاسی اٹھاتا ہے، تو پھر ضرور افسر کے دل میں تکبر پیدا ہو گا جو مساوات کا قاتل بن جائے گا۔

''امیر ہو یا غریب بلا تفریق ہر ایک کی دعوت کو شرف قبولیت عطاء فرما لیتے۔ ہر قسم کی سواری حتیٰ کہ گدھے اور خچر پر بھی بخوشی سوار ہو جاتے اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔'' ہمارے لیڈر بڑی سے بڑی، نئی سے نئی کار میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔ جونیجو صاحب نے بچت سکیم کے تحت چھوٹی کاروں کا قانون پاس کیا تو ان کو گھر

بھیج دیا گیا۔ ہماری پاکستانی فطرت میں غرور، اکڑ، چوہدری بننا شامل ہوگیا ہے۔

انگلینڈ کے وزیراعظم کو وزارت سے استعفیٰ دینے کے بعد ٹرک سے خود سامان اتارنے کی تصویر ہم سب نے یقیناً دیکھی ہوگی۔

مسلمان کی اصل پہچان تواضع ہے کہ جس کو فروغ دینے کی ضرورت ہے کہ جیسے دورِ نبوی اور خلفائے راشدین میں بڑے سے بڑے صحابی نارمل زندگی گزارتے تھے۔ مگر پھر بھی اللہ والے رہتے تھے۔ اللہ والا بننا تو دل میں ہوتا ہے۔

آپ ہر کسی سے ہر وقت حدیثیں سنیں گے، اسوۂ حسنہ کے ریفرنس سنیں گے مگر کسی کو تواضع اور اپنے کام کرتے نہیں دیکھیں گے۔ مسلمانوں میں صدیوں سے غلط سوچوں سے غلط رویے بن گئے ہیں۔ مثلاً مذہبی یا روحانی شخصیت ہو یا ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس، ایم این اے، ہو، ان کا لباس، ان کی بات کا طریقہ، ان کی لائف سٹائل کیسی ہونی چاہیے تبھی رعب اور دبدبہ قائم رہ سکتا ہے اسی لیے کوئی بھی روحانی بزرگ، سیاست دان، کمشنر، ایم این اے وغیرہ بڑے افسر نارمل زندگی نہیں گزار سکتے ہر ایک اپنی سٹائل رکھتا ہے۔ جو بڑائی ظاہر کرتا ہے۔ ایم این اے کے پاس بڑی گاڑی، ساتھ دو گن مین نہ ہوں، تو رعب نہیں بنتا۔

امام ابوالحسن الشاذلی[593 AH/1196 CE – 656 AH/1258 CE] ، جو کہ شمالی افریقہ میں مصر اور مراکو کے مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں اور شاذلی سلسلہ کے بانی ہیں، وہ اپنے مریدوں کو عام آدمیوں جیسی نارمل زندگی گزارنے کے لیے کہتے تھے۔ جب تک کوئی آدمی رزق حلال کمانے کے پیشے کو اختیار نہیں کر لیتا تھا تو تب تک اسے مرید نہیں بناتے تھے، کیونکہ اس زمانے میں بھی یہی غلط خیال مقبول ہوگیا تھا کہ اللہ سے لو لگانی ہے تو پھر دنیا سے کیا تعلق رکھنا، جبکہ نبی کریم ﷺ بازار سے سودا سلف خود خرید لاتے۔ اسی لیے امام شاذلیؒ کہتے تھے کہ آج کے صوفیاء کو کیا ہوا ہے کہ یہ اپنی بیویوں کے ساتھ اس لیے نہیں چلتے کہ لوگ کہیں گے کہ صوفی اور بیوی، یہ تو صوفی کا کام نہیں، اسی طرح یہ بازاروں میں اس لیے سبزی خریدنے نہیں جاتے کہ لوگ کہیں گے کہ صوفی کو سبزی خریدنے سے کیا کام ہے یعنی دنیاداری کا کام صوفی کے لیے نہیں ہے

اگر امام شاذلی وظیفے کر رہے ہوتے اور کوئی ملنے آجاتا تو وظائف چھوڑ کر ملنے

آ جاتے۔امام شاذلی اپنے مریدوں کو نارمل زندگی گزارنے کے دوران اللہ کو یاد رکھنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کے لیئے کہتے تھے کہ تم اسلام کے احکامات کو اپنی زندگی میں پریکٹس کر کے مثال بنو کہ یہ واقعی آسان اور قابل عمل ہیں۔اور زندگی میں دوسروں کی کاپی کرنے کی بجائے ان کے لیے مثال بنو کہ وہ آپ کی نقل کریں۔(انٹرنیٹ سے، ریفرنس)

ضرورت کے بغیر مانگنے کی ممانعت

اسلام مسلمانوں کو بلند ہمتی، عزت نفس کی تعلیم دیتا ہے۔مسلمانوں کی خودی، عزت نفس اور اَنا کی تربیت اور حفاظت کے لیے ہی سوال سے منع کیا گیا ہے اسلام میں مانگنا، ہاتھ پھیلانا اور دستِ سوال دراز کر کے اپنی تذلیل کرنا منع ہے الاّ یہ کہ اسے ضرورت اور عاجزی سوال پر مجبور کرے تو مانگ سکتا ہے۔لیکن اگر ضرورت کے بغیر مانگا جب کہ اس کے پاس کچھ نہ کچھ گزران وقت کے لیے موجود ہو تو یہ سوال روز قیامت اس کے چہرے پر داغ بن جائے گا۔

عدم سوال کو رسول اللہ ﷺ نے ان چند بنیادی امور میں رکھا تھا جن پر آپ ﷺ بیعت لیتے تھے مثلاً آپ ﷺ نے ایک بیعت میں فرمایا کہ ”کسی سے کچھ نہ مانگو گے۔“ ان صحابہ کرام نے بیعت نبوی ﷺ کو اس طرح حرف بہ حرف نافذ فرمایا اور کبھی کسی سے اپنی گری ہوئی چیز بھی اٹھا کر دینے کے لیے بھی نہ کہا۔(فقہ الزکوٰۃ)

اس لیے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی عزت نفس کی بھی حفاظت کرے اور اگر کوئی دوسرا مسلمان بھائی حالات کی مجبوری سے معاش سے عاجز ہو جائے یا حاجت مندی، غربت پیش آ جائے تو خود ہی اس بھائی کی عزت نفس کی حفاظت کرے اور اسے سوال کرنے کی ذلت اور مجبوری سے بچائے اور خود ہی مدد کی آفر کرے۔

سبق:

اگر مسلمان کا ماٹو یہ ہو کہ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے کرو۔تو پھر ہی مساوات کا احساس ہو گا اور پھر تکبر پیدا نہیں ہو گا۔

ہر بات کو اپنی achievement نہ سمجھیں بلکہ اللہ کی دین سمجھیں تو تبھی تکبر پیدا نہیں ہو گا۔ اپنے کام خود کریں تو دوسروں سے برتری کا احساس پیدا نہیں ہو گا۔ بچوں کو بھی اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ڈالیں۔

دوسروں کے ساتھ برابری اور تواضع کا سلوک کریں تو آپ کی عزت ہو گی آپ سے محبت ہو گی۔

حدیث : حضرت ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کہ کون ہے جو مجھے یہ ضمانت دے کہ وہ لوگوں سے کچھ نہ مانگے گا اور میں اسے جنت کی ضمانت دے دوں۔ ثوبانؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں۔ آپ نے فرمایا کہ کسی سے کچھ نہ مانگو۔ چنانچہ ثوبانؓ نے تاحیات کسی سے کچھ نہ مانگا۔''

اگر ہمیں اپنے نبی کی ضمانت پر اعتبار ہو تو پھر جنت کا یہ سودا بہت آسان بن جاتا ہے۔ اس کے لیے صرف عادت ڈالنے کی ضرورت ہے کہ جو کام خود کر سکتے ہوں وہ خود کرو۔ دوسروں کو نہ کہو۔ چاہے پانی پینا ہو یا کوئی چیز لانی ہو۔

اس سنت پر عمل کرنا آسان ہے صرف عادت ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بچوں میں شروع سے ہی عادت ڈالیں۔ ہمارے متکبر معاشرے میں فیملی دوست احباب مشکل بنا دیں گے۔ مگر جس کو اللہ توفیق اور ہمت دے اسے ضرور کوشش کرنی چاہیے۔

☆......☆......☆

۱۳۱۔ دوسروں سے ممتاز یا اونچا بننے کی خواہش یا کوشش اسوۂ حسنہ اور سنت کے خلاف ہے۔

مساوات کی نفی اور عقیدت میں بے جا غلو سے شخصیت پرستی، آباء پرستی، شروع ہوتی ہے۔ شخصیت پرستی بت پرستی سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ بت کا دماغ نہیں ہوتا جو خراب ہو جائے جبکہ انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے جو تکبر کا باعث بن کر فرعون بنا دیتا ہے۔ شخصیت پرستی سے نجات اور مساوات پر مبنی اجتماعی سسٹم بنا کر دکھانا بھی سنت ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مجھے معلوم ہے کہ تم یہ کام بھی کرلو گے مگر حق تعالیٰ کو پسند نہیں کہ میں تم میں ممتاز بن کر بیٹھا رہوں۔ مجھے اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے۔ (شمائل ترمذی)

اس حدیث کا بیک گراؤنڈ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک سفر کے دوران صحابہ کرامؓ نے بکری ذبح کرنے کا ارادہ کیا اور سب نے کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے لے لیا۔ بکری ذبح کرنے، کھال اتارنے، گوشت کاٹنے اور پکانے کی ذمہ داریاں تقسیم ہو گئیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا گوشت پکانے کے لیے لکڑیاں جمع کرنا میرے ذمے ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی کہ حضور یہ کام بھی ہم خود ہی کرلیں گے۔ مگر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے معلوم ہے کہ تم یہ کام بھی کرلو گے مگر حق تعالیٰ کو پسند نہیں کہ میں تم میں ممتاز بن کر بیٹھا رہوں۔ مجھے اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے۔ (شمائل ترمذی/ اخبار کے مضمون)

ہمیں اس اسوۂ رسول سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسانوں کے رول ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان بیک وقت بہت سے تعلق، مرتبے، رول، معاشرتی اور انسانی مقام

اور پہچان رکھتا ہے اور ان رشتوں یا رول کے مطابق ہر لمحے اسے مختلف طریقوں سے اپنے افعال، اخلاق، حقوق و فرائض، آداب نبھانے کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ ان کے مطابق ہی موقع محل دیکھ کر برتاؤ تبدیل کرنا ہی صحیح اور عمدہ اخلاق کا طریقہ اور مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کو اپنے بدلتے رول کے مطابق بدلنا چاہئے، تبھی تمام معاشرہ کسی سسٹم کے تحت احسن طریقہ سے اور predictible behaviour pattern سے چل کر امن سلامتی، خوبصورتی و حسن سلوک کا باعث اور نمونہ بن سکتا ہے۔ ورنہ ہر طرف فساد پھیل جائے گا جو عموماً مرضی کرنے والے لوگوں کی وجہ سے پھیلتا ہے، جو ہر جگہ ایک ہی رتبہ یا مقام کی عزت افزائی کا طریقہ ڈیمانڈ کرتے ہیں۔ یہ بات مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔

مثلاً ایک آدمی جب اپنے ماں باپ کے پاس جاتا ہے تو اسے بیٹے کی طرح ادب، اخلاق، تابعداری خدمت سے جانا چاہیے۔ چاہے وہ دنیاوی لحاظ سے کتنا ہی بلند مرتبہ رکھتا ہو۔ لیکن وہی آدمی جب اپنے بچوں سے ملتا ہے تو پھر اسے بطور باپ رہنا چاہئے۔ جس میں بچوں سے محبت، ان سے کھیلنا، باہر گھمانے لے جانا، پڑھانا، کھانا کھلانا ہوتے ہیں۔ جب مسجد جائے تو ایک کمزور اور عاجز اللہ کا بندہ بن کر جائے جو پروردگار سے ملنے گیا ہے۔ جب دفتر میں ہو، افسر بن کر رہے۔ وہاں عاجزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ جب اپنے سے بڑے کے پاس جائے تو ماتحت کی طرح رویہ رکھے۔

ہم لوگ یہ باتیں سمجھتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ مغربی لوگ ان معاشرتی اصولوں کو سمجھتے ہیں اور پریکٹس بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ٹونی بلیئر کے نابالغ بیٹے نے شراب پی اور غل غپاڑہ کیا تو پولیس نے پکڑ لیا۔ پولیس سارجنٹ نے وزیراعظم کو ٹیلیفون کر کے کہا کہ مسٹر پرائم منسٹر، برائے مہربانی، تھانے آ کر ضمانت دیں اور بچہ لے جائیں۔ تو وزیراعظم خود پولیس سٹیشن گیا اور باپ بن کر بیٹے کو نیک چلنی کی ضمانت دے کر رہا کرایا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ میں وزیراعظم ہوں، تم یہاں آ کر دستخط کرا لو اور میرے بیٹے کو بھی چھوڑ جاؤ۔

نبی کریم ﷺ نے اس مثال سے یہ بھی سمجھایا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ جب آپ ﷺ نبوت کا کام نہیں کر رہے بلکہ سفر میں کھانے کی تیاری کر رہے ہیں تو اس وقت آپ اس گروپ کے ایک ساتھی بن کر باقی اصحاب رسول کے ساتھ برابر کے شریک ہونا چاہتے تھے۔اس لیے آپ نے پیغمبر بن کر علیحدہ بیٹھ رہنے کی بجائے اس گروپ کے ایک ممبر کی طرح کھانا پکانے میں حصہ لیا۔جس معاشرے میں اس طرح ہر وقت انسانی مساوات اور عدل پریکٹس ہوگا۔تو وہاں پر ہی اخوت، محبت اور رحمت ہوگی ایک دوسرے پر جان چھڑکیں گے۔ترقی ہوگی۔امن وسکون ہوگا۔اللہ کی رحمتیں ہوں گی، ورنہ نہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر چیز کو صرف مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ یہ سب معاشرتی اصول ہیں جو ہر معاشرے میں یکساں ہوتے ہیں۔ان کا تعلق انسانوں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ بھی اپنے اسوۂ حسنہ کی اس مثال سے معاشرتی اصول ہی سکھا رہے تھے، نہ کہ کوئی مذہبی اصول۔ ہم اب تک یہ ہی نہیں سمجھ سکے کہ آپ کس وقت کیا سکھا رہے ہوتے تھے۔صحابہ کرامؓ کو سمجھ تھی وہ پہچان لیتے تھے،تبھی وہ ایسے تربیت یافتہ ہوئے کہ دنیا ان کی مثالوں کو رول ماڈل قرار دیتے ہیں۔

جب ہمارے حکمران، وزیر اعظم یا وزیر، سڑک پر گاڑی چلا رہے ہوں تو اس وقت وہ صرف اور صرف بطور ڈرائیور ہوسکتا ہے جو دوسروں کے ساتھ سڑک share کر رہا ہے اور اسے دوسرے ڈرائیوروں کی طرح ٹریفک کے تمام قوانین پر عمل کرنا چاہیے اور اگر وہ ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے بھی اتنی ہی سزا ملنی چاہیے جیسے کہ کسی اور ڈرائیور کو، اور یہ سزا اسے بطور ڈرائیور ملے گی۔ وہ وزیر اعظم ہونے کے باوجود سڑک پر وزیر اعظم کا پروٹوکل ڈیمانڈ نہیں کرسکتا۔مغربی ممالک میں سب کو اس بات کی مکمل سمجھ ہے۔مثلاً شہزادہ چارلس کو ٹریفک رولز کی خلاف ورزی پر پولیس نے جرمانہ کیا اور اس نے بخوشی ادا بھی کیا۔ ہمارے وزیر اعظم خاقان عباسی اور نواز شریف کو بھی لندن میں غلط پارکنگ پر چالان کا ٹکٹ مل گیا تھا۔انہیں شاید یہاں کی عادت تھی کہ مجھے کوئی چیک نہیں کرسکتا۔

بڑوں کو چھوڑیں، ایک عام آدمی بھی حج کر آئے تو اس کے لیے حاجی کا ڈھنڈورا پیٹنا ضروری سمجھتا ہے تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ وہ عام گناہ گار لوگوں سے برتر ہے۔ وہ پاکیزہ اور پوتر ہو گیا ہے۔ یہ بھی تکبر اور اپنی شخصیت پرستی یا پوجا ہی کی قسم بن جاتی ہے۔ جو ان میں پاکیزگی کا غرور پیدا کرتا ہے۔ جبکہ حج کر کے اس نے ایک ذاتی فرض ادا کیا ہے۔ دوسروں کو اس سے کیا غرض کہ حج کیا ہے یا کہ نہیں۔

اصل رہنما یا لیڈر صرف وہ ہوتا ہے جو عوام کی رہنمائی کرتے ان کی سوچیں بدل کر کے ان کی دنیا سنوارے۔ ان کی بری اور نقصان دہ عادات اور کلچر کو بدل سکے۔ سیاسی اور دینی لیڈروں پر ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ وہ پہلے عوام کی دنیا کو سنواریں۔ جیسے کہ حضور اکرم ﷺ نے کر کے دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی آخرت کی جواب دہی کا بھی احساس دلائے۔

انٹرنیٹ سے ایک رائے نقل کرتا ہوں ''آج غلامی کا نیا دور جاری ہے اور وہ ہے شخصیت پرستی۔ اس غلامی کی نشانی یہ ہے کہ مذہبی اور سیاسی یا گھریلو بزرگ یا با اثر شخصیت کا نام لیتے ہی عقل گھٹنے ٹیک دے اور اس کی تشریح ماننے پر فوری مجبور ہو جائے خواہ کیسی ہی غلط بات کیوں نہ کہی گئی ہو۔'' لوگ ان کو عقیدت میں خدا بنا کر اللہ کی فرمان برداری کی بجائے اپنی وفاداری کی طرف منتقل کر دیتے ہیں ۔ جس کو قرآن میں واضح طور منع کیا گیا ہے۔

9-31. They (Jews and Christians) took their rabbis and their monks to be their lords besides Allah ۔

ان معاشرتی رویوں کی اندھی تقلید نے ہمیں صدیوں سے کلاس سسٹم والی اور مساوات سے عاری زوال پذیر قوم بنا دیا ہے۔ پھر سے طاقت حاصل کرنے کے لیے ہمیں قرآن اور اسوۂ حسنہ کی طرف لوٹنا ہو گا اور جو بھی عمل قرآن اور اسوہ رسول کے خلاف ہو اس سے چھٹکارا پانا ہو گا۔ ساتھ ہی اپنے کردار کو اسوہ رسول کریم ﷺ کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ یہ بہت ہی اہم موضوع ہے اس پر خود تحقیق کریں اور فیصلہ کریں۔

سبق:

اگر ہم گولڈن اصول پر عمل کریں کہ ہمیں اپنے ساتھ غرور اور تکبر کا سلوک ناپسند ہے تو ہمیں بھی دوسروں کے ساتھ تکبر سے برتاؤ نہیں کرنا چاہیئے، یہ حدیث اور وارننگ یاد ہو، کہ جس کے دل میں رائی برابر تکبر ہوگا وہ جنت نہیں جائے گا۔ پھر ہر وقت تواضع ہی پریکٹس ہی ہوگی ،غرور قریب نہیں آئیگا۔تو آئیں دوسروں سے ممتاز بننے کی کوشش نہ کریں،تواضح اختیار کریں۔انسان بنیں تو اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے گا۔

ہمیں ہر موقع محل کے مطابق جو صحیح طرز عمل ہے،اس کے اصولوں کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

ہر ایک کے چوہدری بننے کا رجحان رکھنے والے معاشرے میں اس سنت پر عمل بھی مشکل کام ہے۔اس بری عادت سے جان چھڑانے کے لیے شعوری محنت کر کے ہی تواضع کے طرز عمل اپنانے کی کوشش کریں گے تو تبھی کامیابی ہوگی۔

☆......☆......☆

۳۲۔ حکمت سیکھنا بھی سنت ہے

حدیث : الحکمه متاع المومن فحبث و جدها فهو احق بها .

''علم و حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے اسے جس جگہ بھی پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔''

حدیث: ''عقل میرے دین کی اصل ہے۔علم میرا ہتھیار ہے۔''

آسٹریلیا کی منرل واٹر کی کمپنی نے پانی ضائع کرنے سے بچنے کی مہم کے لیے اپنی بوتل پر یہ حدیث لکھی ہوئی ہے کہ: ''پانی ضائع مت کرو چاہے تم ندی کے کنارے ہو۔'' دیکھئے غیر مسلم مغربی ممالک علم اور حکمت کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں سے ملے لے لیتے ہیں۔ انہیں اس حدیث کے علاوہ اور کہیں سے پانی ضائع نہ کرنے کا حوالہ یا quotation نہیں ملی تو انہوں نے بغیر جھجک فوراً اپنا لی۔

کتنی شرم کی بات ہے کہ ہمیں تو اپنے پیارے رسول کریم ﷺ نے حکمت کے موتی ہر جگہ سے چننے کا حکم دیا تھا مگر ہم مذہبی تعصب میں دوسرے مذاہب یا کلچر کے لوگوں سے یا اپنے دوسرے مسالک سے بھی علم و عقل سیکھنے کے لیے تیار نہیں جس سے ہم دنیاوی ترقی کر سکیں۔ کیا ہمیں اس تجربے سے اپنے رویے تبدیل کر کے اپنے نبی ﷺ کی پیروی کا فیصلہ کر کے علم دوست نہیں بن جانا چاہئے۔ اور پانی اور دوسری نعمتیں ضائع کرنے کی بدعادات سے بچنے کے لیے طریقے وضع کر لینے چاہئیں؟

عقل و حکمت کی باتیں ہر جگہ سے چننے اور علم دوستی کی ایک اور مثال دیکھیں۔ اس میں ایک مسلم صوفی کے خیالات کا ایک فرانسیسی عورت نے ترجمہ کر کے اپنے ہم وطنوں سے بھی شیئر کر دیا۔

Ten Excellent Qualities of the Dog,
Which a Good Servant of God Should Possess
An Anonymous Medieval Syriac Text, Translated by Liza Anderson
Institut Supérieur d'Histoire et deLittératures Orientales de l'Universitém 1932, pp. 119-120.]

ایک مسلم صوفی کے خیالات

عقل منداور علم وحکمت والے لوگ کہتے ہیں کہ کتے میں دس بہترین عادتیں ہیں:

پہلی عادت: ہر وقت پر جوش ہوتا ہے۔ یہ نیک خصلت اور وفادار کی نشانی ہے۔

دوسری عادت: اس کے سونے کے لیے کوئی مقررہ جگہ نہیں ہوتی۔یعنی کوئی مکان نہیں بناتا۔یہی عادت درویش صفت کی ہوتی ہے جو صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔

تیسری عادت: یہ ساری رات نہیں سوتا بلکہ مالک کی حفاظت کے لیے جاگتا رہتا ہے۔صرف چند لمحے سوتا ہے۔یہی نشانی محبت کرنے والی کی ہے۔

چوتھی عادت: یہ مرنے کے بعد کچھ بھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔یہ غربا کی خصلت ہے۔

پانچویں عادت: یہ کبھی بھی اپنے مالک کو نہیں چھوڑتا چاہے مارے یا دھتکارے۔یہ ان کی خصلت ہوتی ہے جو اپنے مالک سے محبت کرتے ہیں۔

چھٹی عادت: اسے ہر جگہ قبول ہوتی ہے جو مالک مقرر کردے اور اسی پر خوش رہتا ہے۔یہ ان لوگوں کی خاصیت ہوتی ہے جو مالک کی مرضی یا مشیت پر راضی ہو جاتے ہیں اور ہر مشکل یا مصیبت میں بھی شکر ادا کرتے ہیں۔

ساتویں عادت: اگر اسے اپنی جگہ پسند نہ بھی ہو مگر یہ اسے چھوڑتا نہیں۔یہی عادت ایک ثابت قدم اور عقل مند کی ہوتی ہے

آٹھویں عادت: اگر کوئی اسے مارے بھی اور بعد میں کچھ کھانا دے دے تو یہ غصے کے بغیر قبول کر لیتا ہے۔ یہ حقیقت پسندی اور عاجزی کی مثال ہے

نویں عادت: جب کھانا تیار ہو رہا ہو تو یہ بیٹھ کر انتظار کرتا ہے اور اپنے اوپر کنٹرول رکھتا ہے۔ یہ ان کی خصلت ہوتی ہے جن کا اپنے نفس کے اوپر کنٹرول ہوتا ہے۔ جو قسمت والوں کو ملتا ہے یا اللہ کی توفیق سے ہوتی ہے

دسویں عادت: جب یہ اپنی جگہ چھوڑتا ہے تو کچھ بھی ساتھ لے کر نہیں جاتا۔

سبق

ہمیں کسی بھی قوم، مذہب سے علم سیکھنے میں جھجک نہیں ہونی چاہیے کیونکہ علم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ علم صرف علم ہوتا ہے۔ حکمت صرف مذہب سے ہی منسلک نہیں بلکہ کسی مضمون میں ہو سکتی ہے۔

بچوں کو بھی چھوٹی عمر سے ہی حکمت کی باتیں اکٹھی کرنے کی عادت ڈالیں۔ جیسے مقولے، بڑے لوگوں کی باتیں، quotations۔ وغیرہ۔ زندگی کی سچائیاں سیکھنے اور ان پر عمل سے ہی زندگی آسان، امن اور سکون والی بنتی ہے۔

اس سنت پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔ صرف ذاتی فیصلہ اور ارادہ کرنے کی ضرورت ہے کہ روزانہ میں نے حکمت کی باتیں سیکھنی ہے۔ چاہے جہاں سے ملے۔ اسے لکھ کر اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ اور کسی وقت اس کو چھپوا کر سب سے شیئر کریں تو محنت محفوظ ہو جائے گی۔

☆......☆......☆

۳۴۔سب مخلوقات کی خیر خواہی بھی سنت ہے

حدیث: ''دین خیر خواہی ہے۔ دین کو آسان کر کے پیش کرو، اللہ آسانی چاہتا ہے۔''

''دعوت کے کام میں یک طرفہ خیر خواہی سنت ہے۔'' (ص۵۲)

یہ سنت بھی گڈ گورننس اور بہترین ایڈ منسٹریشن کا اہم اصول ہے۔

یہ سنت سیاست کا بھی بنیادی اصول ہے۔

خیر خواہی دو طرح کی ہے۔ایک دینی اور دوسری دنیاوی۔

ہمیں تو اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے سب غیر مسلموں کی فکر ہونی چاہیے کہ انہیں آگ میں جانے سے بچانا ہے۔آپ کو اتنی فکر تھی کہ اللہ تعالیٰ کو سمجھانا پڑا کہ زیادہ فکر نہ کریں۔ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔آپ صرف پیغام پہنچا دیں۔ہم نے اس سنت پر عمل کرنا سیکھا ہی نہیں کہ غیر مسلموں سے بہترین سلوک کریں تبھی وہ اسلام کے سسٹم سے متاثر ہونگے۔ہمیں اپنی نظریاتی سوچیں درست کرنے کی ضرورت ہے کہ جب عقائد کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ نے کرنا ہے تو ہم وہ فیصلے کرنے سے اجتناب کریں اور دنیاوی زندگی میں سب سے بہتری برتاؤ کرتے رہیں جیسے نبی کریم ﷺ کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ کب کس کو ہدایت فرما دے یہ اس کی مرضی ہے۔یک طرفہ خیر خواہی کی ضرورت کی مثال دیکھیں۔احد میں زخمی ہو کر آپ ﷺ کی زبان سے یہ نکلا۔''**وہ لوگ کیسے فلاح پائیں گے جنھوں نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے حالانکہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف بلا رہا ہے۔**'' (ابن کثیر،۱،۴۰۱) اللہ کو یہ بات پسند نہ آئی، تو فوراً وحی آئی: ''**تم کو اس امر میں کوئی دخل نہیں کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا**

عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔" (آل عمران ۱۲۸) **"یعنی دعوت کا کام یک طرفہ خیر خواہی سے ہونا چاہئے۔ چاہے وہ ظلم کریں، مارنے والے کے لیے دعا کریں، اور نفرت کا جواب محبت سے دیں۔ مدعو کا انجام اللہ پر چھوڑے یہی سنت ہے جو داعی کو اپنانی چاہیے۔"**

دنیاوی خیر خواہی کیا ہے؟

مذہبی اختلاف کے باوجود ہر انسان، انسانی مساوات اور انصاف کے سلوک اور خیر خواہی کا مستحق رہتا ہے اس سے سب دنیاوی تعلقات، لین دین رکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔خود رسول کریم ﷺ یہودیوں سے لین دین، قرض تک لیتے تھے۔ان کے پاس چیزیں رہن رکھتے تھے۔

اسوۂ حسنہ سے ایک اور مثال اسلامی نظریہ کو واضح کر دے گی۔ایک یہودی غزوہ احد میں مسلمانوں کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا تو آپ نے تعریف فرماتے کہا کہ وہ بہترین یہودی تھا۔اس یہودی نے میثاق مدینہ کے معاہدہ کی پاسداری کی تھی اس لیے اس کی وفاداری کی تعریف فرمائی۔

ساری دنیا میں عبدالستار ایدھی کی عزت افزائی صرف انسانیت کی خدمت کی بنا پر کی گئی تھی۔ان کی زندگی کو ہم نے انسانی خدمت اور خیر خواہی کے پیمانے سے ناپنا ہے۔کسی اور زاویے سے نہیں مگر چند لوگوں نے مذہب کی نظر سے دیکھ کر غلط ریمارکس دیئے تھے جو کہ غلط سوچ اور نظریہ ہے۔نور جہاں کو ہم نے صرف گانے میں بہترین پرفارمنس پر دیکھنا ہے اور تعریف کرنی ہے نہ کہ اس کو بھی مذہب کی نظر سے دیکھ کر رد کر دیں۔ڈاکٹر عبدالسلام پر فخر پاکستانی ہونے کی وجہ سے ہونا چاہیے نہ کہ مذہب کی رو سے جج کر کے رد کر دیں۔

ہماری ذہنی سوچوں کی فضاء اب ایسی بن گئی ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ دوستی اور تعلقات کو برا گنا جاتا ہے۔یہ سوچ میثاق مدینہ کی روح کے خلاف بھی ہے اور اسلام کی

دعوت دینے میں بڑی رکاوٹ بھی بن گئی ہے۔ **''سورہ یونس اور سورۃ کافرون ہمارے لیے غیر مسلموں اور ایک مسلک کا دوسرے مسلک سے تعلقات کا اصول مقرر کرتی ہے۔''**

''اگر یہ تمہارا انکار کرتے ہیں تو ان کو کہہ دیں کہ میں اپنے اعمال کے لیے ذمہ دار ہوں اور تم اپنے اعمال کے لئے۔ نہ ہی تم ذمہ دار ہو جو میں کرتا ہوں اور نہ ہی میں ذمہ دار ہوں جو تم کرتے ہو۔'' (سورہ یونس۔۴۱)

اللہ تعالیٰ نے سورت کافرون میں غیر مسلموں سے تعلقات کا اصول مقرر فرما دیا ہے'' کہ ''لکم دینکم ولی دین'' لیے میرا دین اور تمہارے لیے تمہارا دین۔'' نہ تم نے مذہب کے معاملے میں میری بات ماننی ہے اور نہ میں نے تمہاری بات پر ایمان لانا ہے۔ پھر جھگڑا کیوں کریں۔ اس طرح یہ سورہ بقائے باہمی کا انٹرنیشنل منشور اور اصول بھی بن جاتا ہے۔ جس پر ہمیں فخر کرنا چاہئے۔ اور پریکٹس کرنا چاہیے جس سے ہی دوسروں کے مذہب، کلچر، مسالک کو برداشت کرنے کی عادت پڑے گی۔ اور دنیاوی معاملات میں بھی ان کی خیر خواہی کریں گے تو تبھی وہ اسلامی کردار سے متاثر ہونگے۔

سبق:

اس دنیا میں رہنا اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کی فیملی یعنی اس کی مخلوقات، انسان، جانور، پرندے، نباتات سے تعلقات رکھنا ہماری معاشرتی مجبوری ہے۔ ان کا خیال رکھیں گے تو تبھی ان کا اور ہمارا مالک خوش ہوگا۔ یہ سب جاندار مخلوقات ہیں۔ عبادات ذاتی ہوتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ دوسروں سے متعلق حقوق ادا کرنے سے خوش ہوتا ہے، ہمیں دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ایک کتے کی جان بچانے کے جذبے اور خیر خواہی سے اس کو پانی پلانے پر ایک طوائف بخش دی جاتی ہے۔ اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوسکتا کہ مخلوق کی خیر خواہی کا عمل اللہ سبحانہ تعالیٰ کے نزدیک کتنا وزنی ہے اور اعمال تلتے وقت کسی بھی انسان سے خیر خواہی کا ایک عمل ہی ہماری کامیابی کا باعث بن سکتا ہے۔ چاہے وہ کسی مذہب، نسل، رنگ اور کلچر کا ہو۔

ہم اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا کام چھوڑ بیٹھے ہیں جو کہ ہماری پرائمری ڈیوٹی ہے۔ اور ساری انرجی آپس میں ہی ایک دوسرے کو سیدھا کرنے پر لگا رہے ہیں۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ غیر مسلموں پر توجہ دیں۔ دنیا میں اب بھی ایسے قبائل موجود ہیں جو ننگے رہتے ہیں اور دعوت کے مستحق ہیں۔ ہمیں اپنی priorities پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دعوت کا کام بھی دوسرں کی خیر خواہی کے احساس سے ہی شروع ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی دنیاوی خیر خواہی ہی بہترین ایڈمنسٹریشن کا باعث بن سکتی ہے۔ اور حکمران کے لیے گڈ گورنس سکھا سکتی ہے۔

اس سنت پر عمل بہت آسان ہے۔ کیونکہ ذاتی فعل ہے۔ بات سوچ کو ٹھیک کرنے کی ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارا ہر طرح خیال رکھیں تو پھر ہمیں پہل کرنی چاہیئے۔

☆......☆......☆

۳۴۔ ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزارنا سنت ہے

ہم جو بھی حاصل کرنا چاہیں وہ صرف زمانہ حال میں حاصل کرنا ہی ممکن ہوتا ہے۔ ماضی تو ویسے بھی گزرا وقت ہے۔ گیا تو ہمیشہ کے لیے چلا گیا اب اس پر کیا پچھتانا، اس سے صرف سبق سیکھا جا سکتا ہے کہ کیا غلطیاں کی تھیں جو دہرانی نہیں چاہئیں ۔جیسے Paulo Coelho پاؤلو کا قول ہے کہ "غلطی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، بس سبق ہوتے ہیں۔ سیکھنے سے ہم انکار کر دیں تو زندگی وہی غلطیاں دہراتی رہتی ہے۔"

One thing is for sure ,we all make mistakes, but what differentiates winner from losers is, what we learn from mistakes.

مستقبل کا پتہ نہیں کہ آئے یا نہ آئے۔ اس لیے آج کے ہر دن کو آخری دن سمجھ کر اس میں بہترین عمل کر کے گزاریں۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا ہے کہ

"Work for the affairs of the world as if you were going to live forever but work for the Hereafter as though you will die tomorrow." [Darimi; Mishkat]

اس حدیث پر کیسے عمل کیا جائے؟

ہر مسلمان کو اپنے ہر دم کا حساب خود لینا چاہیے یا محاسبہ کرنا چاہیے کہ اس نے آج کے دن میں کیا اچھے کام کئے ہیں اور کون سی غلطیاں کی ہیں اور ان سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ پھر ان سے بچنے اور اگلا دن بہتر گزارنے کے لیے سوچ بچار کر کے، یا مراقبہ کر کے پلان کرے یعنی کہ زندگی پلان کر کے گزارنی چاہیے جو کہ ہم نہیں کر رہے۔ یعنی ہمیں روزانہ محاسبہ اور سوچ بچار کرنا چاہیے۔

اس حدیث پر عمل کرنے کے لیے زندگی کے دو مقاصد ہونے چاہیے۔ دینی

اور دنیاوی۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی کامیابی جنت کے مل جانے کو قرار دیا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے کہ دوڑو جنت کی طرف۔یعنی دنیا کی زندگی کا مقصد حیات یہ ہونا چاہیے کہ یہ اتنی بھلی ہو کہ اس کے اعمال سے جنت مل جائے۔اس لیے مسلمان کا ہر دن پہلے دن سے پاکیزگی اور نیک اعمال میں،علم میں، پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کی احسن طریقے سے ادائیگی اور ان میں روزانہ ترقی کر کے بہتر ہونا چاہیئے۔ ہر ایک کو اللہ کی نعمتیں ٹائم،انرجی،اسباب کو اللہ کی رضامندی کے لیے استعمال کرنا چاہیئے۔اور اندرونی یا روحانی ترقی بھی ہر روز پہلے سے اچھی ہوتی جانی چاہیئے۔ہمیں سوچیں اور نظریات ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔آخرت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ آخرت کی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔یعنی ہر روز بہترین اعمال کو مقصد بنائیں۔نتائج اللہ پر چھوڑ دیں کیونکہ فیصلہ تو اس نے کرنا ہے۔

سبق

یہ سنت دراصل اپنی ذاتی خیر خواہی پر مبنی ہے۔ ہر انسان بہتر سے بہتر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے کہ ہر روز بہتر ہوا جائے۔اگر مالی بات ہے تو آمدنی بڑھتی رہنی چاہیے۔اگر علم مقصد ہے تو ہر قسم کے علم میں ترقی ہونی چاہیئے۔اگر روحانی فیلڈ ہے تو ہر روز اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہونا چاہیئے۔

ویسے بھی تجربہ یہی کہتا ہے کہ تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے یا تو ہم ترقی کر رہے ہوتے ہیں یا تنزل کی طرف چل رہے ہوتے ہیں۔اس لیے بہتر ہے کہ ترقی کرنے کی کوشش کریں۔

اگلا باب اسی مقصد کو اور بھی بہتر طریقے سے بتاتا ہے۔

☆......☆......☆

۳۵۔مرنے تک بھلائی کے کام کرتے رہنے کی نبوی ہدایت

حدیث: ''اگر تم درخت لگا رہے ہو اور قیامت برپا ہونا شروع ہو جائے تو درخت لگاتے رہو۔'' (انٹرنیٹ سے یہ حدیث دیکھیں)

Anas ibn Malik reported that the Prophet (peace and blessings be upon him) said, "If the Hour (the day of Resurrection) is about to be established and one of you was holding a palm shoot, let him take advantage of even one second before the Hour is established to plant it."Plant a tree even if it is your last deed:1.Source: Musnad Ah?mad 12491 (Authenticated by Al-Albani)

اس حدیث سے بہتر اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا کہ ہمیں دنیاوی زندگی کو موت تک جنت بنانے کی واضح ہدایات نبوی ہیں۔صرف اس حدیث کو پڑھ کر ہی ایک ماحولیات کا ایکسپرٹ شخص مسلمان ہوگیا تھا۔

Rianne C. tenveenJanuary 9, 2010 at 5:31 AMThe saying of Prophet Muhammed about tree planting is one of my favourite ones and as an environmentalist convinced me to become a Muslim.

زندگی ایک اکائی ہوتی ہے مگر ہم نے دین اور دنیا کی ایسی تفریق پیدا کی ہے کہ ہم نے بہت سے اجتماعی انسانی بھلائی کی نوعیت کے ثواب کے کام دنیاوی بنا کر انہیں غیر دینی اور غیر اہم قرار دے کر کے چھوڑ دئے ہیں۔اسی لیے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک انٹرنیشنل سیمینار میں ڈاکٹر عبدالرؤف نے کہا تھا کہ ہندوستان میں چار ہزار تنظیمیں ماحولیات پر کام کر رہی ہیں مگر ہم مسلمان کسی ایک میں بھی کہیں نظر نہیں آتے۔

ہندو ہم وطنوں کے ساتھ مشترکہ بھلائی کے کاموں میں تو شامل ہونا چاہئے۔

کلکتہ کے سماجی ایکٹوسٹ کاشف حسن کا کہنا تھا کہ ''ہم مسلمانوں کو صرف مسلم امہ جیسی اصطلاحوں سے نکل کر وسیع انسانیت کے پس منظر میں بھی کام کرنا چاہئے۔ڈاکٹر کرمانی نے کہا کہ شاید اسی لیے علی گڑھ سے کوئی بڑا مفکر، سائینس دان، اور سکالر پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ ہماری سوچ لوکل ہوگئی ہے اور مسلمانوں تک محدود ہوگئی ہے۔

میرے خیال میں ہم پاکستانی صرف مذہبی مخلوق بن گئے ہیں یا پھر سیاسی مخلوق اور انسانی، معاشرتی مخلوق بننا بھول گئے ہیں اور صرف ثواب کمانے کی مخلوق بن گئے ہیں۔۔اسی لیے ہم نے انسانیت کے لیول پر شراکت داری چھوڑ دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بڑے انسانی کاموں میں مسلمانوں کا انٹرنیشنل لیول پر کہیں بھی نام نہیں آتا۔شکر ہے کہ ایدھی نے یا عمران خان نے یہ کر کے دکھا دیا ہے۔شکر ہے کہ مغربی مما لک میں رہنے والے مسلمان اب اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔

ان مثالوں سے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمیں بھی انسان بن کر تمام دنیا کو کچھ بن کر دکھانا چاہیے کہ ہم مسلمان بھی بہت اونچے انسان دوست ہیں، یہ سوچ ہو تو پھر انسانیت کے لیے بھی کچھ کرنا سیکھنا ہوگا۔انسانیت کے لیے سب کام اللہ کی فیملی ہی کے لیے ہوتے ہیں، اس میں بھی ثواب ہی ثواب ہوگا۔اس کی کیوں ہمیں سمجھ نہیں رہی۔صرف مسلمانوں ہی کے لیے انسانی بھلائی کا سوچنا اپنے آپ کو چھوٹے پن کا شکار بنا دینا ہے۔اور چھوٹا پن ہی مسلمانوں کا المیہ ہے جبکہ ہمیں تو رحمۃ للعالمین کے نقش قدم پر چل کر تمام دنیا کو دکھانا تھا کہ مسلمان رحمت ہی رحمت ہوتا ہے۔

''موت تک انسانی بھلائی کے کام میں لگے رہنے کی بہترین مثال ہیلن کی زندگی کے آخری 90 دن ہیں کہ اس نے کیسے گزارے تھے اس سے ہم مسلمانوں کو بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔'' (نوائے وقت سنڈے میگزین)

''ہم موت سے ڈرتے ہیں، موت سے بے خوفی کی ایک درخشندہ مثال بی بی سی ٹیلی ویژن سے وابستہ مشہور برطانوی سپورٹس جرنلسٹ چالیس سالہ

مس ہیلن رولاس بھی ہیں۔ بدقسمتی سے وہ کینسر کے مرض کا شکار ہوگئی۔ ان کا یہ مرض لا علاج تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک زندہ رہیں گی اور یہ کہ ان کی زندگی کا یہ سفر چند دنوں میں پایا تکمیل تک پہنچنے والا ہے اس کے باوجود انہیں موت کا رتی بھر بھی خوف نہیں ہوا، اور بیماری کی اس حالت میں بھی بی بی سی کے لیے اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں، اور روز وشب شمار کرنے کی بجائے اس نے اس پر اپنے تجربات پر کتاب لکھنی شروع کر لی تاکہ دوسروں کا فائدہ ہو جائے گا۔ ہیلن رولاسن کا سنڈے ٹائمنز میں انٹرویو شائع ہوا ہے جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔''

ہمیں پہلا سبق تو یہ ملتا ہے کہ ہمیں خود کو ہر وقت فرشتہ اجل کی دعوت کے لیے تیار رکھنا چاہیے مطلب یہ کہ اپنے تمام معاملات کو وصیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے تاکہ ہمارے بعد ہماری اولاد جائیداد کے جھگڑوں سے محفوظ رہے۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ موت سے انسان کو نفرت نہیں بلکہ پیار کرنا چاہیے کیونکہ یہ عمل انسان کو برائیوں سے روکتا ہے اور خالق کائنات کی اطاعت گزاری کے قریب کر دیتا ہے ہیلن کہتی ہے جب ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ میری زندگی کے خاتمہ میں چند ہفتے رہ گئے ہیں تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ موت کی اس بشارت نے مجھے اپنے تمام معاملات کو نمٹانے کی مہلت دی ہے۔ کچھ اچھے کام کرنے کی تحریک بخشی ہے اللہ کی طرف رجوع کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں نے اسی وقت عوامی بھلائی کے مقصد سے کینسر کے موضوع پر ایک معلوماتی کتاب لکھنے کا آغاز کر دیا۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ اپنی آخری سانس لینے سے پہلے یہ کتاب مکمل کرلوں یہ کتاب لوگوں میں پیار بانٹے گی۔ موت سے ڈرنے سے بچائے گی لوگوں نے مجھے بے پناہ پیار دیا ہے میری یہ کتاب عوام کے اس پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہوگی۔''

اگر ہمارے ہاں کسی شخص کو بتا دیا جائے کہ تم تین چار مہینوں کے اندر اندر اس

دنیا سے رخصت ہونے والے ہوتو وہ یہ خبر سنتے ہی وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔ہیلن رولاسن سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنے آنے والے کل کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیں ہمارا آج ہی عزیز ہونا چاہئے۔''

انگریزوں اور مغربی ممالک کے لوگوں کی وصیت نامہ لکھنے کی پریکٹس

موت حکم ربی ہے اور اس سے سفر کے تمام راستے مسدود ہیں۔ باوجود اس امر کے کہ ہر انسان پر یہ بخوبی واضح ہے کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور ہر شخص نے اپنی مستعار سانسوں کی پونجی سے تہی دامن ہو کر ایک دن آغوش فنا میں اترنا ہے۔ ہر شخص اس کی دہشت سے لرزہ براندام ہے کوئی بھی شخص اس دنیا سے سامان رخصت باندھنے کے حق میں نہیں ہے۔ ہر انسان عمر خضری کا آرزومند ہے زندگی سے پیار اور موت سے فرار انسانی فطرت کی کمزوری ہے لیکن انسانی خواہش کی حکم ربانی کے سامنے کوئی وقعت نہیں ہے اور جو اس دنیا میں آیا ہے ایک نہ ایک دن اسے جام موت چکھنا ہی ہے کہ یہی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔موت سب تدبیروں اور تقدیروں پر حاوی ہے۔ ہر انسان کے معاملہ میں ہمیشہ موت کی ہی فتح ناگزیر ہے۔انسانی زندگی ازل سے موت سے ہارتی چلی آرہی ہے اور ابد تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

''انگریز قوم کا موت کے بارے میں ایک اپنا مخصوص نظریہ ہے ایک اپنا الگ تصور ہے۔ یہ تصور غلط ہے یا درست (ہمارے لیے قرآنی فرمان ہی حرف آخر ہونا چاہیے) لیکن یہ ہے بڑا حوصلہ افزاء اور کسی حد تک دلنواز بھی۔ یہ لوگ بھی دنیا کے موج میلوں سے روٹھ کر موت کے اندھیروں میں گم گشتہ ہونا نہیں چاہتے لیکن موت ان کا بھی مقدر ہے اور وہ بھی ہر لمحہ اور ہر ساعت مرتے رہتے ہیں لیکن ان لوگوں کی یہ خوبی ہے کہ یہ موت کے احساس سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ قریب قریب ہر انگریز مرد اور عورت اپنی زندگی میں ہی باضابطہ وصیت تیار کروا لیتے ہیں کہ اس کے اس عالم رنگ و بو سے آب و دانہ ختم ہونے کے بعد اس کی جائیداد اور اثاثے کیسے اور کن لوگوں میں تقسیم ہونے چاہیں۔اس وصیت میں کفن دفن کے طور طریقوں کے بارے میں

بھی واضح ہدایات کا اندراج ہوتا ہے میں نے برطانیہ میں اپنے طویل عرصہ قیام کے دوران آج تک منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی تقسیم کے سوال پر انگریزوں میں مقدمہ بازی کا ایک بھی واقعہ دیکھا ہے اور اور نہ سنا ہے۔ انگریز لوگ احساس موت کو کس حد تک اپنی سوچوں میں رچائے بسائے رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ آپ لندن کی رہائشی مس شرلی گرز کے فعل و عمل سے لگا سکتے ہیں شرلی کی عمر صرف 21 سال تھی اور وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں انگلش لٹریچر میں ڈگری کورس (بی اے آنرز) کے دوسرے سال کی طالبہ تھی بڑی ذہین اور خوبصورت لڑکی تھی امیر ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اس کی ماں کو شدید قسم کا دمہ ہو گیا اور برطانیہ کے موسم کی بدمزاجی اور بے کیفی نے اس کا جینا دوبھر کر دیا چنانچہ شرلی کی ماں اور باپ اپنے تمام اثاثے جن کی ملکیت دو ملین پونڈ تھی۔ اپنی بیٹی کے نام لگا کر خود ہمیشہ کے لیے نیوزی لینڈ کے ایک قدرے گرم علاقہ میں منتقل ہو گئے۔

بدقسمتی سے گزشتہ سال کرسمس کی شام کو شرلی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زندگی کی بازی ہار گئی۔ شرلی کے یہ کھیلنے اور موج مستی کے دن تھے اور عمر کے اس ابتدائی مرحلہ پر نوجوانوں کو موت کی فکر کم ہی ستایا کرتی ہے لیکن اس انکشاف سے کہ شرلی نے اپنے تمام اثاثوں کے متعلق ایک قانونی وصیت تیار کروا رکھی تھی۔ ہر شخص ششدر رہ گیا۔ اس وصیت کے ذریعہ اس انسانیت کی پجاری نوجوان لڑکی نے اپنی تمام جائیدا کینسر ریسرچ اور انسداد بے رحمی حیوانات کے ادارے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔"

اس کے برعکس ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے کبھی مرنا ہی نہیں ہے لہٰذا دل کھول کر بے ایمانیاں کرتے ہیں یہ احساس موت سے بے نیازی کا ہی نتیجہ ہے۔

سبق

ہمیں موت کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کسی وقت آ سکتی ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر مرد اور عورت کو جس کے پاس کچھ قابل تقسیم مال ہو، اپنا تحریری وصیت نامہ تیار رکھنا چاہئے۔ یہ کیوں ضروری ہے، سنیے: **"کلام پاک کے مطابق وصیت کرنا فرض**

ہے“ مگر بقول مولانا مودودی صاحب، بعد کے لوگوں نے وصیت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ بالعموم وصیت کا طریقہ منسوخ ہو کر رہ گیا، لیکن قرآن مجید میں اسے ایک حق دار قرار دیا گیا ہے۔

میں نے جب ریسرچ شروع کی ہے تو تب پتہ چلا کہ ہم نے اسلام کے بہترین اور حقیقت پسندانہ زندگی کے تمام خوبصورت نظریات غلط کر دیئے ہیں جس میں ہر وقت ہر مسلمان کے پاس تحریر شدہ اور اپ ٹو ڈیٹ وصیت نامہ ہونا فرض بھی شامل ہے, مگر ہم نے اسے مستحب یا optional بنا کر اس کی پریکٹس ہی ختم کر دی ہے۔ اسی لیے میں ہر کتاب میں عام مسلمانوں سے اپیل کرتا رہتا ہوں کہ خدا کے لیے آگے بڑھیں اور اسلامی نظریات کو پھر سے دریافت کر کے سب کے ساتھ شیئر کریں تبھی ہم دوبارہ ترقی کر سکیں گے۔ ہر مسلمان کے پاس تحریری وصیت کی ہر وقت موجودگی بارے حدیث مبارک روایت ہے۔

عَنْ اِبْنِ عُمَرُ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰه ﷺ مَا حَقُّ امْرَاٍ مُسْلِمٍ يَبِيْتُ لَيْلَتَيْنِ وَلَهٗ مَا يُوْصِيْ فِيهِ اِلَّا وَصِيَّتَه' مَكْتُوْبَةً'' عِنْدَه' (ترمذی جلد اول صفحہ 777)

"IT IS NOT PERMISSIBLE FOR ANY MUSLIM WHO HAS SOMETHING TO WILL, TO STAY FOR TWO NIGHTS WITHOUT HAVING HIS LAST WILL AND TESTAMENT WRITTEN AND KEPT READY WITH HIM" ABDULLAH BIN OMAR (RA)

ہمیں اس حدیث پر فوراً عمل کرنا چاہیے تھا مگر ہمارے برعکس تمام گورے اس پر عمل کرتے ہیں اور تحریری وصیت نامہ پاس رکھتے ہیں اور رسماً ہر سال اس کو اپ ڈیٹ کرتے ہیں۔ اس موضوع پر میری کتاب ”تحریری وصیت نامہ لکھنا کیوں ضروری ہے اور کیسے لکھا جانا چاہیئے“، ”ہاشمی پبلشرز، احمد بک کارپوریشن، کمیٹی چوک راولپنڈی سے خرید سکتے ہیں یا میری ویب سائٹ سے فری ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔www.askallah.com.pk

☆......☆......☆

۳۶۔ مال دار ہونے کے باوجود سادہ زندگی گزارنا یعنی رضا کارانہ فقر ہی سنت ہے

رسول کریم ﷺ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کی آمدنی کم تھی بلکہ وہ زیادہ تر خیرات کر دیتے تھے، اور سادہ رہنا ان کا شعوری فیصلہ تھا۔ فقر اپنی چوائس سے تھی، نہ کہ مالی مجبوری کی وجہ سے۔

آج کل لوگوں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کا رجحان ہے۔ کچھ میڈیا، اشتہارات نے مصنوعی ڈیمانڈ پیدا کر دی ہے جس سے بھی لوگ معاشی مشکل محسوس کر رہے ہیں۔ امریکہ میں ایک عورت نے اپنا انوکھا تجربہ شیئر کیا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ میں بالکل سادہ رہوں گی اور کوئی نئی چیز نہیں خریدوں گی۔ دیکھتی ہوں کہ مشکل تو پیش نہیں آتی۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں بالکل محسوس بھی نہیں ہوا کہ زندگی میں کچھ کمی آئی تھی بلکہ میں نے 37,000 ڈالر سال میں بچا لیے ہیں۔

مغرب میں اب پھر سے سادہ زندگی کی طرف رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ سادہ زندگی کو مغرب میں ایک نئی تحریک جسے minimalism یعنی کم سے کم سامان کے ساتھ آرام اور سکون کی زندگی گزارنے کو کہتے ہیں۔ نظریہ کیا ہے؟ کہ موجودہ دور میں زندگی کی ایک بڑی مصروفیت چیزیں خریدنے یا شاپنگ کے گرد گھومتی ہے جو کہ مارکیٹ اکانومی کی وجہ سے ہے جس میں اشتہارات کے ذریعے مصنوعی خواہش پیدا کی جاتی ہے اور ضرورت نہ ہوتے بھی لوگ اس پراڈکٹ کو خریدنے لگتے ہیں۔ جیسے موبائل کا نیا ماڈل آتے ہی اسے خریدنے کی دوڑ لگ جاتی ہے اور وہ سٹیٹس سمبل بن جاتا ہے۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ہم چیزوں کو انسانوں سے زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں

اور چیزیں، جذبات،صحت، تعلقات،مقاصد، ذاتی ترقی، دوسروں کی مدد، کرنے سے روک دیتی ہیں۔ جبکہ خود سوچ کر فیصلہ کرنے سے بہت بچت ہوسکتی ہے جو دوسری ضروریات پر لگا سکتے ہیں۔ یا صدقہ خیرات دے سکتے ہیں۔سادگی کا مقصد ہر کام سوچ کر مقصد بنا کر کرنے کا ہے۔سادہ زندگی کے فوائد یہ ہیں؛۔۔

سادگی سے ہمیں بہت سی چیزوں سے آزادی مل جاتی ہے۔جیسے ڈر،خوف کہ پیسے نہ ہوئے تو زندگی کیسے گزرے گی۔ مالی فکر، کنزیومر کلچر،سادگی ان کو مقاصد سے بھر پور زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتے ہے۔سب سے اہم یہ کہ فضول خرچی سے بچ کر جو رقم اور وقت بچتا ہے وہ دوسری اہم چیزوں کرنے پر توجہ دینے پر مائل کرتی ہے تا کہ ہم اپنی مرضی سے خوش بھی رہیں اور انسان دوستی کے کام بھی کر سکیں۔

ا۔وقت بچاتی ہے۔۲۔حال میں رہنا سکھاتی ہے، مستقبل کا سوچنے کی پریشانی سے بچاتی ہے۳۔اپنے مرضی کے کام کر سکتے ہیں۔۴۔اپنے زندگی کے مشن کا احساس دلاتی ہے۔ ۵۔ پیداوار بڑھاؤ۔ خرچ کم کرو جس سے فارغ دولت بچ سکتی ہے۔ ۶۔صحت پر توجہ دی جا سکتی ہے۔ ۷۔ ذاتی ترقی پر توجہ دی جا سکتی ہے۔۸۔ دوسروں کی ترقی میں مدد دی جا سکتی ہے۹۔ بھنگ بھوسڑے، یعنی غیر ضروری چیزوں کو سنبھالنے سے بچا جا سکتا ہے۔۱۰۔ چیزوں میں خوشی تلاش کرنے سے بچا کر بے اطمینانی بے قراری سے بچاتی ہے۔اور یوں سکون دیتی ہے۔ ہر ایک اپنے لیے فیصلہ کرسکتا ہے کہ کیا چیزیں فالتو ہیں۔سادگی کے لیے آپ کو دوسروں سے مقابلے کے مائینڈ سیٹ سے نکلنا ہو گا۔تبھی سادگی خوشی کے ساتھ انجوائے کی جا سکتی ہے۔

میں چار سال دہلی گزار کر آیا ہوں، وہاں دیکھا کہ ہندو بہت سادہ رہتے ہیں، ان کے برعکس سکھ شوشا کے شوقین ہیں۔ ہمارا بھی یہی حال ہے کہ آج کل لوگ مقابلہ کا ذہن رکھتے ہیں۔جبکہ جاپانی امیر ہونے کے باوجود، گھروں میں ہمیشہ سے ہی سادگی کو ترجیح دیتے آئے ہیں۔اگر چہ جاپانیوں کی سادگی کی وجہ وہاں کے زلزلے بھی ہیں مگر زیادہ اہم وجہ یہ سوچ ہے کہ جتنی چیزیں کم ہوں نگی، اتنا ہی گھر میں ترتیب رکھنی صفائی

وغیرہ کرنا آسان بن جاتا ہے، مثلاً بیڈروم میں بستر کی جگہ میٹرس استعمال کرتے ہیں اگر بستر ہوتو ایک ٹیبل اور کرسی۔ الماری میں صرف وہ کپڑے رکھتے ہیں جو زیرِ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مہینوں نہ پہننے والے بھی لٹکے رہیں۔ فرج میں کم سے کم چیزیں رکھتے ہیں۔ فریش چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کچن میں صرف وہ برتن ہوتے ہیں جو روزانہ استعمال ہوتے ہیں۔ سٹڈی میں صرف ٹیبل اور کرسی ہوتی ہے تاکہ توجہ نہ بٹے۔ گھر میں فینسی لائیٹیں نہیں ہوتیں۔

سبق

سادہ زندگی سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں ہم ذرائع سے زیادہ خرچ کرنے، شوشا، مقابلے کی بد عادات میں گرفتار ہیں۔ ناک کی حفاظت ضروری ہے۔ ان سے نکل کر اپنی آمدنی کے مطابق رہنا سیکھیں تو سکون قلب ملے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ضائع کرنے کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔

نیشنل لیول پر قرض لے کر گزارہ کر رہے ہیں جبکہ آزادی کے بعد پورے چین میں شوگر یا چینی کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا کیونکہ شوگر امپورٹ کرنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے جو چینی ملک میں بنتی تھی وہیں صرف بچوں، مریضوں اور مہمانوں کے لیے مخصوص کر دی گئی۔

آزادی کے بعد چائنا ایئرلائن کی ایئرہوسٹس بھی تمام قوم کی طرح صرف سٹینڈرڈ کوٹ پتلون پہنتی تھیں۔ جب ایک دن چائنا ایئر کی فلائٹ اسلام آباد آئی تو ایئرہوسٹس اور پائلٹ نئی وردی میں نکلے تو ہم نے کپتان سے پوچھا تو مختصر جواب دیا۔ "We can offord it now."۔ یہ حقیقت پسند قوموں کی سوچ ہوتی ہے جبکہ ہم نے مغرب کے رول ماڈل کو اپنا کر حلیہ بگاڑ لیا ہے۔

☆......☆......☆

۳۷۔لوگوں کوان کے مراتب کے مطابق عزت دینا سنت ہے۔

حدیث: انزلوا الناس منازلھم

''ایک قبیلے کا سردار ملنے آیا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو یہی بات کہہ کر استقبال کے لیے بھیجا کہ لوگوں کوان کے مراتب کے مطابق عزت دینا۔''

(ریفرنس: مطالعہ سیرت، مولانا وحید الدین خان)

''آپ کے سارے فیصلے اور اعمال انسانی فطرت کے عین مطابق ہوتے تھے۔اسی لیے اسلام دین فطرت کہلاتا ہے۔ یہ دراصل معاملاتی حکمت یاsocial interaction کے اصول پر مبنی سنت ہے۔اس اصول کا لحاظ کرنا بہت اہم معاشرتی اصول ہے۔جس گھر دفتر یا کلچر میں یہ اصول پریکٹس نہ ہووہ فساد سے بھر جائے گا۔ یہ فطرت کا اصول ہے کہ ایک دوسرے کا لحاظ کریں کسی کی تحقیر نہ کریں۔ ہر شخص کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس کی اس کے مرتبے کے مطابق مناسب عزت دی جارہی ہے۔تو جس معاشرے یا کلچر میں یہ عادت ہوتو اس میں باہمی محبت پیدا ہوتی ہے،فساد یا انتشار کی جڑ کٹ جاتی ہے۔''

''ایک صاحب نے اپنے باس سے اختلاف کیا تو جھگڑا ہو گیا۔ٹینشن سے بیمار ہو گئے تو کسی نے بتایا کہ انگریز ٹھیک کہتے ہیں کہ باس ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔آپ کو چاہیے تھا کہ اس کو سمجھاتے ، نہ مانتا تو اس کی بات مان لیتے۔

اگر نہ مانتا تو غلط عمل کی اس کی ذمہ داری ہوتی۔‘‘

میں اس اصول کے استعمال کا اپنا ذاتی تجربہ سناتا ہوں۔ میں نے جب ایک کمپنی میں بطور مینیجر کام شروع کیا تو دیکھا کہ ڈرائیور، کلینر، لوڈر کسی کام سے میرے دفتر آتے تھے تو کھڑے رہتے تھے۔ پوچھنے پر سٹاف نے بتایا کہ پہلے مینیجر کا یہی حکم تھا۔ میں نے اسے تبدیل کر دیا کہ جب بھی کوئی آئے تو اپنی باری لینے کے لیے بیٹھ جائے، کھڑا نہ رہے۔ اگر اور کوئی آدمی نہ ہوتا تو میں خود کہتا کہ بیٹھ جاؤ۔ ساری بات سن کر یا کام کر دیتا یا اگر کمپنی کے رولز اجازت نہ دیتے تب بھی وجہ بتا دیتا۔ الحمدللہ کہ صرف ان کو عزت دینے سے ڈسپلن میں نمایاں بہتری آئی۔ کام نہ بھی ہوتا تو تب بھی سٹاف خوش جاتا تھا کیونکہ اس کو عزت دی گئی ہوتی تھی۔ دھیان سے بات سنی جاتی تھی اور کام نہ کرنے کی وجہ بھی بتائی جاتی تھی۔

ایئرپورٹ پر بھی کسی وی آئی پی کے رتبے اور سوشل مقام کے مطابق پروٹوکل دیا جاتا ہے۔ شادیوں میں بھی دولہا کے لوگوں کو رواج کے مطابق عزت دی جاتی ہے۔ اسی طرح خاندانوں میں بزرگوں کو عزت دینے کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ اساتذہ کو عزت دینے کا مختلف طریقہ ہوتا ہے۔ مگر عزت دینا اور ہوتا ہے اور عقیدت میں غلام بن جانا دوسری بات ہے جس کی اسلام میں اجازت نہیں۔ کیونکہ غلامی صرف اللہ کی ہوتی ہے

آپ مشاہدہ کریں گے کہ بچے بھی عزت ڈیمانڈ کرتے ہیں۔ نہ دی جائے تو برا بھی مناتے ہیں اور ظاہر بھی کرتے ہیں تو جب یہ پیدائش سے انسان کی فطرت میں ہے تو پھر اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ عورتیں تو اس معاملہ میں بہت حساس ہوتی ہیں۔

کھانے کے دوران کس نے مہمان خصوصی کے ساتھ کس جگہ بیٹھنا ہے اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ابوظہبی کے عرب کلچر کی کہانی بڑی مختلف اور عجیب ہے جو میں شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ابوظہبی کے پہلے یوم آزادی پر میں نے فلائی پاسٹ میں حصہ لیا تو شیخ زائد نے اسی وقت حکم دیا کہ تمام فائٹر پائلٹس کو شام کے سٹیٹ ڈنر میں مدعو کر لیا جائے۔

شیخ کے محل پہنچے تو ہم نے اپنی ایئر فورس کی رسم کے مطابق پوچھا کہ سیٹنگ میں ہماری کرسی کون سی ہوگی تو عرب افسروں نے بتایا کہ شیخ اپنے مہمانوں میں فرق نہیں کرتے جہاں مرضی ہو بیٹھ جائیں۔ ٹیبل پر چمچ بھی نہیں تھی ہاتھ سے کھانا تھا۔ ہمیں عرب افسروں نے گائیڈ کیا کہ جب کھانا ختم کرلیں تو شیخ کی پرواہ نہ کریں کہ وہ ابھی کھا رہے ہیں بلکہ اُٹھ کر میٹھے کے لیے چلے جائیں اور پھر قہوے کے لیے دوسرے کمرے میں انتظار کریں۔ یہاں قہوے کے بعد شیخ کے جانے کا انتظار کرنا ہوتا ہے تب جا سکتے تھے۔ جبکہ ہماری رسم کے مطابق جب تک مہمان خصوصی کھانا ختم نہیں کرتا اس وقت تک بیٹھے رہیں اس کے اٹھنے کے ساتھ ہی باقی مہمان اٹھتے ہیں۔ ٹیبل پر ہی کھانا سویٹ چائے کافی دی جاتی ہے۔

ہمیں اس لیے ہر رسم، عادت کے لیے اسلام کے پکے یونیورسل اصول اور عرب کلچر میں فرق کو سمجھنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہر ملک کا کلچر ہی اسلام کی لوکل پریکٹس قرار دے لیا جاتا ہے۔ جیسے کہ کھانے میں صرف چند باتیں اسلام کی ہیں جیسے بسم اللہ سے شروع کرنا اور الحمدللہ پر ختم کرنا۔ اور حلال حرام میں فرق کرنا۔ باقی عرب عادات ہیں جیسے ہاتھ سے کھانا، ریت پر بیٹھ کر کھانا۔ یہ عرب کلچر دورِ جاہلیت میں بھی پریکٹس ہوتا تھا۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے بھی ہوتا تھا مگر پاکستان میں مٹی کی وجہ سے زمین پر بیٹھنا ممکن نہیں ہوتا تو اس کی بجائے چارپائی یا چھوٹی پیڑھی یا دری چٹائی پر بیٹھنے کا رواج مجبوری بنا۔ سرد موسم برف والے علاقوں میں کرسی میز پر کھانا موسم کی کی مجبوری کی بنا پر بنا ہے۔ تو ان کے استعمال میں غیر اسلامی والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ اس لیے لکھا ہے کہ کینیڈا میں یہ سوال ضرور پوچھا جاتا ہے۔ ہمیں نئے سرے سے اسلامی آداب کو لکھنے کی ضرورت ہے اور کلچر کے حصے کی پہچان بھی کرنی ضروری ہے کہ یہ حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔

یہ سب بتانے کا مقصد ہے کہ ہر گھر، خاندان اور ملک کے کلچر کی عزت دینے کی اپنی رسوم ہیں۔ دوسرے ملک جائیں تو ان کا جاننا ضروری بن جاتا ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ آداب کی تعلیم اور تربیت بہت اہم موضوع ہے مگر ہم نے اس پر کتابیں نہیں لکھیں جبکہ مغربی ممالک میں آداب کے ہر موضوع پر ڈھیر ساری کتابیں مل جائیں گی۔ آداب

عورتوں کے موضوعات ہیں مگر ہم نے انہیں بے عقل قرار دے کر تہذیب سکھانے کے عمل سے نکال دیا ہے۔ جو بدقسمتی کی بات ہے مگر اب ہمیں ان کا جائز مقام واپس دینا چاہیئے۔

ہر معاشرے میں ہر ادارے کے عزت دینے کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ فوجی طریقے اور ہیں، مذہبی رسومات کے مختلف ہیں، شادی بیاہ کے اور بھی مختلف۔ علمی اداروں کے مختلف۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں ہر موقع کے آداب کا پتہ ہونا چاہیئے۔

سبق:

دنیا گلوبل ویلج بننے اور سفر کی سہولیات سے اب ہر ملک میں آمدورفت عام ہو گئی ہے۔ اس لیے انٹرنیشنل آداب کا جاننا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ معاشرتی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں۔

ہمارے اپنے ملک میں بھی چونکہ ہر صوبے کا کلچر مختلف ہے تو ہم ان پر علیحدہ کتابیں بھی لکھ سکتے ہیں اور ایک مشترکہ پاکستانی کلچر پر بھی لکھ سکتے ہیں۔

یہ خواتین کا شعبہ ہے انہیں اس فیلڈ میں آنا چاہیے اور لکھنا چاہیے تا کہ دیہات، شہروں میں یکساں اسلامی اور پاکستانی کلچر ڈویلپ ہو۔

☆......☆......☆

۳۸۔ حقیقت پسندی بھی بہت اہم سنت ہے۔

جب آپ کسی چیز یا شخص کو تبدیل نہیں کر سکتے تو پھر صبر کرنا اور صحیح وقت کا انتظار کرنا بھی سنت طریقہ ہے۔ کیونکہ ہر انسان کا صرف اس کے اپنے اوپر کنٹرول ہوتا ہے دوسرے کیا سوچتے اور کرتے ہیں اس پر نہیں ہوتا۔

''حضرت موسیٰ نے کہا۔ یا خدا میرا صرف اپنے بھائی اور اپنے اوپر کنٹرول ہے تو ہمیں ان نافرمان لوگوں سے الگ کر دے۔ سورہ مائدہ 5-25۔'' انہوں نے یہ الفاظ تب کہے تھے جب بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ دشمن بڑا تنگڑا ہے آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں۔

''حقیقت پسندی کیا ہے؟ فطرت کے جبر کو قبول کرنا اور اس سے نہ جھگڑنا ہی حقیقت پسندی کہلاتی ہے، بارش ہو تو سائے میں آ جائیں۔ زلزلہ ہو تو سائے سے نکل کر باہر جائیں۔ ایک میں سائے میں آنا، دوسرے میں اس سے نکل جانا پسپائی نہیں بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ جہاں فطرت اور انسان کا مقابلہ ہو، تو فطرت کو بدل نہیں سکتے نہ قابو پا سکتے ہیں بلکہ اپنے نقصان سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اعراض کا اصول استعمال کر کے اس کی زد سے نکل جائیں۔'' (ریفرنس: مطالعہ سیرت۔ مولانا وحید الدین)

''یہی صبر اور اعراض کے اصول پریکٹس کرنے میں بھی ہے کہ یہ پسپائی یا بزدلی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت پسندی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کی غرض سے آزادی دی ہے۔ آپ کا دوسروں پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا کہ وہ آپ کے ساتھ کیا کرتا ہے جبکہ آپ کا صرف اپنے

آپ پر کنٹرول ہوتا ہے کہ آپ کیسے ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرا کوئی بھی شخص آپ سے برتاؤ میں اپنے فیصلے اور عمل کی آزدی کا صحیح استعمال بھی کر سکتا ہے اور غلط بھی۔ اگر غلط کرے گا تو آپ کے ردعمل سے یقیناً جنگ یا لڑائی ہو جائیگی۔ صبر کرلیا تو اس لڑائی سے اور فوری نقصان سے بچ جائیں گے۔ اگر آپ لڑیں گے تو دوسرے کے فیصلے کرنے کی آزادی چھیننے کی بے فائدہ کوشش کریں گے۔ ہر ایک اپنے کو ہی صحیح سمجھتا رہے گا کبھی غلطی نہیں مانے گا۔''

''صبر اور اعراض کر کے اپنا سفر جاری رکھنا ہی صحیح پالیسی ہے۔ صبر کرنا یا پھر لڑائی کرنے یا الجھنے سے بچنا دوسروں کا مسئلہ نہیں بلکہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے، بے صبری سے سفر وہیں رک جاتا ہے، جبکہ صبر سے آپ سفر جاری رکھ کر من پسند منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔''

سیرت کی تمام کتابیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ آپ نے کبھی بھی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا بلکہ مقصد کو سامنے رکھتے تھے اور اس کے مطابق برتاؤ کرتے تھے۔ اور زیادتی کو معاف کر دیتے تھے۔ کیا ہم ٹریفک میں بھی یہی نہیں کرتے؟ اگر کوئی غلط اوورٹیک کرے، یا الٹی طرف سے آ رہا ہو تو ہم اپنے آپ کو ایکسیڈنٹ سے بچاتے ہیں۔ اس سے لڑتے جھگڑتے نہیں کہ تم غلط ڈرائیونگ کر رہے ہو۔ اگر کسی کو ٹوکیں گے تو متکبر پاکستانی کیا کر سکتے ہیں۔ سُنیں؛ اخبار میں آ چکا ہے کہ کسی نے غلط اوورٹیکنگ پر ہارن بجاد یا تو اس نے آ کر لڑائی شروع کر دی کہ مجھے غلط کہہ کر بے عزتی کی ہے۔ ایک ووکس ویگن نے پیجارو کو اوورٹیک کیا تو اس نے بے عزتی سمجھ کر ڈرائیور کو گولی مار دی۔ ہمارے لوگوں میں عزت وتوقیر کے غلط نظریے یا تکبر کی وجہ سے برداشت بہت کم ہوگئی ہے۔ یہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ہر لیول پر یہی کچھ ہو رہا ہے۔

اس لیے اپنی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ٹریفک کا یہی اصول انسانوں سے برتاؤ میں بھی استعمال کرنا چاہیے۔ اپنے آپ کو معاشرتی یا سوشل ایکسیڈنٹ،

تعلقات میں لڑائی جھگڑا ہونے سے بچائیں جیسے کہ روزے کی حالت میں یہ کہنا کافی ہے کہ مَیں روزے سے ہوں۔

پہلے جاپان کی مثال دی جا چکی ہے کہ دونوں بار شکست کے بعد اپنے دشمن ہی کو فاتح اور بڑا مان کر اسی کی مدد سے پھر سے اس کے مقابلے کی طاقت بن گئے۔ مگر ہم نے شروع ہی سے امریکہ کو کہا کہ ہم برابری کے لیول پر تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر حقیقت پسندی سے کام لیتے اور اپنی انا کی قربانی دے کر ترقی کرنے تک صبر کرتے تو آج ہم بھی کوریا کی طرح معاشی قوت ہوتے۔ جس سے ہی ہم فوجی قوت بن سکتے تھے۔

ہمارے مذہبی ذہن کے لوگ اب بھی دنیا کو اہمیت نہ دینے کی نصیحت کرتے ہیں جو کہ حقیقت پسندانہ بات نہیں ہے۔ معاشی قوت یا امیر ملک بنے بغیر نہ ہم تعلیم کے لیے ماڈرن سکول، کالج یونیورسٹیاں بنا سکتے ہیں، نہ صحت کے لیے ہسپتال، نہ ذرائع آمدو رفت کے لیے بڑی ایئر لائین، ریلوے یا بس سروس۔ ہر چیز امپورٹ کرتے ہیں۔ اپنی چیزوں کے بغیر کیسے طاقت حاصل کر سکتے ہیں اور خالی خولی اسلام کے غلبے کی بات کرتے رہنے سے غلبہ تھوڑا ملے گا بلکہ دشمن کو الرٹ کر کے مار ہی کھائیں گے۔ کیا یہی کچھ نہیں ہو رہا۔؟ وجہ یہ ہے کہ ہم نے کبھی بھی حقیقت پسندانہ تحقیق اور سٹڈی نہیں کی، نہ ہی دشمن کے ممکنہ ردعمل کا اندازہ لگایا ہے۔

سبق

ہمیں بھی سنت رسول پر عمل کرنا چاہیئے اور حقیقت پسند بننا چاہیے اور لوگوں کے غلط رویوں کی وجہ سے ردعمل نہیں دکھانا چاہیئے۔ اور نہ ہی اپنا نقصان کرنا چاہیے بلکہ لڑائی جھگڑے سے بچنے میں بہت بڑا ثواب ہے۔ صبر پر اسی لیے بہت بڑا اجر اور ثواب ہے کیونکہ اس سے معاشرے میں لڑائی جھگڑے سے بچ کر امن قائم رکھا جاتا ہے۔

زندگی اتنی چھوٹی ہے کہ فضول کاموں میں خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ جب آپ حالات کو بدل نہیں سکتے تو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی جگہ ہمارے پاس صرف

ایک آپشن ہوتا ہے کہ دعاء کر سکتے ہیں، وہ ضرور کریں۔ اور اپنے بڑے مقصد کو سامنے رکھیں اور اس کے حصول پر نظر رکھیں۔ ہر وقت، ہر بات میں عزت، بے عزتی کے چکر میں پڑنے والے انہی جھگڑوں میں الجھے رہتے ہیں۔

حقیقت پسند بن کر ہی سیاسی، مذہبی یا معاشی نعرے لگانے چاہئیں۔ الیکشن میں حقیقت پر مبنی وعدے کرنے چاہئیں جو پورے کرسکیں۔ معاشی حقائق پر مبنی ہی سٹینڈرڈ آف لونگ رکھنا چاہیے۔ چین کی ایک پوری نسل سادگی سے زندگی گزار کر ملک کو بے مثال معاشی طاقت بنا گئی۔ جبکہ ہم نے شروع سے ہی شوشا کی زندگی اپنائی اور قرض لے کر عیاشی کر رہے ہیں۔

ہمیں اپنے ملکی اور اجتماعی مستقبل کی فکر ہونی چاہیے۔ باقی تمام ترجیحات اس کے تابع ہونی چاہیے اور ان کو ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ بقاء سب پر ترجیح رکھتی ہے۔

☆......☆......☆

۳۹۔ صرف تین دفعہ دستک دینا یا گھنٹی بجانا سنت ہے

1992ء میں مَیں انگلینڈ اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ناشتہ کی میز پر ان کے بچوں سے بات ہو رہی تھی۔ وہ احساس کمتری کا شکار تھے کہ ہمارے اسلامی سسٹم قابل عمل نہیں جس کی ہمیں تعلیم دی جاتی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ غلطی ہماری ہے کہ ہم نے قرآن اور اسوۂ حسنہ سے زندگی کے اصولوں کو دریافت ہی نہیں کیا اور ان کو ماڈرن ٹریننگ لوجی میں اپلائیڈ اسلام کی شکل نہیں دی۔ اس لیے احساس کمتری ہے۔ بچوں نے مثال دینے کے لیے کہا۔ اتفاقاً اس وقت میرے ذہن میں ایک حدیث آئی جو کہ پی ٹی وی روزانہ خبروں سے پہلے دیا کرتا تھا۔ جو یوں ہے۔ ''کسی کے یہاں جا کر تین دفعہ سلام کہو (یعنی دستک دو) اگر وہ جواب نہ دیں تو واپس آ جاؤ اور برا بھی مت مناؤ۔'' اس زمانے میں بجلی نہیں ہوتی تھی تو اپنے آنے کی اطلاع یا تو زور سے سلام کر کے کرتے تھے، یا دروازے پر دستک کی آواز سے کرتے تھے، یا باہر کی لوہے کی کنڈی کو زور زور سے ہلا کر آواز پیدا کرتے تھے۔ اس کو میں نے تفصیل سے بتاتے ہوئے PRINCIPLE OF CALLING کا نام دیا کہ اصول یہ ہے کہ یا تو پہلے ٹیلیفون پر وقت مقرر کر کے جاؤ اور اگر بغیر کال کے جاؤ تو تین دفعہ سلام یا دستک کی جگہ تین دفعہ گھنٹی بجانے کا یہ اصول اپناؤ جو رسول اکرم ﷺ نے بتایا ہے۔

بچے سن کر حیرت زدہ رہ گئے اور کہنے لگے کہ انگریز تو واقعی اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔ یعنی ایک دفعہ گھنٹی بجا کر کچھ دیر انتظار کرتے ہیں پھر دوسری گھنٹی بجاتے ہیں، کچھ دیر بعد تیسری دفعہ گھنٹی بجاتے ہیں۔ اگر جواب نہ ملے تو واپس آ جاتے ہیں۔ جون 2017 میں انگلینڈ کی وزیر اعظم رابطے کے لیے لوگوں کے گھر جا رہی تھی تو ہر گھر پر تین بار ہی گھنٹی بجاتی تھی جو نہیں آتا تھا تو واپس چلی جاتی تھی۔ ہم سب کے لیے یہ سب

ٹی وی پر بڑا اسبق آموز نظارہ تھا۔ کہ سنت پر کیسے عمل کیا جا سکتا ہے یہ انگریز ہمیں سکھا رہے تھے۔

الحمدللہ کہ بچے اس حدیث کی مثال سے قائل ہو گئے کہ واقعی ایسی بات ہے کہ انگریزوں نے اسلامی اصول کو ہی مثال بنایا ہے اوران کے اس حدیث پر عمل کرنے کے عمل سے ہمیں بھی اپنے ہی اسلامی اصول کو اپنانے کی ترغیب ملنی چاہیے۔ اور ہمیں قائل ہو جانا چاہیے۔ کہ اسلامی اصول آج بھی قابل استعمال ہیں، اور ہمیں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ صرف اصولوں کے استعمال کو نئی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ وقت کے ساتھ نئی terminology استعمال کرنی ہے۔

ISO 9000 یعنی انٹرنیشنل سٹینڈرڈ آرگنائزیشن کے سٹینڈرڈ میں بھی یہی سٹینڈرڈ مقرر ہے کہ ہر سٹاف کو ٹیلیفون کی تین گھنٹیوں سے پہلے فون اٹھا لینا چاہیے اگر وہ نہیں کرتے تو کمپنی ٹسٹ میں فیل قرار دی جائے گی کہ سٹاف کو صحیح ٹریننگ نہیں دی گئی۔ کہ کال کرنے والے کو انتظار نہیں کراتے اور لائین استعمال میں رکھتے ہیں۔

انگریزوں کے برعکس ہم پاکستانی گھنٹیاں بجاتے رہتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں آدھے منٹ میں آپ گیٹ پر موجود ہونگے۔ reaction time کا بھی نہیں سوچتے کہ بندہ باہر آتے کچھ تو ٹائم لے گا اور بعد میں گلہ بھی کرتے ہیں کہ اتنی دیر سے گھنٹیاں بجا رہا ہوں۔ یہ بات دراصل آداب سے تعلق رکھتی ہے اور ہم نے صدیوں سے تہیہ کیا ہوا ہے کہ بچوں کو آداب نہیں سکھانے اور نہ خود سیکھنے ہیں یا عمل کرنا ہے نہ ہی مغربی ممالک میں رہتے ان پر عمل کرنا ہے۔ انگلینڈ، ناروے میں ہر کسی نے یہی دیکھا ہے کہ پاکستانی بغیر اطلاع آتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں؟ کسی کی تکلیف یا وقت کا خیال نہیں کرتے۔ یہ پینڈو رویئے ہیں کہ اپنے بغیر بتائے آتے ہیں اور جتنی دیر مرضی کرے ٹھہرے رہیں یہی اپنا ہٹ کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے۔

سبق:

جب کسی کے گھر ملنے جائیں تو بہتر یہ ہے کہ پہلے رابطہ کر کے جائیں ورنہ پہنچ کر ایک گھنٹی بجائیں اور انتظار کریں۔ گھر میں سے کسی کو آتے تھوڑا وقت لگتا ہے۔ پھر دوسری گھنٹی بجا کر انتظار کریں، پھر تیسری گھنٹی بجا کر انتظار کریں اگر کوئی نہیں آتا تو اگر ممکن ہو تو اپنے آنے کی اطلاع چھوڑ جائیں جیسے رقعہ یا وزیٹنگ کارڈ۔ اور برا نہ منائیں۔ کیونکہ اپنے آنے کے ارادے کی اطلاع دینا آپ کی ذمہ داری تھی۔

ہماری عورتوں میں خصوصاً یہ بیماری ہے کہ وہ بغیر بتائے آنے سے دراصل چھاپہ مار کر دیکھنا چاہتی ہیں کہ کیسے رہتے ہیں۔ پہلے سے اطلاع ہو تو گھر صاف ستھرا کر لیا جاتا ہے۔ اور اگر گھر والے موجود نہ ہوں تو شکایت کرتی ہیں جبکہ اطلاع نہ دینے کی غلطی انکی اپنی ہوتی ہے۔

اس سنت پر عمل کرنا بہت آسان ہے بس تھوڑی سی سوچ، فیصلے اور عادت بنانے کی بات ہے۔

☆......☆......☆

۴۰۔ برائی کو برائی سمجھتے رہنا بھی سنت ہے۔

☆**حدیث:** جس کا مفہوم یہ ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روکو اگر روک سکتے ہو، اگر یہ نہیں کر سکتے تو زبان سے روکو، ورنہ دل میں بُرا جانو اور یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔''

برائی کو برا جاننا اور جانتے رہنا بھی بہت ضروری عمل ہے۔ ورنہ دیکھا یہ گیا ہے کہ وقت کے ساتھ لوگ کسی برائی کو برائی سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تو برائی جڑ پکڑ لیتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور nip the evil in the bud والی بات نہیں کی تو اب یہ حالت آ گئی ہے کہ برائی کو برائی نہ سمجھنے کی پریکٹس عام ہو گئی ہے۔ پہلے رشوت چھپ کر لی جاتی تھی اب سرِ عام دی جاتی ہے اور لی بھی جاتی ہے۔ جھوٹ، منافقت، جھوٹی گواہی، پیشہ ور جھوٹے گواہوں کی عدالت میں موجودگی، کرپشن، ملاوٹ، دو تین نمبری مال وغیرہ اخلاقی جرائم کی بھرمار ہو گئی ہے۔ جعلی ڈگری پر جب جمشید دستی نا اہل ہوا تو دوبارہ لوگوں نے اسے ہی ووٹ دیا۔ یعنی لوگوں میں جعلی ڈگری اب برائی نہیں رہی۔ ہمارے مذہبی لوگ بھی جعلی ڈگری پر نا اہل ہوئے ہیں۔ کیا یہ ثبوت نہیں کہ ہم بھی حد عبور کرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

وڈیو میڈیا بھی permissiveness کی ہی تشہیر کر رہا ہے۔ مثلاً پہلے عورتیں اذان سن کر سر ڈھانپ لیتی تھیں کہ اللہ کا نام لیا جا رہا ہے اس سے شرم و حیا کی یاد دہانی ہوتی تھی۔ اب لڑکیاں نہیں کرتیں تو اللہ کی یاد سے بھی دوری ہو رہی ہے تو حیا کم ہونے سے بے حیائی عام ہو گئی ہے۔ رمضان میں بھی ٹی وی پروگرام میں لڑکیاں بغیر دوپٹے کے آتی ہیں جو پہلے نہیں کرتی تھیں۔ نئی نسل اس کی نقل شروع کر رہی ہے تو روّیے

بدل رہے ہیں اور وہ ڈراموں اور فلموں کو حقیقت سمجھنے لگے ہیں۔ اب بچے والدین کی نسبت ٹی وی کی باتوں پر زیادہ یقین کرنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مما لک ماں اور باپ کے ساتھ ٹی وی کو تیسرے والدین میں شمار کرنے لگے ہیں۔۔ پہلے بیویاں خاوند کا نام نہیں لیتی تھیں۔ اب بیوی حفظ مراتب کی جگہ دوست بنا دی گئی ہے تو عائلی مسائل بڑھ گئے ہیں۔

پہلے مذہبی رہنما برائیوں پر شور مچاتے تھے۔ اب انہوں نے بھی سمجھوتہ کر لیا ہے کہ صرف نیک اور اچھی باتوں کی تلقین کرو۔ بری اور نقصان دہ باتوں یعنی نہی عن المنکر کی بات ہی نہ کرو۔ کون سا کسی نے بات ماننی ہے۔ الٹا لوگ دشمنی لگا لیں گے۔

یورپ کے ساتھ یہی بھی ہوا ہے اور بتدریج اپنی مرضی کرنا حتیٰ کہ اب ننگا پن بھی قابل نفرت نہیں رہا اور مغربی تہذیب نے سمجھوتہ کر لیا ہے، اب جو چاہو کرو۔ کوئی برا نہیں کہتا، اسے اب انفرادی حق قرار دے لیا گیا ہے۔ یہی اللہ کے نزدیک point of no return بن جاتا ہے اور پھر اللہ کی پکڑ آتی ہے اور اسی حالت تک پہنچنے سے منع کیا گیا ہے۔ جب تک برائی کو برا سمجھا جاتا رہے تو اچھائی کی طرف لوٹنے کا چانس رہتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ موت کے وقت کا ایمان ہی نتیجہ خیز ہوگا۔ all is well that ends well۔ برائی کے ذکر سے برائی پھیلتی ہے اور اچھائی کے ذکر سے اچھائی پھیلتی ہے۔

شیطان کا برائی پھیلانے کا بتدریج طریقہ ایک یہودی نے بتایا تھا جو چند سال قبل میں نے پڑھا تھا کہ برائی عورت کے ذریعے پھیلاؤ۔ پہلے عورت کی قمیض کے بازو کو کلائی کے درمیان لے آؤ۔ پہلے لوگ اعتراض کریں گے۔ رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی۔ چند سالوں بعد کہنی تک لے جاؤ۔ پھر شور مچے گا مگر جلد ہی عادت پڑ جائے گی۔ آہستہ آہستہ کندھے تک لے جاؤ اور sleevless بنا دو۔ ہمارے ڈراموں میں یہی ہوا ہے اب ایوارڈ شو میں ہماری عورتیں مغربی شو بز کی طرح آدھے ننگے جسم کا لباس پہن کر آتی ہیں اور کوئی برا نہیں کہتا۔ اور نہ کوئی میڈیا میں لکھتا یا شور مچاتا ہے۔ یہ رویہ دراصل

slow poison کہلاتا ہے۔

برائی کے خلاف دراصل ضمیر کی مخالفت کو بند کرنے کے لیے شیطان مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔ جس میں ایک طریقہ کلام پاک میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے۔

سبق

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ:

''نیکی اور پرہزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی میں باہم کسی کی مدد نہ کرو۔'' (سورہ مائیدہ آیت825 -28)

اس پر اور اوپر دی گئی حدیث پر عمل شروع کر دیں:

ہر گھر میں ہمیں خود اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ گھر کون سی بری یا نقصان دہ عادات ہیں۔ یہ سب کو مل کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کسی قاعدہ، اخلاق کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی۔ اگر ہو رہی ہے تو پروگرام بنا کر واپس لوٹنا شروع کریں۔ تدریج کا اصول استعمال کریں۔

اس کوشش میں یہ اللہ کا قول یاد رکھیں تو پھر آسانی رہے گی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر ایک نے اکیلے جواب دہی کرنی ہے۔ اس لیے ہر ایک کو اپنی فکر کرنی چاہیے۔ ساری دنیا خراب ہو جائے تو بھی اللہ کے یہاں آپ سرخرو ہونگے اگر آپ خود نیک ہیں۔

☆......☆......☆

۱۴۱۔صرف نیک کام کے سوچنے پر بھی ایک نیکی کا ثواب مل جاتا ہے۔یعنی ہر وقت نیک ،اچھی ، ہمدردی کی سوچیں ہی رکھنی چاہئیں۔

یہ بھی پچھلے باب ہی کی کڑی ہے۔خیالات ہی سے ہر ایکشن کا عمل شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ ہزاروں میل کا سفر بھی پہلے قدم سے ہی شروع ہوتا ہے۔مثلاً کھانے سے پہلے خیال آتا ہے کہ بھوک لگی ہے۔ پھر اس کا حل ڈھونڈا جاتا ہے کہ کیا کھایا جائے۔گھر میں یا باہر جا کر کھایا جائے۔تو خیال سے پھر فیصلہ کیا جاتا ہے،تب عمل شروع ہوتا ہے۔

آپ نوٹ کریں کہ ہر وقت ذہن میں نئے سے نئے خیالات آتے رہتے ہیں۔کہاں سے آتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ان خیالات کو آنے پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا مگر ان کو قبول کرنے یا رد کرنے پر ہمارا اختیار ہوتا ہے۔آنے والے خیالات اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔اور ہمیں ہر وقت ان میں چوائس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر برے اچھے خیال کو جو ذہن میں آئے ،سوچ کر،اس کے اچھے برے نتائج کا سوچ کر رد کرنے یا اپنانے کی عادت ہو تو تبھی صحیح فیصلے کیا جا سکتا ہے۔ جو ہر آئیڈیا پر فوری عمل شروع کر دیتا ہے اور اسے اپنے آپ پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا وہی شیطان کا تر نوالہ بن جاتا ہے۔

چونکہ عمل سوچ سے ہی شروع ہوتا ہے اس لیے بری سوچ کو قریب نہیں آنے دنیا چاہیے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس پر عمل ہو جائے۔اگر اچھی سوچیں رکھیں گے تو برے عمل کے ہونے کا چانس بھی نہیں ہوگا،اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھے خیالات رکھنا کتنے

اہم ہیں۔اس حدیث سے اندازہ لگالیں کہ صرف اچھی بات یا نیک کام کے سوچنے پر ہی ایک نیکی کا ثواب مل جاتا ہے۔حضرت ابن عباسؓ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ:

''بندے کا حساب کیسے رکھا جاتا ہے اگر بندہ نیکی کرنے کا صرف سوچتا ہے تو اس کے حساب میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے۔اگر کر لیتا ہے تو دس سے سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔اگر گناہ کا ارادہ کرتا ہے مگر نہیں کرتا تو اس کے حساب میں ایک نیکی لکھ لی جاتے ہے۔اگر وہ گناہ کر لیتا ہے تو صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت نیک سوچیں ہی رکھنی چاہئیں۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت وہ سوچ بھلائی کے کام میں بدل سکتی ہے یا موقع ملے تو فوراً نیکی کرنے کو جی چاہے گا۔غلط سوچ آئے تو اسے جھٹک کر فوراً دفع کر دیں۔ایک اور بہت مشہور حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ؛

''اللہ فرماتا ہے کہ جو نیکی کرتا ہے تو اسے دس نیکیوں کا اجر ملتا ہے۔اور میں اس کے علاوہ بھی دیتا ہوں ،اور جو ایک بدی کرتا ہے تو اس سے ایک کے برابر سزا ملے گی یا میں معاف کر دوں گا۔اور جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف آتا ہوں۔اور جو میری طرف چل کے آتا ہے تو اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں اور جو شرک کئے بغیر گناہوں سے بھرا آتا ہے تو میں اس کو مغفرت کے ساتھ ملتا ہوں۔''

تو چوائس ہماری اپنی ہے کہ اللہ کی طرف نیک نیتی اور صدق دلی سے پہلا قدم لینا ہے یا نہیں۔اگر پہلا قدم لے لیا تو آپ ولی اللہ بن سکتے ہیں۔بات خلوص اور خواہش کی شدت پر ہے۔ایک مشہور مقولہ ہے:

''ہم اپنے خیالات پر نظر رکھیں کیونکہ خیالات سے پہلے الفاظ بنتے ہیں ہم

اپنے الفاظ پر نظر رکھیں کہ الفاظ سے ہی عمل بنتا ہے۔ہم اپنے اعمال پر نظر رکھیں کیونکہ اعمال سے ہی عادات بنتی ہیں ہم اپنی عادات پر نظر رکھیں کیونکہ عادات سے ہی کریکٹر بنتا ہے اور ہم اپنے کریکٹر پر نظر رکھیں کیونکہ کریکٹر سے ہی قسمت بنتی ہے۔یعنی ہم جو سوچتے ہیں وہی بن جاتے ہیں۔''

اگر ہم جنت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے کریکٹر کو اہمیت دینی ہوگی اور اسی کو ہم اہم نہیں سمجھ رہے۔اس کی جگہ عبادات پر زور ہے جو ذاتی فائدے کا عمل ہے جبکہ کردار دوسرے انسانوں کی بھلائی اور خیر خواہی سے بنتا ہے۔ساری قومیں دیکھ لیں جنہوں نے تاریخ میں دنیا پر حکمرانی کی ہے وہ کردار کی طاقت لے کر ہی نکلے تھے۔

''انسانوں کا خیال رکھنا ہی اللہ کا خیال رکھنا ہے۔اللہ کی مخلوقات کا خیال رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ آپ کسی کے بچوں سے محبت کریں تو وہ آپ سے محبت کرنے لگتا ہے آپ اللہ کی عیال کا خیال رکھیں گے تو وہ آپ سے محبت کرے گا۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

''دین کے بعد عقل کی اساس انسانوں سے محبت کرنا اور ہر نیک و بد سے بھلائی کرنا ہے۔'' (بیہقی)

سبق:

دوسروں کے بارے ہمیشہ نیک خیالات رکھیں۔اگر کوئی برائی بیان بھی کرے تو اس کو شک کا فائدہ دیں اور کہیں کہ اگر میں بھی ایسے ہی حالات میں سے گزرتا تو شاید میں بھی ایسے ہی کرتا۔کیونکہ لوگوں کے رویے حالات کی پیداوار ہوتے ہیں ۔یہ ایک حقیقت ہے۔

اجتماعی بھلائی بارے سوچتے رہا کریں، جو کر سکتے ہیں ضرور کریں۔دوسروں کے ساتھ میڈیا کے ذریعے شیئر کریں۔اچھے آئیڈیاز، تجاویز حکومت کو، اداروں کو بھیجتے

رہیں۔۔فکر نہ کریں اس پر عمل ہوتا ہے یا کہ نہیں۔مثلاً میں نے اڈیالہ روڈ کو چوڑا کرنے کی ضرورت پر ہر وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ پنجاب، اپنے ایم این اے، ایم پی اے کو لکھا مگر کامیابی نہ ہوئی۔مگر پوٹھوہار ٹاؤن کے ناظم کو صرف ایک خط لکھا کہ برائے مہربانی کوڑا اٹھانے کا انتظام کر دیں ہم اس کے لیے پیسے ادا کرنے کے لیے تیار ہیں تو انہوں نے پہلی میٹنگ میں ہی فیصلہ کر لیا اور دو ماہ بعد ہی سسٹم شروع ہو گیا۔کام اللہ کی مشیت سے مقررہ وقت پر ہوتے ہیں؛ اس لیے کہتے ہیں کہ پہنچنا شرط نہیں ہوتا، چلنا شرط ہوتا ہے۔ نتیجہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مغربی ممالک کی ترقی کا راز ہی آئیڈیاز شیئر کرنے میں ہے۔انٹرنیٹ پر کوئی سوال کریں جواب ضرور موجود ہو گا۔کسی نہ کسی نے اس موضوع پر لکھ کر سب کے فائدے کے لیے ڈال دیا ہو گا۔

اس سنت پر عمل کرنا بھی بہت آسان ہے۔خاص طور پر جب ثواب ملنے کی خوشخبری بھی ہو۔اور اگر آپ کے آئیڈیا پر عمل ہو جاتا ہے تو صدقہ جاریہ اس کے علاوہ ہو گا، صرف مسائل اور ان کے حل سوچتے رہنے سے ذہن میں فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارا مائینڈ سیٹ صرف سیاسی یا مذہبی خبروں پر بحث تک محدود ہو گیا ہے۔ان دونوں کی بجائے اگر ہم صرف اپنے دوسرے معاشرتی مسائل پر گفتگو شروع کر دیں تو اس کے حل کا بھی سوچیں گے اور یوں زندگی بہترین بن جائے گی۔

مغربی ممالک میں مذہب اور سیاست پر گفتگو نہیں ہوتی کیونکہ یہ ہر ایک کی ذاتی سوچ اور رائے کا معاملہ ہوتا ہے۔جو صحیح بات بھی ہے۔

☆......☆......☆

۴۲۔سٹینڈرڈ procedures بنانا بھی سنت ہے

عوام کی سوچ پر چیزیں چھوڑیں گے تو ہر کوئی اپنی سوچ کے مطابق عمل کرے گا تو پھر یکسانیت نہیں آ سکتی۔اس لیے سٹینڈرڈ طریقہ کار بنانا بہت ضروری ہوتا ہے۔

مدینہ کے یہودیوں نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا تھا کہ آپ کے رسول کریم ﷺ پیشاب کرنا، غسل کرنے کے طریقے بھی بتاتے ہیں تو صحابہ نے اثبات میں جواب دیا۔

رسول کریم ﷺ کو عوام کی انسانی فطرت کا پتہ تھا کہ یہ سوچنے والے لوگ نہیں ہوتے ،صرف گھر اور معاشرے سے سیکھی عادات، رسوم اور کلچر کے مطابق جاتے ہیں۔ ان کی نقصان دہ عادات کو نئی سوچ سے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی وجہ سے آپ نے ایک ایک بات میں رہنمائی فرمائی ہے۔زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں پر ہدایت موجود نہ ہو۔لیڈر ہی قومیں بناتے اور برباد کرتے ہیں۔ پاکستانی لیڈروں کو دیکھ کر اس سچائی پر یقین آ جائے گا۔ ہر بندہ اپنی جگہ لیڈر ہوتا ہے اس کے ذمے کسی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اس واقعہ سے ایک بہت ہی اہم اصول یہ نکلتا ہے کہ لیڈر لوگوں کی سوچوں پر اعمال اور افعال کو نہیں چھوڑ سکتے۔اس لیے ان کو چھوٹی سے چھوٹی بات بتانا اور تفصیلی ہدایات دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔تا کہ ہر ایک مرد عورت کا ایک ہی جیسا سٹینڈرڈ رویہ ہو جائے تا کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔مثلاً نبی کریم ﷺ نے سلام کرنے کے اصول اور آداب کی تفصیل دیکھیں تو ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کی سوشل لیول پر بھی معاشرتی لیڈرشپ کس اعلی پائے کی تھی۔

اسلامی طریقے سے سلام کرنے کے اصول یاSOP:

اصول نمبر1۔ جب رسول اکرم ﷺ کا نام سُنا جائے، لیا جائے یا پڑھا جائے تو ان پر سلام بھیجا جائے۔

اصول نمبر2۔ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملے تو اس کو سلام کرے۔سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

اصول نمبر3۔ جب ایک مسلمان دوسرے کوسلام کرے تو اس سے بہتر جواب دینا چاہیے یا ویسے ہی الفاظ سے جواب دیا جائے۔

اصول نمبر4۔ سلام کرنے میں پہل کرنے میں فضیلت ہے۔

اصول نمبر5۔ جس طرح ملاقات کے وقت سلام کہنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کہنا مسنون ہے۔

اصول نمبر6۔ اگر ایک آدمی سے بار بار ملاقات ہو۔تو ہر بار سلام کہنا چاہیے۔

اصول نمبر7۔ جاننے والے اور اجنبی دونوں کوسلام کرنا چاہیے۔

اصول نمبر8۔ سلام ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' پرختم ہو جاتا ہے اس سے زیادہ مسنون نہیں۔

اصول نمبر9۔ سلام کرنے میں غیر مسلموں کا طرز سلام نہیں اپنانا چاہئیے ۔

اصول نمبر10۔ گھر میں آنے پر گھر والوں کوسلام کرنا چاہیے۔

اصول نمبر11۔ مسجد میں داخل ہونے پر لوگوں کوسلام کہنا چاہیے۔اگر مسجد میں کوئی نہ ہوتو'' **السلام علینا و علی عباد الله الصالحین** ''کہیں۔ یعنی ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔

اصول نمبر12۔ سلام کرنے کی ترتیب۔

(1) چھوٹا بڑے کو(2) سوار پیدل کو(3) پیدل بیٹھے کو(4) کم تعداد زیادہ والوں کو(5) دو پیدل چلنے والوں میں پہل کرنے والا افضل ہے۔

اصول نمبر 13۔ خط و کتابت میں بھی سلام سے ابتدا کریں۔

اصول نمبر 14۔ مجلس میں آتے اور جاتے وقت سلام کریں۔

اصول نمبر 15۔ سلام کو اونچی آواز سے سُنا کر کرنا چاہیے۔

اصول نمبر 16۔ اشارے سے سلام کیا جا سکتا ہے۔

اصول نمبر 17۔ کسی کو مخصوص کر کے سلام کرنا مکروہ ہے۔

اصول نمبر 18۔ کسی کو سلام بھیجنا اور اس کا جواب دینا چاہیے۔

اصول نمبر 19۔ عورتوں کا مردوں کو سلام کرنا۔

اصول نمبر 20۔ مردوں کا عورتوں کو سلام کرنا۔

اصول نمبر 21۔ بڑوں کا چھوٹوں کو سلام کرنا بھی مسنون ہے۔

اصول نمبر 22۔ مندرجہ ذیل حالتوں میں سلام مکروہ ہے۔

پاخانہ پیشاب کرنے والے پر، نہانے والے پر، سوئے ہوئے پر، اونگھنے والے پر، نماز پڑھنے والے پر، اذان دینے والے پر، تلاوت کرنے والے پر، خطبہ کی حالت میں لوگوں پر، بدعتی پر سلام کی پہل، فاسق و ظالم پر سلام کی پہل، جواں مرد و عورت کا ایک دوسرے کو۔

اصول نمبر 23۔ نشہ آور اشیاء استعمال کرنے والے پر سلام نہ کریں۔

اصول نمبر 24۔ اگر کوئی لغو بات کرے۔ یا جاہل بحث میں اُلجھ پڑیں تو سلام متارکت یا علیحدگی کے لیے سلام کر کے چلا جائے۔

ملٹری میں بھی سیلوٹ کا جواب دینا لازم ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک ائیر مین نے افسر کو سیلوٹ کیا مگر افسر نے جواب نہ دیا۔ جس کو اس سے بڑے افسر نے دیکھ لیا۔ اس نے فوری طور پر اس فسر کو بلا کر یہ سزا دی کہ تم اس ائیر مین کو پچاس دفعہ سیلوٹ کرو گے۔

مگر ہم نے اسوۂ حسنہ سے SOP بنانے کا صول سیکھا ہی نہیں صرف چند عبادات یا ذاتی سنتوں کو ہی سب اسوہ سمجھ لیا ہے جبکہ اصل اسوہ تو معاشرتی زندگی کے ہر

شعبے پر محیط ہے۔ یہیں پر ہم مار کھا گئے ہیں کہ اپلائڈ اسلام سکھا ہی نہیں سکتے کہ موجودہ صنعتی دور میں زندگی کیسے منظّم کرنی ہے۔

مذہبی یا سیاسی لیڈر کو زندگی کے ہر فیلڈ میں پرکھا جاتا ہے اس لیے اسے ہر بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ قائداعظم کی لیڈرشپ کی سٹڈی کریں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بات۔ فعل، عادت میں کتنی احتیاط برتتے تھے۔

انگریزوں اور مغربی ممالک نے بھی نبی کریم ﷺ سے ہی یہ اصول سیکھ کر اپنا لیا ہے کہ عوام کی سوچوں پر مت چھوڑو۔ سٹینڈرڈ کے لیے ہر بات یا عمل پر تفصیل سے قانون سازی کرو۔ جسے S.O.P یا standard operating procedures کہتے ہیں۔ آداب بھی تفصیل سے لکھ دو تاکہ ہر ایک کا predictabe behaviour ہو جائے۔ ٹیلیفون کیسے کرنا ہے۔ اس کے اصول بتائے جاتے ہیں، بچوں کو پہلی جماعت میں سکھایا جاتا ہے کہ سڑک کیسے کراس کرنی ہے، اگر کپڑوں کو آگ لگ جائے تو کیسے بجھانا ہے۔ دروازے پر لکھا ہوتا ہے کہ باہر کی طرف زور لگا کر یا اپنی طرف کھینچ کر کھولنا ہے کیونکہ لوگ بغیر دیکھے کہ کس طرف کھلے گا زور لگائیں گے تو دروازہ خراب ہو جائے گا اس لیے ہدایات لکھ دی گئی ہیں۔

ہمارا مائینڈ سیٹ یہ ہے کہ ہم نے کوئی بھی ملکی سسٹم اور قانون اس لیے تفصیل سے نہیں بنانے اور کوئی گھنڈی ضرور رکھنی ہے تاکہ بعد میں پھر مرضی کر سکیں اور اس سے مالی فائدہ اٹھا سکیں۔ کسی بھی سسٹم پر عمل نہیں کرنا اور نہ سسٹم چلنے دینا ہے۔

سبق

اگر ہم نے ترقی کرنی ہے تو ہمیں ہر انسانی عمل کے لیے ہدایات، قانون، آداب تفصیل سے لکھنی اور سکھانی اور تربیت دینے کی ضرورت ہے تاکہ سب کی سوچ، اخلاق، آداب، رویے ایک جیسے ہو جائیں۔ یکسانیت یا homogenity پیدا ہو کر سب میں محبت عزت وقار مساوات پیدا ہو۔ وقت کے ساتھ ان کو اپڈیٹ بھی کیا جاتا

رہے تا کہ valid رہیں اور پرانے لٹریچر کو اپڈیٹ کرنا ہوگا تا کہ پرانے زمانے کے حالات پر مبنی فیصلے بدل کر لوگوں کو غیر یقینی کی صورت حال سے نکل آئیں۔

ترقی یافتہ ہونے کے لیے ہمیں مغربی دنیا کے سسٹم اپنا لینے چاہئیں جیسے کہ چین، ساؤتھ کوریا، تائیوان، یو۔اے۔ای نے اپنا لیے ہیں۔ہم میں اتنی بھی سمجھ نہیں کہ دوسروں کو دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کر لیتے اور آج ترقی یافتہ ملک ہوتے۔ہم اپنے سسٹم بنانے کے چکر میں ہی لگے رہے ہیں۔

سبق

اس سنت پر عمل کرنے کے لیے ایک بنیادی اجتماعی سوچ کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ ہمارے سسٹم ایسے ہوں کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ان کے لیے آسانیاں پیدا ہوں۔دوسری سوچ یہ ہو کہ لوگ ڈر کے بغیر اپنی مرضی کرنے لگتے ہیں۔اس لیے ہر عمل یا فعل پر قانون سازی کر کے نہ کرنے کی سزا بھی مقرر ہونی چاہیے کیونکہ قانون کے بغیر کسی کو پکڑا نہیں جا سکتا اور نہ سزا دے کر ڈر پیدا کیا جا سکتا ہے۔مثلاً ٹریفک رولز پر عمل نہ کرنے پر جرمانے کی سزا کے بغیر لوگ عمل نہیں کریں گے۔

اس سنت پر عمل کرنا بھی آسان ہے۔اگر ہم گھر کی زندگی سے شروع کریں اور ہر چیز کے آداب یا sop مقرر اور تحریری ہوں۔مثلاً یہ کہ ہر بندہ جاگ کر سلام کرے گا۔ اپنا کمرہ ہر وقت ٹھیک رکھے گا، باتھ روم استعمال کے بعد صاف کر کے جائے گا وغیرہ، اس پر سوچ شروع کریں۔گھر میں بحث ہو اور شعوری فیصلوں پر منظّم کرنا سیکھ لیں تو بچوں کی عادات بھی اچھی ہو جائیں گی۔انہیں بھی فیصلے کرنے اور sop بنانے آ جائیں گے۔اور معاشرہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

سکول، کالج دفتر سب میں تحریری sop ہوں تو زندگی آسان ہو جائے گی۔

☆......☆......☆

۴۳۔ سسٹم بدلنا ہو تو پرانے سسٹم کو مت ختم کریں جب تک دوسرا سسٹم فنکشنل نہ ہو جائے۔ یہ بھی سنت طریقہ ہے

حجۃ الوداع: ''اور جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا ہے اور ہمارے سود میں سے پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ اب یہ سارے کا سارا سود ختم ہے۔ دور جاہلیت کا ہر سود معاف ہے اور اپنے چچا عباس کا سود معاف کرتا ہوں، ان کا سود سب کا سب معاف اور کالعدم ہے۔''

دیکھ لیں کہ جب تک زکوۃ اور صدقات کا سسٹم اپنی جگہ پر قائم نہیں ہو گیا تھا تب تک سود ختم نہیں کیا گیا تھا۔ لوگ چونکہ اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ہی لوگوں سے سود لیتے تھے تو جب سود ختم کیا گیا تو اس وقت تک اپنی حاجت کے لیے غریب لوگ، زکوۃ اور صدقات کے سسٹم سے مدد کے حقدار کے طور مدد لینے کے عادی ہو چکے تھے۔

سسٹم ہمیشہ لوگوں کے کریکٹر کی مضبوطی پر چلتے ہیں۔ امریکہ میں چند سال پہلے نیو آرلینز میں طوفان سے بڑی تباہی پھیلی۔ لوگوں نے کلیم بھرے اور فوراً پیسے مل گئے ایک ٹی وی پروگرام میں ایک پاکستانی صحافی نے سوال پوچھا تھا کہ اس کلیم کی چیکنگ نہیں ہوئی تو ایک عورت نے کہا کہ یہاں جھوٹے کلیم کا تصور نہیں ہے۔ جبکہ جھوٹ کی وجہ سے ہمارے یہاں ایک جگہ سے چیک کروا کر دستخط کروائیں پھر اس کی تصدیق دوسری جگہ سے کروائیں، برتھ سرٹیفکیٹ بھی کسی سے تصدیق کروائیں اس کے باوجود فراڈ کاغذات بن رہے ہیں۔ شناختی کارڈ کے فراد سامنے آتے رہتے ہیں۔

جھوٹے منافق، کرپٹ لوگ کوئی سسٹم نہیں چلنے دیتے۔ پاکستان بننے سے

پہلے انگریزوں کے ہی سسٹم چل رہے تب امن امان تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی پندرہ بیس سال تک انگریزوں کے تربیت یافتہ افسروں سے ویسے ہی سسٹم پر عمل کرتے گڈ گورننس رہی۔ جونہی پاکستانی تربیت یافتہ افسروں نے ذمہ داریاں سنبھالنی شروع کیں تو اصل فطرت جو کہ تکبر، غرور، چوہدراہٹ، قانون پر عمل نہ کرنا، اپنی مرضی کرنا، دوسروں کو حقیر اور غلام سمجھنے کا کلاس سسٹم سامنے آ گیا اور گورنس کا نام نشان نہیں رہا۔اور دور جاہلیت کی طرف واپسی شروع ہوگئی۔ مذہبی رہنماء پہلے غریب تھے۔ پاکستان کی خوش حالی اور پھر افغانستان پر روسی حملے کے بعد یہ بھی امیر ہو گئے اور ان میں بھی چوہدراہٹ اور حکومت کا شوق شروع ہو گیا اور اسوۂ حسنہ پر عمل کا یک بھی نمونہ پیش نہ کر سکے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ آئیندہ جب بھی امت کی اصلاح کا کام شروع کرنا ہو تو مکی دور سے ہی شروع کرنا ہو گا یعنی پہلے انسان سازی پر محنت کرنی ہو گی اور احکامات پر زور نہیں دیا جائے گا۔

سسٹم چلانے اور نئے سسٹم بنانے کے لیے بہترین انسان چاہیے ہوتے ہیں جیسے کہ دور جاہلیت سے ابھرنے والے بہترین انسان جو صحابہ کرام کی شکل میں سامنے آئے اور دنیا کو بہترین سسٹم دے گئے۔جس کی آج بھی دنیا نقل کرتی ہے۔ ہیومن ڈیویلپمنٹ کوئی آسان کام نہیں ہوتا، چاہے ذاتی لیول پر ہو یا اجتماعی اور نیشنل لیول پر ہو کیونکہ عادات ایک دم تبدیل نہیں کی جاسکتیں وقت لگتا ہے۔ جو انسان کو مشین سمجھتے ہیں اور انسانی فطرت کو نہیں سمجھتے تو وہ جبر پر یقین رکھتے ہیں جو فیل ہو جاتا ہے۔۔اس کے لیے پہلے واضح مقصد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر مقصد کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر علم، غور و فکر، ریسرچ اور لگا تار محنت اور لیڈر شپ کو مثال قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے انسانی کردار سازی جب لیڈر کے ذریعے ہوتی ہے تو وہ اپنی مثال اور آئیڈیاز کے ذریعے سے بہت جلد اجتماعی تبدیلی لے آتا ہے۔اور ایسے ماحول میں ذاتی اصلاح اور کردار کی ترقی بہت آسان کام اور جلد ہوتا ہے۔مگر ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈر شپ میں کوئی لیڈر ایسا نظر نہیں آتا جو اجتماعی رہنمائی کر سکے۔صوفیاء اپنی مثال سے متاثر کر

کے تبدیلی لانے میں جلد کامیاب ہو جاتے تھے۔مگران کی غیر موجودگی میں ہر ایک کو ذاتی اصلاح کے پروگرام پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے لیے وہ ایک لیڈر پیدا نہیں کر دیتا۔

رہی سسٹم ڈیزائین کرنے کی صلاحیت ،تو یہ سیاسی، مذہبی، علمی، تجارتی، سائینسی، صنعتی فیلڈ میں ہم میں صرف کریکٹر کی خامی کی وجہ سے دور دور تک نظر نہیں آتی۔ وجہ ذاتی صلاحیت کا فقدان نہیں ہے بلکہ اندھی تقلید کا کلچر ہے۔ نئے فیصلے کرنے میں جھجک کی عادت اور کلچر ہے۔انفرادیت کا کلچر ہے۔ ذاتی مفادات کی حفاظت کو ہی بقاء سمجھ لیا گیا ہے جبکہ بقاء اجتماعیت میں ہوتی ہے۔مثلاً زکوٰۃ کا سسٹم مکملoverhaul مانگتا ہے مگر ہم میں اس کا نہ جذبہ ہے، نہ شعور ہے۔

سبق:

۱۔ ہمیں اپنے عوام کو کو باعزت زندگی گزارنے اور دنیا کی قوموں میں مقام دلانے کے لیے زرعی سوسائٹی سے صنعتی سوسائٹی میں بدلنے کے لیے نئے سسٹم دینے کی ضرورت ہے جو بالغ سوچ بچار پر مبنی ہو جیسے جاپان، چین کوریا کے لیڈروں نے دکھایا ہے۔مغربی مما لک نے زکوۃ کو ہی اپنے ویلفیئر سسٹم کی بنیاد بنایا ہوا ہے۔ ہم ان کے سسٹم سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔مگر مذہبی تعصب ہمیں سیکھنے میں مانع ہے۔

۲۔ بعض مسلمان ملکوں جیسے ملائشیا، انڈونیشیا، برنائی وغیرہ نے فطرانے کو حکومتی لیول پر وصولی اور تقسیم کا سسٹم منظّم کرنے میں کامیابی حاسل کر لی ہے جس پر لوگوں کو اعتماد ہے اور جس سے مساکین کی مدد افراد کے آگے ہاتھ پھیلانے کی جگہ حکومت سے لینے سے عزت نفس محفوظ ہو گئی ہے۔ہم اب تک سسٹم نہیں بنا سکے کیونکہ ہم اجتماعیت میں یقین نہیں رکھتے اور ہم مالی معاملات میں انتہائی نا قابل اعتبار اور بری شہرت کے حامل ہیں۔ بات پھر کریکٹر کی آ جاتی ہے۔

۳۔ یہ ترقی تب ہوسکتی ہے جب فیصلے کرنے والا ایک ہو۔ ہماری زندگی کے فیصلے کرنے والے دو ہیں۔ ایک سیاسی حکمران اور دوسرے مذہبی حکمران، علماء اور مشائخ۔ اور دونوں کے نظریات مختلف ہیں۔ مفادات مختلف ہیں۔ ہمیں نظریہ توحید کے تحت ایک فیصلے کرنے والے کا تعین کرنا ہوگا۔ اور نظریہ ختم نبوت کے تحت ادارے بنا کر مشورے سے فیصلے کرنے ہونگے۔ مگر مشورے کے بعد ادارے کا ایک فیصلہ کرنے والا ہونا بھی ضروری ہے۔ ہم اب تک شخصیات کے گرد گھومنے والے لوگ ہیں۔ شخصیت ہی ادارہ ہوتی ہے اور اس کے فوت ہونے کے بعد بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مذہبی معاملات میں تو یہ صدیوں سے ہو رہا ہے مگر ہمارے جمہوری سیاسی نظام میں بھی پارٹیاں ایک شخصیت پر مبنی ہیں جبکہ مغرب میں ہر پانچ سال بعد نیا پارٹی لیڈر آ جاتا ہے اور حکمران بھی۔ پارٹیاں چلتی رہتی ہیں۔ ہمیں شخصیت پرستی سے نکلنا پڑے گا جو کہ دراصل بت پرستی ہی کی شکل ہے۔

☆......☆......☆

۴۴۔ یادداشت پر بھروسہ نہ کرنا، لکھ لینا سنت ہے۔

"اس سے یادرکھنے اور گواہی قائم کرنے میں آسانی رہتی ہے۔"

"ہجرت کے دوران آپ کو پکڑنے والے کے لیے سو اونٹ کا انعام رکھا گیا تھا۔ سراقہ بن مالک بن جعشم سو اونٹ کے انعام کے لیے آپ کو ڈھونڈتا آپ کے قریب پہنچ گیا تو اس کے گھوڑے نے جس طرح ٹھوکر کھائی، جب دوبارہ آپ کے قریب پہنچا اور ویسی ہی ٹھوکر کھائی تو اس کو اندازہ ہو گیا کہ آپ کی حفاظت اللہ سبحانہ تعالیٰ فرما رہا ہے تو اس نے آپ سے درخواست کی کہ اسے امان لکھ کر دی جائے تو آپ نے حضرت ابوبکر کو لکھ کر دینے کے لیے کہا اور انہوں نے لکھ دیا۔" (مطالعہ سیرت)

اس سے ثابت ہوا کہ سفر میں اور ہر وقت اپنے پاس ڈائری اور پین ساتھ رکھنا بھی سنت ہے روزانہ کی بات یا ضروی باتیں لکھتا رہنا بھی ایک مفید عادت بھی ہے اور سنت طریقہ بھی۔

2-282. O you who believe! When you contract a debt for a fixed period, write it down. Let a scribe write it down in justice between you.۔ You should not become weary to write it (your contract), whether it be small or big, for its fixed term, that is more just with Allah; more solid as evidence, and more convenient to prevent doubts among yourselves,

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "کہ حافظے پر مت بھروسہ کرو۔" لکھو تو کیا اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ لکھنا پڑھنا سیکھو تا کہ معاہدہ خود بھی لکھ اور پڑھ سکو۔

دوسرے کی امانت، دیانت پر مت بھروسہ کرو، لکھ لو کیونکہ اس سے گواہی قائم کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ زبانی وعدے سے انسان مکر سکتا ہے یا بھول کر غلط بات کہہ سکتا ہے جس سے دوسرے کا مالی نقصان ہو سکتا ہے۔ اس لیے لکھ لو۔ وعدہ پورا کرنا ہو تو حافظے پر مت بھروسہ کرو، لکھو۔ کوئی کام بعد میں کرنا ہو تو حافظے پر مت بھروسہ کرو، لکھ لو۔ آج کل مغربی ممالک نے کیش میمو کی شکل میں خرید و فروخت کا تحریری ثبوت رسید کی شکل میں ترتیب دیا ہے جس کو ثبوت کے طور دکھا کر مال واپس کیا جا سکتا ہے یا اس کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے۔

انگریز یہی دفتری طریقہ بنا کر گئے تھے۔ ہر آفیسر کا پروگرام ٹیبل پر لکھا ہوتا ہے۔ دفتر آ کر وہ پہلے ڈائری پر دیکھتا ہے۔ جب بھی سیکریٹری افسر کے پاس آتا ہے تو ڈائری ساتھ لاتا ہے۔ لکھتا جاتا ہے، حافظے پر نہیں رہتا۔ انگریزوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے ہمیں ماڈرن سسٹم دیئے، رولز دیئے، رسوم دیئے مگر ہم ان کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ ہم مرضی کرنے والے متکبر لوگ ہیں۔ قانون پر یا رسم، طریقوں پر عمل کرنے سے ہماری بے عزتی ہوتی ہے، چھوٹا پن ظاہر ہوتا ہے۔ حکم تو چھوٹے لوگ مانتے ہیں۔ ڈسپلن رکھنا ان کا کام ہے۔ بڑے مرضی کرتے ہیں۔

قرآن کو سوشیالوجی میں تبدیل کرنا یعنی سوشل سسٹم بنانا، اس کی تربیت دینا اور معاشرے میں ڈسپلن قائم کرنا ہی حضور ﷺ کا کمال تھا۔ مگر ہم نے اپلائیڈ قرآن و سنت پر عمل کرنا نہیں سیکھا۔ میرے خیال میں اب ہمیں دین اور دنیا کی تفریق کے غلط نظریے کو مٹا دینا چاہیے کیونکہ زندگی ایک اکائی ہے۔ حصوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ یہ تفصیلاً سمجھانا ضروری ہے کہ ہر مرد اور عورت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے دین اور دنیا دونوں کی جواب دہی، خود ہی، اکیلے جا کر کرنی ہے۔ کسی مولوی نے جا کر مدد نہیں کرنی۔ قیامت کے دن خدا کو جا کر یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ فلاں مولوی صاحب کے کہنے پر عمل کیا ہے۔ نہ ہی یہ بہانہ یا دلیل اللہ تعالیٰ کو قابل قبول ہوگی، کیونکہ مولوی اور مفتی تو خود ہمیں اس دنیا میں بتاتے ہیں کہ دینی معاملات میں فتویٰ تو صرف ان کی considered opinion، یا رائے

ہوتی ہے، ملکی قانون نہیں ہوتا۔ ان پر عمل لوگ اخلاقی طور پر کرتے ہیں کہ مولوی صاحب صحیح ہی کہتے ہوں گے اور ہمیں معلوم ہے کہ رائے دینے والا کبھی بھی نتائج کا ذمہ دار نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے دین کے ہر مسئلے میں خود تحقیق کر کے آخری فیصلہ کرنا ہر مرد اور عورت کا اپنا ذمہ اور ذاتی حق ہے اور ہر مرد اور عورت کو دین اور دنیا دونوں کا علم خود حاصل کرنا ہوتا ہے اور فیصلے بھی خود کرنے ہوتے ہیں۔

اس لیے زندگی کے سسٹم بنانے اور لکھنے کے اسوۂ حسنہ اور سنت پر عمل کی ذمہ داری ہم عام مسلمانوں کی اپنی ہے اور اتنی ہی ہے جتنی علماء کرام کی۔ جس سے ہم اعراض کرتے آ رہے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے میں لکھی گئی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ عام مسلمان، خصوصاً نئی نسل، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ذمہ داری اٹھائیں اور اسلام کی اصلی اور پریکٹیکل شکل سسٹمز کی صورت میں سامنے لائیں۔ یہ ہمارا حق اور فرض بنتا ہے کہ ہم علمائے کرام کی معاونت کریں۔ خصوصاً عورتوں کو اسلامی تہذیب اور آداب کا رکھوالا بننے میں اپنی ذمہ داری سنبھالنی چاہیے کیونکہ اسلام مذہب سے زیادہ کلچر ہوتا ہے۔

جب 1960ء میں عائلی قوانین میں نکاح کو تحریری نکاح نامہ کی شکل دی گئی تھی کیونکہ یہ وقت کی اور صنعتی سوسائٹی کی ضرورت تھی،۔ لکھا ہونا ہر لحاظ سے معاشرتی، قانونی، اور انٹرنیشنل ضرورت بن گئی تھی، مگر اس چیز کے باوجود کہ معاہدے کے لکھنے کا اللہ کا حکم ہے، بعض علماء نے تب بھی یہی رائے دی تھی کہ زبانی ہی رکھا جائے یعنی وہ ماضی کی پریکٹس کو اللہ کے حکم پر ترجیح دے رہے تھے۔ مگر معاشرے اور حکومت نے ان کی رائے کو صحیح نہ سمجھ کر اپنی رائے اور اللہ کے حکم پر پر عمل کیا جو کہ ہر لحاظ سے فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔

شادی کے ہی سلسلے میں مہر کی رقم کے علاوہ زیور، جہیز مالی معاملات ہیں، ان کا لکھا جانا بھی، اللہ کے حکم کے مطابق ضروری ہے، مگر نکاح نامہ میں یہ خامی رہ گئی ہے جس کا اضافہ کرنا ہمارا فرض بنتا ہے ہے۔ یہ باتین نہ لکھنے کی وجہ سے بعد میں بہت جھگڑے ہوتے ہیں۔

عربوں میں حضرت عمر فاروقؓ نے سب سے پہلے آبادی کا ریکارڈ رکھنا شروع کروایا تھا اور اس تحریری ثبوت کے مطابق ہی وظیفے دیئے جاتے تھے۔ بدوؤں کی طرح ہمارے دیہات میں بھی کبھی تحریری ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ انگریزوں نے آ کر پیدائش اور موت کا ریکارڈ رکھنے کا سسٹم شروع کیا تھا جو آج بھی چل رہا ہے۔ مغربی مما لک میں تین سو سال پہلے بھی دیہات میں بھی اجتماعی فیصلے، مردوں اور عورتوں کی میٹنگ میں کئے جاتے تھے اور لکھے جاتے تھے، یعنی جمہوری، اجتماعی دانش پر مبنی فیصلے ہوتے تھے، مگر ہمارے دیہات میں اجتماعی فیصلے کرنے اور ریکارڈ رکھنے کا کبھی رواج نہیں رہا اور نہ ہی آج بھی کہیں نظر آتا ہے۔ ہم اگر دیہات کو ترقی دینے کے لیے مغربی طریقے سیکھ کر منظّم کرلیں تو حقیقی جمہوریت آ سکتی ہے۔

مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے سے اعراض کے پیچھے یہ عوامی سوچ تھی کہ جس نے نوکری نہیں کرنی تو اسے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بدقسمتی دیکھئے کہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی سب لیڈروں کی یہی منفی سوچ رہی ہے۔ اسی غلط نظریے سے دیہات کی سو فیصد عورتیں اور مرد، ان پڑھ ہوتے تھے۔ جبکہ صرف ہندو پڑھے لکھے ہوتے تھے اور ادھار لکھتے تھے جسے مسلمان پڑھ نہیں سکتے تھے جس سے وہ مسلمانوں کا استحصال کرتے تھے مگر کسی کو خیال نہ آیا کہ لکھنا پڑھنا صرف اس لیے سیکھ لیتے کہ دیکھ سکیں کہ ہندو دکاندار کیا لکھ رہا ہے یہ تو تھی دنیا کی بات۔ مگر ہمارے علماء اور عوام دونوں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ علم حاصل کرنا ہماری مذہبی ضرورت بھی ہے کہ ہر ایک عورت اور مرد نے خود اکیلے اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہے۔ دوسرے یہ کہ بچوں کے والدین پر حقوق میں یہ شامل ہے کہ وہ ان کو دین اور دنیا دونوں کی تعلیم اور تربیت دے۔ اور یوں ہماری انتہائی غلط سوچ نے ہمارے معاشرے کو، صرف دین کے علم میں بھی، عورتوں مردوں کو پڑھ لکھ کر خودمختار بنانے، ان کو علم میں اضافہ کرنے سے روک دیا اور ان کو ہر بات پوچھنے پر مائل کر کے علمی اپاہج بنا دیا اور یوں ہدایت نبوی کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور موت تک علم حاصل کرتے رہنا بھی لازمی ہے، کی بھی خلاف ورزی کی، جو کہ

مسلمان مردوں اور عورتوں کی دنیا اور آخرت دونوں خراب کرنے کے مترادف تھا۔ میں یہ بات مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی کتاب بہشتی زیور کے پہلے حصے میں تعلیم نسواں کے عنوان سے مضمون، صفحہ 74-08 سے لے کر بیان کر رہا ہوں۔ جو میری کتاب۔ "یونیورل یا عمومی تعلیم اور تعلیم نسواں کے فیصلے کون کرے گا، علماء، والدین یا حکومت، یا کہ یہ بچوں کا حق ہے کہ انہیں والدین اور حکومت تعلیم دے۔" میری ویب سائٹ پر پڑھ سکتے ہیں۔

اس لیے وقت آ گیا ہے کہ عام مسلمان بھی دنیا کے ساتھ ہی دینی تعلیم کی طرف بھی توجہ دیں تا کہ فرسٹ ہینڈ نالج ہو۔ سیکنڈ ہینڈ علم میں دوسروں کے غلط خیالات بھی شامل ہو جاتے ہیں جو ہماری دنیا اور دین دونوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

سبق

۱۔ اگر ہر آدمی اور ورکر، ٹیلر، پلمبر آرڈر لکھنا شروع کر دے تو پھر ان کے پیچھے بار بار بھاگنے اور ٹیلیفون کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اسے یاد رہے گا۔ ورنہ وہ وعدہ خلافی کا گناہ بھی سر مول لیتا ہے اور گاہک کو بھی تکلیف دیتا ہے۔

۲۔ ہر گھر میں بھی بچوں بڑوں کو یہ عادت اپنا لینی چاہیے تا کہ بھولنے اور کام نہ ہو سکنے کی تکلیف سے جان چھوٹ جائے اور ایک اچھی عادت اپنا لی جائے۔

۳۔ آج کل تو کاغذ پنسل کی بھی ضرورت نہیں ہے موبائل میں Task کی سہولت موجود ہے اس میں لکھ لیں۔ مغربی ممالک میں تو کسی کو دعوت دیں تو ہاں کہنے سے پہلے موبائل پر پروگرام دیکھتا ہے۔

۴۔ بڑے فیصلے کرنے کے لیے لکھنے کی عادت ڈالیں اس سے سب پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔

۵۔ سب سے اہم بات ذہن میں آئے آئیڈیاز کے لکھنے کی ہے کہ اسے فوراً لکھ لیا جائے کیونکہ آئیڈیا ایک دفعہ چلا گیا تو دوبارہ نہیں آئے گا۔ آئیڈیا ایک خدائی

تحفہ ہوتا ہے اور آئیڈیا سے ہی عمل شروع ہوتا ہے۔ آئیڈیاز ہی کسی فرد یا قوم کی اصل دولت ہوتی ہے اس پر عمل سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے جو قوم نئے آئیڈیاز کو پیدا نہیں کر سکتی، پیچھے رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آئیڈیا سے ہی رزق علم، مقام دیتا ہے۔

اس سنت پر عمل کرنا بھی بہت آسان ہے کیونکہ یہ ذاتی فعل یا عادت ہے۔ بات اس عادت کو اپنانے کا فیصلہ کرنے کی ہے۔

☆......☆......☆

۴۵۔ خط کا جواب دینا سنت ہے

حدیث : خط کا جواب سلام کے جواب کی طرح واجب ہے۔

(کنز العمال نمبر 29293)

حضور اکرم ﷺ نے سلام اور خط کے جواب کو واجب قرار دے کر یہ اصول بتایا ہے کہ تعلقات میں reciprocation کا اصول ضروری ہے۔ اس لیے ہر قسم کی communication میں بھی جواب دینا واجب بن جاتا ہے۔

اس لیے سلام ہو یا خط، یا ٹیلیفون، یا موبائل یا ایس ایم ایس یا زبانی پیغام، اس کا جواب دینا لازم بن جاتا ہے۔

دوسرا اصول: ہر انسان کی عزت کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ جب کوئی لکھتا ہے تو آپ کو اہمیت دے کر یا امید لگا کر لکھتا ہے۔ جواب دینا اس کی عزت ہوتی ہے جبکہ نہ دینا یہ پیغام دیتا ہے کہ ہمیں تمہاری پرواہ نہیں۔ تم چھوٹے بندے ہو۔

مغربی ممالک ان ہدایات پر عمل کرتے ہیں مگر ہم نہیں۔ مغربی ممالک اور ہمارے رویوں میں فرق کی بنیادی وجہ صنعتی سوسائیٹی اور زرعی سوسائٹی کی سوچوں کا فرق ہے۔ ہمارے یہاں ای میل ملنے کا کبھی جواب نہیں آتا جبکہ باہر ملنے کی اطلاع خود بخود پروگرام کے مطابق آجاتی ہے۔

انگریزی دور حکومت میں یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی انگریز افسر کو کوئی خط لکھے اور اس پر عمل نہ ہو اور اس کا جواب نہ آئے۔ پنجاب کے دیہات میں یہ بات مشہور تھی کہ چٹے کو کالا کرو۔ یعنی سفید کاغذ پر کالی سیاہی سے لکھ کر انگریز کو بھیج دو تو جواب ضرور آئے گا۔

آپ آج بھی کسی غیر ملکی صدر یا وزیر اعظم کو خط لکھ کر دیکھ لیں کہ جواب آتا ہے یا نہیں۔ضرور جواب آئے گا۔اب میں چند مثالوں سے بات سمجھاؤں گا۔

آرمڈ فورسز میں بھی انگریزوں کے زمانے سے خط کا جواب دینے کی یہ رسم اب بھی چلی آرہی ہے۔ایک سینئر افسر کو میں نے خط لکھا اور اس کا جواب نہ آیا تو میں نے مختصراً یاد دلایا کہ "Sir! you owe me a reply." تو فوراً سٹاف آفیسر کا فون آیا کہ کہ آپ کل دس بجے چائے پینے آجائیں اور بات بھی کرلیں۔

ٹیلیفون کے استعمال کی اخلاقیات بھی خط یا پیغام سے مختلف نہیں۔پاکستان کے پہلے بیس سال میں کال بیک کی پریکٹس تھی۔سیکریٹری ہمیشہ افسر کے آتے ہی سب سے پہلے کالز کا بتاتا تھا۔آج کل وہ بتائے بھی تو صرف اپنی پسند یا واقفیت کے افسر کو کال بیک کی جاتی ہے ورنہ عمومی رویہ یہ ہے کہ اس کو زیادہ کام یا تکلیف ہوئی تو دوبارہ خود ہی کال کرلے گا۔اسی طرح لوگ سی ایل آئی کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ فون اٹھانا ہے یا نہیں۔ہمیں اپنے ہر غلط مائینڈ سیٹ سے نجات پانے کی ضرورت ہے۔کیونکہ ان سب کی بھی قیامت کے دن جواب دہی ہوگی۔

سبق

زندگی کے ہر شعبے میں دوطرفہ تعلقات کوفروغ دینے کی ضرورت ہے۔یک طرفہ تعلق استحصال پرمبنی ہوتا ہے۔دوطرفہ تعلق سے باہمی عزت،احترام،ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھا جاسکتا ہے۔

دوسروں کے رابطہ کرنے کی کوشش سے یہ اندازہ لگالیں کہ شاید اس کو مدد کی ضرورت ہو اور وہ آپ کو اس قابل سمجھ کر ہی رابطہ کر رہا ہے۔یہ دراصل اللہ کی رحمت ہوتی ہے کہ اس نے آپ کے پاس کسی کو مدد کے لیے بھیجا تا کہ نیکی کما سکیں۔۔تو سائل کا کام کرنا آپ کی سرکاری یا انسانی اور اخلاقی فرض بھی بنتا ہے اور آخرت کا توشہ بھی۔اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؛۔اور سائل کو نہ جھڑکو(وَامّا السّائِلَ فَلَا تَنھر(سورۃ الضحیٰ 93 آیت 10)

واصف علی واصف لکھتے ہیں کہ میں نے ایک فقیر کو کہا کہ مانگتے شرم نہیں آتی تو اس نے کہا کہ مجھے تو تمہیں سخی بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ واقعی بات سمجھنے والی ہے کہ سائل یا مدد مانگنے والا تو تقدیر کے تحت ٹسٹ کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

سائل پیسے مانگنے والا ہی نہیں ہوتا۔ وسیع تناظر میں دیکھیں تو علم کا سوال پوچھنے والا بھی سائل ہے۔ کسی کے ظلم کے خلاف مدد مانگنے والا بھی سائل ہے۔ راستہ پوچھنے والا بھی سائل ہے۔

☆......☆......☆

۴۶۔ وقت کا پروگرام بنانا بھی سنت نبوی ہے

وقت بارے اللہ سبحانہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے ارشادات:

زمانے کی قسم! بے شک انسان خسارے میں ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور حق پر اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔ (سورہ عصر)

حدیث: ''حضور ﷺ نے فرمایا جب تک تم سے چار سوال نہیں پوچھ لیے جائیں گے تمہارے قدم نہیں ہلیں گے۔ **پہلا سوال**:۔ تم نے عمر کیسے گزاری۔ **دوسرا سوال**:۔ تم نے علم کیسے استعمال کیا۔ **تیسرا سوال**:۔ تم نے پیسہ کیسے کمایا اور کیسے خرچ کیا؟ **چوتھا سوال**:۔ تم نے جسم کو کیسے استعمال کیا؟ (ترمذی)

آخرت میں وقت کے استعمال پر احتساب ہوگا۔ تو پھر وقت پلان نہ کرنا، ضائع کرنا کیا اللہ اور نبی کریم ﷺ کی حکم عدولی نہیں بنتی ہے؟ اور کیا وقت پلان نہ کر کے ہم اپنی دنیا بھی برباد نہیں کر رہے اور آخرت کے سلسلے میں بھی خسارے میں نہیں جا رہے؟ اگر ہمیں یہ احساس ہو کہ ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا تو پھر وقت پلان کرنا سیکھ لیں گے۔

ہر انسان کو دنیا میں آنے کے بعد کتنا عرصہ رہنا ہے اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ بیس، تیس، پچاس، ستر، نوے سال۔ اس لیے ہر ایک کے پاس محدود اور غیر یقینی مدت ہے جس میں اس نے آخرت کے لیے دنیا کمانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مطابق زیادہ تر انسان خسارے میں ہوں گے کیونکہ زیادہ تر لوگ سوچ کر زندگی پلان کر کے نہیں گزاریں گے۔

وقت کی بے یقینی کی وجہ سے ہی حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ **"ہر دن کو ایسے سمجھو جیسے کہ یہ آخری دن ہے۔"**

the Prophet sallallaahu `alayhi wa sallam (may Allaah exalt his mention) said: "Perform the work of a man [in regard to this worldly life] who believes that he will never die, and be careful and fear the Hereafter like a man who fears to die tomorrow.Al-Bayhaqi and Ad-Daylami

اور یہ بھی فرمایا کہ "جس کے دو دن ایک جیسے گزرے وہ خسارے میں رہا"

Rasul Allah (sal Allahu alaihi wa sallam) said: "He whose two days are equal, is a loser." [Daiylami]

یعنی ہر روز اسے پہلے روز سے بہتر ہونا چاہیے۔ تبھی وہ کامیاب ہوگا دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی لکھتے ہیں کہ میں نے بہت محدود وقت میں جو ڈھیر سارے کام کئے ہیں، کتابیں لکھیں اور، لیکچر دیئے ہیں، وہ سب وقت کو پروگرام کرنے کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ یہ انہوں نے انگریزوں سے سیکھا تھا۔ اس وجہ سے دوسرے علماء ان کو مذاقاً کہتے تھے کہ وہ عیسائیوں کی طرح ہو گئے ہیں کیونکہ ان کی عادت اپنالی ہے کیونکہ مولانا بغیر وقت مقرر کئے، کسی سے نہیں ملتے تھے۔

قائداعظم کی کامیابی کا بھی یہی راز تھا کہ وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا حسرت موہانی بغیر وقت لیے ملنے آ گئے، تو سیکرٹری نے ملانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے مس فاطمہ جناح سے مدد کی درخواست کی تو انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے ہی وہ پاکستان کی جنگ کامیابی سے لڑ سکے۔

بدقسمتی سے ذاتی اور نیشنل لیول پر مسلمان صدیوں سے وقت کو ترتیب دے کر استعمال کرنے سے غافل رہے ہیں۔ سیاسی اور مذہبی دونوں حلقوں میں وقت پر آنا، چلے جانا پریکٹس ہی نہیں ہوتا۔ زرعی دور میں وقت کی کسی کو پرواہ ہی نہیں ہوتی مگر آج کل

کے صنعتی دور میں وقت کم پڑ جاتا ہے اس لیے اسے پلان کرنا مجبوری بن گیا ہے۔

دن شروع ہوتے ہی بچے تعلیم حاصل کرنے چلے جاتے ہیں۔ مرد اور ورکنگ وومن روزی کمانے چلے جاتے ہیں، چاہے دفاتر ہوں سکول، ہسپتال فیکٹریاں۔ دکانیں وغیرہ۔ گھریلو عورتیں چھوٹے بچوں کو سکول چھوڑنے لانے اور گھر کے کام میں لگ جاتی ہیں۔ دن کا زیادہ وقت رزق کمانے کے لیے لگ جاتا ہے۔ یہ وقت لگانا تو ہر ایک کا فرض بھی ہے اور دنیاوی مجبوری بھی۔

روزی کمانے کے وقت کا صحیح استعمال کیا ہے یا نہیں؟ غلط استعمال پر تھوڑی روشنی ڈالوں گا کیونکہ اس کا امانت سے تعلق ہے۔ جس کی باز پرس ہوگی۔ جو لوگ کسی بھی ادارے میں روزانہ ڈیلی ویجز پر ہوں یا پکی نوکری والے، دونوں ہی اپنی زندگی کے آٹھ یا دس گھنٹے ادارے کو بیچ دیتے ہیں۔ اور مالک ان سے اس کے بدلے کام کروانے کا حق دار ہے۔ اگر ملازم اس وقت میں پوری ذمہ داری سے کام نہیں کرتا۔ وقت ضائع کرتا ہے تو وہ امانت میں خیانت کا مجرم اور اللہ کے یہاں گناہ گار بنتا ہے۔ ادارے کی کوئی چیز بغیر استحقاق اپنے استعمال میں لاتا ہے تب بھی خیانت کر رہا ہے۔ مالک ملازم سے مقررہ وقت کے بعد مفت کام نہیں لے سکتا، بلکہ اس کو کام پر راضی کرنے کے لیے فی گھنٹہ ڈبل مزدوری کا بغیر اوور ٹائم اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کام لیتا ہے تو وہ ظلم کا مرتکب ہوتا ہے اگر وہ ملازمین کو ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ سے رجسٹر نہیں کرواتا تاکہ ساٹھ سال بعد ان کو پنشن مل سکے تو حق مارنے اور ظلم کے گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے۔ یہ وقت کے غلط استعمال کی چند مثالیں ہیں تاکہ احساس ہو کہ مالکوں کی ملازمین کا استحصال کرنے پر پکڑ اور باز پرس ہوگی۔ اور سزا ملے گی۔

سبق

دن کے وقت رزق کمانے کے لیے وقت لگانا تو ہر ایک کا فرض بھی ہے اور دنیاوی مجبوری بھی۔ اس میں دن کا بیشتر حصہ لگ جاتا ہے۔ اس لیے بقیہ وقت میں سے

تفریح،صحت،عبادت،دوستوں کے ساتھ میل ملاپ کا وقت بھی پلان کرنا پڑتا ہے۔

وقت کی نعمت کے غلط استعمال کی بھی قیامت کے دن جواب دہی ہوگی اس لیے ہر ایک کو ایک منٹ پلان کرنا چاہیے اور رات کو روزانہ خود احتسابی کا پروگرام بنانا چاہیے کہ کہیں وقت ضائع تو نہیں ہوا۔

ہر انسان کے پاس وقت ہی تو اصل اثاثہ اور دولت ہے مگر ہمیں اس کی قیمت کا احساس ہی نہیں۔

صدیوں سے ہم نے چونکہ اس سورہ اور اس پر مبنی سنت رسول کو معاشرتی اصول نہیں سمجھا، اس لیے مسلمانوں کو عموماً اور ہم پاکستانیوں کو خصوصا اپنے ہر غلط مائنڈ سیٹ سے نجات پانے کی ضرورت ہے

ہم عام مسلمانوں کو چاہیے کہ ہم خود کلام پاک پر ریسرچ کریں یہ ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔اس کے لیے عربی کے ساتھ اردو ترجمہ پڑھنا ہی کافی ہے۔

☆......☆......☆

۴۷۔ فارغ وقت کا صحیح استعمال

ذاتی اور قومی ترقی، کردار سازی کے لیے فارغ وقت کا استعمال۔
یہ سنت بھی ہے اور اللہ کا حکم بھی۔
''پس جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کریں۔ (عبادت) (ریفرنس سورۃ الم نشرح 94۔ آیت ۔7) ''اور اپنے رب ہی کی طرف راغب ہوں۔''
(8۔94)

حدیث:۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: عموماً دو نعمتیں لوگ ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ صحت اور فارغ وقت ہے۔ جس میں اچھے اور نیک کام کئے جا سکتے ہیں۔ (بخاری۔ 8/76/421)۔ یعنی'' فارغ وقت بھی اللہ کی نعمتوں میں شمار ہوتا ہے' اور ہر نعمت کا حساب لیا جائے گا۔''

فارغ وقت ہی self improvement کا وقت ہوتا ہے اسی لیے رسول کریم ﷺ کو ہدایات کے لیے سورہ نازل کی گئی تھی۔ یہ ہدایت اگر چہ اس وقت آپ کے لیے مخصوص تھی مگر آپ کا عمل ہی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ اور سنت بن جاتا ہے جس پر ہمیں نقل کرنے کی ہدایت ہے تو فارغ وقت کا صحیح استعمال بھی سنت بن جاتا ہے۔ چاہے مذہبی، علمی، روحانی، دنیاوی، پیشہ وارانہ، صحت، معاشرتی تعلقات، گھریلو معاملات، سیر و تفریح، ہوں۔ ان میں ترقی صرف اور صرف فارغ وقت کے صحیح استعمال سے ہو سکتی ہے، سب فارغ وقت کی برکتیں ہیں۔ کیونکہ ہمارا زیادہ وقت تو روزی کمانے میں لگ جاتا ہے یا گھر کے کام کاج میں۔ جو بچ جائے اس کو صحیح استعمال کرنا اور پلان کرنا سیکھ لیں تو یہی دنیاوی اور اخروی ترقی کا زینہ ثابت ہو جائے گا۔

۱۔فارغ وقت کئی طریقوں سے ملتا ہے:۔

سونے سے پہلے: جب ہم کو اس بات کا واقعی یقین ہو کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے تو اس کے ساتھ تعلقات بہتر سے بہتر بنانا نہ صرف ضروری ہو جاتا ہے بلکہ اہم بھی ہے۔ تعلقات بڑھانے کے لیے اللہ کے ساتھ بھی وقت گزارنا، اس کی تعریف وتحمید کرنا، اسی سے دعا مانگنا۔اسی سے اس دنیا کی غلطیوں کی معافی چاہنا ہی دراصل اللہ سے ملاقات بنتی ہے۔جس سے اللہ اپنے بندوں سے خوش ہوتا ہے۔ جیسے کہ ہم دور کے رشتہ داروں، دوستوں سے تعلق قائم رکھنے کے لیے ٹیلی فون یا خط یا زبانی پیغام سے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔ضرورت ہے کہ اس کی عادت بنالی جائے کہ چاہے دس منٹ کے لیے ہو۔ سونے سے پہلے ہی یک سو ہو کر اللہ سے ملاقات کر لی جائے۔

۲۔سفر کے دوران وقت کا استعمال

آج کل دفتر یا کام پر جاتے ڈرائیونگ میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔اس کو بھی فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔جیسے بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ یہ وقت قرآن سننے اور تفسیر سننے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔کچھ میوزک سننے، کچھ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے۔یہ سب اپنی پسند پر منحصر ہے۔بس اور ٹیوب ٹرین میں گورے اخبار پڑھ لیتے ہیں۔انگلش وزیراعظم جان میجر دفتر جاتے کار میں اخبار پڑھ لیتے تھے۔

ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر میں بس، ٹیوب ٹرین، ہوائی جہاز میں فارغ وقت کو بھی فائدے کے لیے استعمال کریں۔کتاب پڑھیں۔لیپ ٹاپ پر میٹنگ کی تیاری کریں۔

۳۔ہفتہ وار چھٹی کا فارغ وقت

ہفتہ وار چھٹی کے فارغ وقت کو پلان کریں جیسے سپورٹس کھیلنے،، بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارنے، دوستوں سے ملنے جانا، کتابیں پڑھنے، گانے سننا یا گانا، پینٹنگ کرنا،،

گھوڑ سواری، سیر کرنا، TV وغیرہ دیکھنے میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ ہر ایک کی اپنی پسند، سوچ اور صوابدید پر ہے۔ یعنی دماغی اور جسمانی تھکان دور کرنے کے لیے مختلف مشغلے اختیار کرتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ میوزیم یا لائبریری جانا، پکنک، ہائیکنگ، ایڈونچر پر جانا تو ویک اینڈ کا پسندیدہ پروگرام ہوسکتا ہے۔

۴۔سوشل ہونے کے لیے بھی وقت پلان کرنا پڑتا ہے

آج کل ملنے جلنے کے بھی اپنے آداب ہیں، وقت کو بھی پلان کر کے کال کر کے جائیں۔ ہم ابھی تک زرعی دور کی ذہنیت سے رہ رہے ہیں جس میں وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وقت مقرر کر کے کوئی نہیں آتا اور جب تک جی چاہے بیٹھے گا۔ کسی کو بھی دوسروں کے وقت کی کوئی فکر نہیں ہوتی اگر کوئی غلطی سے کہہ دے تو برا مناتے ہیں کہ اپنوں کے گھر کال کر کے نہیں آتے اوپروں سے وقت لے کر ملتے ہیں۔

۵۔ پیشہ ورانہ دنیاوی ترقی، علمی ،روحانی اور دینی ترقی کے لیے بھی فارغ وقت کا صحیح استعمال ہی دراصل ترقی کا راز ہے۔ ہر پیشہ میں عموماً 4 سے 5 سال کے بعد پھر اضافی علم، ٹریننگ کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تا کہ وقت کے ساتھ بڑھتی ذمہ داریوں کو بخوبی سنبھال سکیں۔ وقت کے ساتھ اپنے ذاتی کریکٹر، رویوں، عادات، پیشے وغیرہ میں ترقی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یا پیشہ میں ترقی یا پیشہ تبدیل کرنے کی ضرورت میں فارغ وقت ہی کام آتا ہے۔ یا پھر کام کے بعد زائد آمدنی کے لیے فارغ وقت ہی مددگار ثابت ہوتا ہے

اگر اپنی تحریری صلاحیت بڑھانی ہو تو لٹریچر پڑھنا ہوگا۔ الفاظ کی تعداد بڑھانی ہو تو۔ الفاظ کا صحیح استعمال سیکھنا ہوگا۔ لکھنے کی پریکٹس کرنی ہو۔ اگر اس کے کام میں تقریر کرنا ضروری ہو۔ میٹنگ میں بریفنگ دینی ہوں، تو گفتگو کا فن، تقریر کا فن خود سے سیکھنا ہوگا۔ یہ سب فارغ وقت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

صحت کو ٹھیک رکھنے کے لیے گیمز میں حصہ لینا ہوگا۔ فورسز میں فٹ رہنے کے

لیے تمام سپاہیوں، افسروں کو روزانہ کھیلوں میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ خود کہتا ہے کہ اس کی یاد سے ہی دل سکون پا سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے پروردیگار کے ساتھ ملنا، باتیں کرنا، اس کا ذکر کرنا، دراصل ذہنی و جسمانی تکان کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اعصاب مضبوط ہو جاتے ہیں۔ Relax ہو جاتے ہیں۔ خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

فارغ وقت دن کے کاموں کا تجزیہ و احتساب کرنے کا بھی موقع فراہم کرتا ہے۔ اگلے دن کی پلاننگ کے لیے وقت بھی۔ اللہ سے مدد مانگنے کا بھی، خود احتسابی سے انسان درست راہ پر رہتا ہے۔ بھٹکتا نہیں۔ فارغ وقت میں مراقبے یعنی Contemplation کے ذریعے Intution حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ غرضیکہ مراقبے سے اللہ کی قربت اسی کے نور سے سینہ، دل، دماغ منور کرنے، اپنی خودی کی تعمیر، شخصیت میں بہتری کے لیے فارغ وقت ہی ذریعہ بن سکتا ہے۔ مراقبہ کا صحیح وقت ترجیحاً رات کا وقت ہے۔

ہم اگر قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کو روحانی ترقی کے علاوہ ان کی سوشل application کرنا سیکھ لیں اور تحقیق کر کے لکھنا شروع کر لیں تو تبھی کلام پاک کی سمجھ آئے گی جو کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا مقصد ہے کہ اس دنیا کو کیسے بہتر بنا کر جنت بنانا ہے۔ اسوۂ حسنہ کے واقعات سے معاشرتی اصول اور رولز بنانے سے ہماری زندگیوں میں آسانی آئے گی۔ ایڈمنسٹریشن بہتر ہوگی۔ آپس میں پیار محبت یک جہتی بڑھے گی۔

صدیوں سے ہم نے چونکہ اس سورہ اور اس پر مبنی سنت رسول کو معاشرتی لیول پر نہیں سمجھا تو اسی لیے دیہات میں فارغ وقت کو عورتوں اور مردوں کی تعلیم کے لیے استعمال نہیں کرتے رہے اور جہالت کا دور دورہ رہا ہے۔ ہم عام مسلمانوں کو چاہیے کہ ہم خود کلام پاک پر ریسرچ کریں یہ ہمارا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ انسان کی شخصیت میں وہ تجربات اور سیکھے گئے سبق ہوتے ہیں جو کوئی duplicate نہیں کر سکتا۔ اس علم سے

دین کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جن کو سب مسلمانوں کے ساتھ شیئر کرنا فرض بنتا ہے کیونکہ یہ سبق اللہ تعالیٰ نے سکھائے ہی اسی لیے ہوتے ہیں کہ اسلامی علوم کی ترقی ہو۔ ایک عام مسلمان کو شیئر کرتے کوئی جھجک یا ڈر اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ میں عالم دین نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہر ایک کے تجربات سے دین کی سمجھ میں ایک دو نئی مفید باتوں کا ضرور اضافہ ہوگا، یا اس آدمی کی اپنی غلط سوچوں کی تصحیح ہو جائے گی۔ اگر کوئی بات یا نتیجہ غلط ہوا تو اس پر دوسرے اعتراض ضرور کریں گے۔ اس سے آپ اپنے رائے بدل سکیں دے جو کہ آپ کی تعلیم کا کام دے گی۔ غلطیاں کر کے ہی بندے سیکھتے ہیں۔ یا پھر مزید تحقیق سے آپ اپنی بات کو سچ ثابت کر سکیں گے۔ علم ہمیشہ بتدریج ترقی کرتا ہے۔

فارغ وقت کا صحیح استعمال کرنے والے ہی ترقی کر سکتے ہیں اور کمال حاصل کر سکتے ہیں۔ طالب علموں کو گرمیوں میں دو مہینے کی چھٹیاں ہوتی ہیں اور سردیوں میں پندرہ دن کی۔ وہ یہ وقت عموماً ضائع کر دیتے ہیں۔ چند آئیڈیاز دے رہا ہوں۔

پہلے پلان کریں کہ آیا آپ کو سکول کالج کی پڑھائی میں ایکسٹرا ٹائم دینے کی ضرورت ہے تو پہلے اس کو دیں یہ پرائمری فرض ہے جو والدین نے دیا ہے۔ اگر ضرورت نہیں تو پھر دن کا کچھ وقت ان باتوں کے لیے پلان کریں۔

۱۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا پیغام عمل کرنے کے لیے ہے، ثواب کے لیے نہیں۔ سمجھنے کے لیے ایک ایک آیت کو پڑھ کر خود سوچیں کہ آپ کیا سمجھے۔ پھر کوئی تفسیر پڑھیں۔ پھر کسی عالم دین سے پوچھیں پھر دوستوں سے شیئر کریں۔ جو نتیجہ نکالیں اس کو لکھ لیں اور پھر اس پر عمل کریں۔

۲۔ سیرت کی کوئی اچھی سی کتاب پڑھیں۔ اور ایک واقعہ پڑھ کر اس پر سوچیں کہ اس سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں جو کہ زندگی میں استعمال کر سکیں۔ جو اصول سیکھا ہے اس کو لکھیں اور دوستوں سے شیئر کریں۔

۳۔ کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ جس میں ادب، شاعری، سفرنامے، افسانے، ناول، مشہور لوگوں کی سوانح حیات وغیرہ ضرور پڑھیں۔ پرانے زمانے کے

حالات، کلچر کو سمجھنے کے لیے کی اردو انگریزی کتابیں پڑھیں جیسے کہ انگلش کے پہلے ناول کی ہیروئین اپنے باپ سے کہتی ہے کہ یہاں تو ہماری کمائی غنڈے اور بادشاہ لوٹ لیتے ہیں یورپ میں بھی یہی حال ہے مراکش چلتے ہیں وہاں امن ہے انصاف ہے۔اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں مسلمان ملک آج کے مغربی ممالک کی طرح ترقی یافتہ تھے۔یا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھیں تو ۱۸۵۰ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا پتہ لگتا ہے کہ جہالت عام تھی۔

۴۔ پڑھے لکھے لوگوں، علماء، خاندان کے بوڑھوں کے پاس جا کر ان کے تجربات یا ان کے حالات سنیں اور ان کو لکھنے کی عادت ڈال لیں۔

۵۔ والنٹیئر ورک کریں۔ جیسے ہسپتال جائیں۔ ان میں پرانے رسالے کتابیں بانٹیں۔یا اپنے علاقے میں جو ضرورت ہو وہ کریں۔

۶۔ صحت بہتر کرنے کے لیے روزانہ ورزش کا پروگرام بنائیں۔

۷۔ دوستوں کے ساتھ دوسرے علاقوں کی سیر کو جائیں۔اس کو علاقے کی علمی تحقیق کا موضوع بنائیں۔اپنے شہر کے ایک ایک کونے کو دیکھیں۔

غرض کہ اپنے وسائل سے جو مناسب بن سکے وہ کریں۔

وقت بچانے کے بھی بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔جن سے اتنا وقت بچ جائے گا کہ کچھ اور کام کر سکیں گے۔

۱۔ ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر رکھیں تا کہ ڈھونڈنے پر وقت ضائع نہ ہو۔

۲۔ ایک وقت میں بہت سے کام نہ کریں ورنہ آپ چالیس فیصد کم کام کر سکیں گے۔

۳۔ ڈائری بنا کر ہر کام، کرنے کا وقت، ترجیحات سب لکھ لیں تا کہ ایک جگہ سب کاموں کی لسٹ ہو اس سے یہ ہوتا ہے کہ آپ کوئی ضروری کام بھولتے نہیں۔

۴۔ نیا کام دیکھ کر آپ اس پر توجہ نہ دینے لگیں اس سے جو ضروری کام کر رہے ہیں، رہ جاتا ہے ایک کام پر توجہ رکھیں اور دوسرے کام کو صرف نوٹ کر لیں۔

۵۔ خیالی پکاؤ نہ پکائیں۔

۶۔ اپنی خریداری پلان کریں۔ گھر کی چیزوں کی لسٹ بناتے رہیں اور ایک ہی دفعہ جا کر لے آئیں نہ کہ گھر آ کر پھر جانا پڑے۔ یا دو تین جگہوں کی چیزیں بھی ایک دفعہ لے آئیں۔

۷۔ روٹین کرنے سے بھی وقت بچتا ہے اور ذہن دوسرے کاموں کے لیے فری ہو جاتا ہے۔

۸۔ کھانے کی بھی پلاننگ کریں۔

۹۔ اپنے وقت ضائع کرنے والی عادات نوٹ کریں، جو آپ کا وقت ضائع کرتے ہیں ان کا بھی حساب کریں۔ جیسے بستر میں جاگنے کے بعد پڑے رہنا۔ شام کو صبح کے کام کی چیزیں ٹیبل پر رکھ دینا۔

۱۰۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے اس کی فکر کرنا بند کریں۔ ٹھیک کرنے کے لیے اگر کچھ کر نہیں سکتے تو فکر بند کریں صرف دعا کریں۔

اپنی عادات منظّم کریں اٹھتے ہی بستر بنا لیں۔ کمرے اور ٹیبل صاف کر کے اٹھنے کی عادت ڈالیں۔ جو کام ابھی کر سکتے ہیں ابھی کریں، ٹالیں نہیں۔ اپنے آپ کو بھی شاباش دینا سیکھیں۔ اس سے دل خوش ہوتا ہے۔

سبق

ہر غلط مائنڈ سیٹ سے نجات پانے کی ضرورت ہے کیونکہ وقت کی نعمت کے غلط استعمال کی بھی قیامت کے دن جواب دہی ہوگی۔ ہم وقت کے زیاں کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ وقت ہی تو اصل اثاثہ اور دولت ہے مگر ہمیں اس کا احساس ہی نہیں۔ اس سنت پر عمل کرنا آسان ہے۔ کیونکہ یہ ذاتی فعل ہے۔ صرف عادت ڈالنے کی ضرورت ہے۔

☆......☆......☆

۴۸۔ صحت کے لیے وقت کا پروگرام بنانا بھی سنت ہے۔

حدیث: ''تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔''

''دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں بہت سے لوگ نقصان میں پڑے ہیں، صحت اور فراغت۔'' (کنز العمال حدیث نمبر 6444۔ بخاری، ترمذی، ابن ماجہ عن ابن عباسؓ)

قوم کی صحت ہر ایک فرد کے صحت مند ہونے پر منحصر ہے کیونکہ ہر فرد قوم کی قسمت کا ستارہ ہوتا ہے۔ جسم ایک مشین ہے۔ اسی سے ہماری روح نے کام لینے ہیں۔ جیسے ہم مشینوں سے کام لیتے ہیں۔ اور مشینیں دیکھ بھال کے بغیر جلد خراب ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنے جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے اپنے یومیہ پروگرام میں ورزش کا حصہ ضرور رکھنا چاہئے۔ یہ سنت بھی ہے، اسوۂ حسنہ بھی اور نبوی نصیحت بھی اور بڑوں کی نصیحت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ، اور صحابہ کرامؓ نے جو جنگیں لڑیں، مشقتیں جھیلیں، خندقیں کھودیں، گرمیوں میں سینکڑوں میل دور غزوہ تبوک کے لیے گئے، یہ سب بہترین جسمانی صحت، مضبوط جسم کا کمال نہیں تھا۔؟ کیا یہ صرف روحانی طاقت تھی؟ بالکل نہیں۔ یہ آپ کی لیڈرشپ میں سب سے physical fit انسانی جمعیت تھی۔ اتنی فٹ کہ جو غزوہ احد میں زخمی ہونے کے باوجود دشمن کے تعاقب کے لیے چل پڑے تھے۔ کیا یہی صحابہ کرام نہیں تھے جنہوں نے روم اور ایران کی فوجوں کو حضور ﷺ کی وفات کے صرف دس سال میں شکست دی تھی۔ ہم نے تو اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کو کبھی صحیح سمجھا ہی نہیں۔ پاکستان آرمی، نیوی، ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں کی جنگوں میں

جسمانی طاقت کی کہانیاں سنیں تو پتہ چلے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کو جسمانی، ذہنی، نفسیاتی، روحانی لحاظ سے ہر وقت فٹ رہنا چاہئے۔ یہی سنت رسول کریم ہے۔مختلف غزوات میں نبی کریم ﷺ کی عمریں دیکھیں تو فٹنس کا اندازہ ہو جانا چاہئے: غزوہ بدر۔۵۳ سال، غزوہ احد،۵۴ سال، غزوہ خندق ۵۷ سال، مکہ کی فتح ۶۳ سال۔

مغربی ممالک میں پارک، پلے گراؤنڈ، جم gymnasium اتنی تعداد میں ہیں کہ ورزش کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔اسی لیے ان ممالک میں لوگ اپنی صحت کا بہت خیال کرتے ہیں۔ اور ورزش کے لیے جو وقت میسر آئے اس میں ورزش کر لیتے ہیں۔ شفٹوں میں کام کرنے والے اپنی صحت کے لیے جاگنگ کے لیے جو بھی وقت ملے یہ لوگ سڑکوں پر دوڑتے ملیں گے صبح بھی، دوپہر کو اور شام کو بھی۔جم میں جانا بھی بہت پسندیدہ عادت ہے، خاص طور پر برفباری کے بعد گھر کے اندر ورزش کی جاتی ہے خواتین میں تو یوگا بہت پسندیدہ ایکسر سائز ہے۔بعض دفتروں میں بھی جم بنے ہوتے ہیں تا کہ سٹاف گھر جانے سے پہلے اگر چاہے تو ورزش کر سکے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی اس انسانی جسم کی مشین، کی دیکھ بھال اور maintenance کو ہم نے مذہبی فریضہ سمجھا ہی نہیں ہے اور نہ ہی قرار دیا ہے اور نہ ہی ورزش پر کبھی ثواب کا ذکر سنا ہے، اور ثواب کے بغیر ہم کوئی چیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو پھر ہمیں احساس ہو ہی نہیں سکتا کہ ورزش کی جگہیں بنائیں یا کھیل کے میدان چھوڑیں۔اسی لیے تو ہمارے یہاں جسمانی صحت کے لیے ورزش کے لیے کہیں بھی گراؤنڈ نہیں ملے گا۔ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں انگریزوں کے بنائے قانون کے مطابق کھیل کے میدان اور عورتوں بچوں کے لیے تفریح کے لیے پارک چھوڑنا ضروری ہوتا ہے، مگر ہم اس کو کروڑوں روپے کی جگہ کا زیاں سمجھتے ہیں۔ ہر چیز پیسوں میں ناپتے ہیں۔معاشرتی، روحانی، نفسیاتی ضرورتیں کوئی قیمت نہیں رکھتیں۔ ہاؤسنگ سوسائٹیاں اگر نقشے میں قوانین کی مجبوری سے خالی چھوڑ بھی دیتی ہیں تو بعد میں ان میں بھی پلاٹ بنا کر پیسہ کما لیا جاتا ہے۔

ذہنی طور پر بھی ہم نے ورزش کے لیے صرف عصر کا وقت رکھا ہوا ہے جو کہ انگریزوں کی پریکٹس ہوا کرتی تھی۔ اگر یہ وقت میسر نہ ہوتو پھر ورزش ہی نہیں کرتے۔ واکنگ پر جائیں تو لوگ لفٹ دینے رک جاتے ہیں کیونکہ واکنگ بھی رواج میں نہیں رہا۔

دیہات میں عورتیں ہرقسم کے سخت کام کرتی ہیں اس لیے وہ ویسے ہی مضبوط جسم کی مالک ہوتی ہیں اور موٹی بھی نہیں ہوتیں۔ مگر شہر کی عورتوں کو ورزش کی سخت ضرورت ہوتی ہے مگر ہمارے مسلمانوں کے کلچر میں مذہب اور عبادات ہی پر زور دیا جاتا ہے، دنیا کی ضروریات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پردے کے نظریہ کی وجہ سے اس لیے عورتوں کی جسمانی فٹنس اور ورزش کا نظریہ ہی نہیں ہے، اس لیے موٹی اور بھدی ہو جاتی ہیں جبکہ عورتوں کی خوبصورتی کے لیے سڈول جسم ضروری ہے اور ہر عورت چاہتی بھی ہے۔ اگر عرب عورتوں کی جنگوں میں حصہ کی تاریخ پڑھیں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جسمانی لحاظ سے مردوں کے برابر فٹ نہ ہوتی ہوں۔ اس لیے ہمیں عورتوں کی جسمانی فٹنس کے نظریہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں انڈیا میں رہ چکا ہوں۔ وہاں مرد عورتیں بوڑھے، ورزش کے لیے، صبح سورج نکلنے سے پہلے، یوگا چٹائی لے کر پارک پہنچے ہوتے ہیں۔

میرے مطابق، ہماری عورتوں کے لیے گھر کے اندر یوگا کی ورزشیں بہترین حل ہیں اور بچپن سے ہی لڑکیوں کو جسمانی فٹنس کی عادت ڈالنی چاہئے مگر یوگا کو ہندوؤں کی پریکٹس سمجھ کر ہمارے مذہبی لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے، اس لیے اس کے خلاف فتوی دیا ہوا ہے کہ یوگا حرام ہے۔ حالانکہ یہ کوئی عبادت نہیں بلکہ ورزش کا پروگرام ہے۔ ہماری سوچ کے برعکس، مغربی ممالک نے یوگا کی ورزشوں کو فائدہ مند سمجھ کر اپنا لیا ہے اور سردیوں کے موسم میں عورتوں میں گھر میں یوگا ورزش کا طریقہ بہت پسندیدہ ہے۔ وہ لوگ دنیا کے ہر ملک اور مذہب سے اچھی چیزیں لینے میں عار نہیں سمجھتے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی ہمیں حکمت کی ہر چیز جہاں سے ملے لے لینے کا کہا ہوا ہے۔ مگر مذہبی

تعصب اس میں مانع ہوجاتا ہے حالانکہ علم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

ایک حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ”آپ کے ساتھ دوڑ کے مقابلے میں میں جیت جاتی تھی۔ جب میں تھوڑی موٹی ہوگئی تو آپ جیت گئے تو آپ کہنے لگے کہ تمہاری پہلی جیت کو کینسل کررہی ہے۔“

Then he said, ‘this cancels that (referring to the previous race).’”[6]

یہ مثال ہماری عورتوں کے لیے اہم سبق ہے۔ ہم یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے مگر ہم اسوۂ حسنہ سے مردوں اور عورتوں کی ورزش اور جسمانی فٹنس بارے واقعات کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک طاقتور مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے اگر دونوں میں سے ہر ایک بھلائی بھی ہے۔

The Prophet SAW said “The strong believer is better and more beloved to Allah than the weak believer, while there is good in both.” (Sahih Muslim)

یہ حدیث ایک سچائی اور عمومی اصول بیان کررہی ہے۔ اس میں ہر قسم کی طاقت شامل ہے جسمانی بھی جس کے لیے ورزش، جم، اور کھیلوں کی ضرورت شامل ہیے مالی، معاشی، علمی، ذہنی، فوجی روحانی، نفسیاتی، جذباتی سب طاقتیں شامل ہیں۔

تیز چلنا سنت نبوی ہے

ایک سنت یہاں بیان کررہا ہوں جس کو اپنا لیا جائے تو مرد اور عورتیں جسمانی لحاظ سے فٹ رہیں گے۔

حدیث: ”آپ بہت تیز چلتے تھے کہ دوسروں کو آپ کے ساتھ چلتے مشکل پیش آتی تھی۔“

دوسری حدیث: ”آپ پیدل چلنے کو ترجیح دیتے تھے جبکہ آپ گھوڑے، گدھے پر بھی جا سکتے تھے۔ آپ کی چال کو جاگنگ کہہ سکتے ہیں۔ یا

پھر brisk walk''

The Prophet's walk is described as form of jogging, harwala, as he was always in a hurry.

نبی کریم ﷺ مدینہ کے گرد بیویوں کے ساتھ بھی چکر لگاتے تھے اور صحابہ کرام کے ساتھ بھی۔ یعنی بیویوں کے ساتھ سیر بھی کرتے تھے، مگر ہمارے کلچر میں بیویوں کے ساتھ سیر کا تصور ہی نہیں رہا مگر اب بن رہا ہے۔ اس کی وجہ غلط مذہبی سوچ ہے۔ جس کی اصلاح کا ذکر امام ابوالحسن الشاذلی نے کیا تھا۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مغربی ممالک میں کوئی بھی آپ کو سست رفتاری سے چلتا نظر نہیں آتا، نہ مرد اور نہ ہی عورتیں اس کی دو وجہیں ہیں کہ وقت ضائع کرنے سے بچتا ہے آپ جلدی سے دوسری جگہ پہنچ کر کام شروع لیتے ہیں دوسرے تیز چلنے سے ساتھ ہی ورزش بھی ہوتی جاتی ہے یعنی آپ ایک تیر سے دو شکار کر رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تمام مرد اور عورتیں اپنی روایتی جھجک دور کر کے اس اہم سنت پر عمل شروع کر دیں گے اور کسی کے اعتراض کرنے پر اسے بھی حدیث سنا کر قائل کریں کہ یہ ثواب کا کام بھی ہے اور جسمانی صحت مندی کا بھی۔ اور شرم والی کوئی بات نہیں۔ اگر عورتوں کے لیے علیحدہ جم نہیں ہے تو گھر میں ورزش کی جا سکتی ہے۔

سبق:

اس سنت کی روشنی میں جسم کو صحت مند رکھنے کے لیے ورزش کرنا بھی عبادت بن جاتا ہے۔ ورزش ثواب کا باعث بھی بنے گا۔ صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔

اگر ہر ایک صرف تیز چلنے کی عادت کو اپنا لے، خصوصاً عورتیں تو وہ بالکل فٹ رہیں گی۔ آپ ٹی وی یا فلموں میں گوری عورتوں کو چلتے دیکھ لیں تو سمجھ آ جائے گی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

میرے خیال میں عورتوں کو گھر میں رہ کر یوگا کی ورزشوں کے لیے وقت نکالنا

چاہیئے۔مرد بھی یوگا کر سکتے ہیں اوران کے علاوہ ایروبک aerobic ورزشیں ہیں ٹی۔وی پر بھی ورزشیں سکھائی جاتی ہیں۔یوٹیوب اورانٹرنیٹ پر بھی مواد موجود ہے اصل مسئلہ تو ورزش کی ضرورت کے احساس کرنے کا ہے۔

کیا اب بھی مسلمان مرد،عورتیں بچے اپنی صحت کے لیے ورزش کرنا شروع نہیں کردیں گے؟

اس سنت پر عمل بہت آسان ہے۔کیونکہ ذاتی معاملہ ہے۔

میں نے نبی کریم ﷺ کی ہیلتھ اور ورزش پر ریفرنس انٹرنیٹ سے لیے ہیں اور ضمیمے میں دے دیئے ہیں۔

☆......☆......☆

۴۹۔کھانے کے بعد پلیٹ صاف کرنے کی حکمت

”کھانے کے بعد پلیٹ کو صاف کرنا اناج ضائع ہونے سے بچانے کی سنت ہے۔جو کھانا ضائع ہوگیا تو کہیں نہ کہیں کوئی بھوکا رہ جائے گا۔“

حضور اکرم ﷺ کی احادیث اور سنت میں کیا کیا دنیاوی حکمتیں پوشیدہ ہیں اس پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ہم اس کو صرف مذہبی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ اس میں کتنا ثواب ہوتا ہے۔ ہمارے سارے کام ثواب کے چکروں میں ہوتے ہیں جبکہ آپ کے فرمانوں کے پیچھے حکمتوں کا احاطہ اوران پر عمل کے لیے طریقے بنانے اور عادات میں سمونے کا طریقہ مغربی اقوام نے ہی سوچا ہوا ہے۔کیونکہ انہیں ہر بات کو مختلف طریقوں، زاویوں سے دیکھنے کی تربیت دی گئی ہے اور علم بھی۔ اسی لیے کتاب ”بلال“ کے انگریزی میں ترجمہ کرنے والے مسٹر کریگ Craig کا کہنا ہے حضور اکرم ﷺ نے مدینہ جا کر قرآن کو سوشیالوجی میں تبدیل کر دیا۔یعنی تمام احکامات کو معاشرتی اعمال، عادات اور رسوم میں بدل دیا۔“ بقول مولانا عبیداللہ سندھی جب تک احکامات کو رسوم و عادات میں نہ بدلا جائے ان کو دوام نہیں مل سکتا۔

یہی بات کھانے کے آداب اور سنتوں میں سے پلیٹ کو صاف کرنے کی سنت یا معاشرتی عادت ہے جس پر آپ ﷺ نے اصرار فرمایا اس میں یہ راز ہیں:

کھانے کی پلیٹ کو تبھی صاف کیا جا سکتا ہے کہ اس میں تھوڑا کھانا ڈالا جائے تاکہ آسانی سے اس کو ختم کیا جا سکے۔اس کیلئے ضروری بن جاتا ہے کہ اپنے اندازے، بھوک کے اندازے، سے کم ڈال لیا جائے اور اگر بھوک اب بھی رہ گئی ہو تو دوبارہ لے لیا جائے۔

اس سنت کے برعکس لوگوں کو کسی شادی کی دعوت میں پلیٹیں بھرتے دیکھ لیں تو

پتہ چل جاتا ہے کہ اس سنت کی خلاف ورزی کیسے کی جاتی ہے۔ مگر مغربی مما لک نے اس سنت پر عمل کرنے کیلئے تھوڑا تھوڑا کر کے ایک دو بار لینے کی رسم اور عادت بنالی ہے۔ اس کے لئے ڈونگے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے عموماً ان کی پلیٹ میں کھانا بہت کم بچا دیکھنے میں آئے گا۔ اگر پلیٹ میں کھانا نہ بچا ہو تو اس کو صاف کرنے میں بھی کم مشکل ہوتی ہے، عورتوں کے لیے آسانی ہو جاتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ کھانا اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ملکیت ہے جو ہمیں صرف استعمال کے لیے عطا کیا جاتا ہے اور استعمال ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کرنا ہوتا ہے۔

سب سے اہم مقصد کھانا ضائع ہونے سے بچانا ہوتا ہے جو دوسرے وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم ملکی اور معاشی نقطہ ہے جس کو حضور ﷺ سمجھا رہے تھے اور اس لیے یہ بات سمجھنا ہر مسلمان کیلئے بہت ضروری ہے کہ جو کھانا ضائع ہو جاتا ہے۔ وہ دراصل کسی اور کے کھانے کے کام آنا تھا یا آ سکتا تھا، اس وجہ سے کوئی آدمی نیشنل لیول پر بھوکا رہ جائے گا یا رہ سکتا ہے۔ اس کا احساس اور تجربہ مجھے 1993 کے سیلاب میں زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا۔ ہیلی کاپٹر آٹے کی بوریاں گرا رہا تھا جو بوری غلطی سے پانی میں گر جاتی تھی، وہ ضائع ہونے سے ان لوگوں میں سے بہت سے لوگ کھانے سے محروم رہ جاتے تھے۔ تبھی مجھے اس حدیث کی اہمیت کا احساس ہوا کہ واقعی کھانے کے ایک ایک دانہ کو بچانا کیوں ضروری ہے۔

اسی سیلاب کے دوران مجھے اپنی کمپنی، کے ایک نقصان کے تجربہ سے ایک اور احساس ہوا۔ میری ہدایات کی خلاف ورزی کرتے، ایک ڈرائیور نے مارشلر کے بغیر پارکنگ کرتے بڑی مسافر بس کی بیک لائیٹ کو نلکے سے مار کر توڑ دیا۔ مجھے بتایا گیا تو ڈرائیور سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اس کی غلطی کی وجہ یہ خیال تھا کہ چونکہ پارکنگ ایریا میں ایک بھی گاڑی نہ تھی اس لیے اس نے سوچا کہ بغیر دوسرے آدمی کی ہدایات کے پارک کرلوں گا۔

اس پر میں نے سب سٹاف کو بلا کر کہا کہ ہر حکم میں ایک حکمت ہوتی ہے اور اس

ڈرائیور نے لائٹ توڑ کر تم سب کا بھی نقصان کیا ہے کیونکہ تمہارے بونس میں سے چاہے ایک پیسہ ہی کم نہ ہو، کم ضرور ہو جائے گا۔ اس پر ڈرائیوروں نے کہا کہ نقصان تو کمپنی کا ہوا ہے اس سے ان کا سالانہ بونس کیسے متاثر ہوگا تو میں نے سمجھایا کہ کمپنی کو چونکہ یہ لائٹ دوبارہ خریدنے پر خرچہ ہوگا تو کمپنی کی سالانہ بچت میں اتنی رقم کی کمی ہو جائے گی۔ جس سے بونس کی تمام رقم میں سے اس کا ایک حصہ کم ہو جائے گا، جو ان سب کی طرف ہی منتقل ہو جائے گا۔ ان کو پھر بھی سمجھ نہ آئی تو میں نے انہیں ایک اور طرح سے یوں سمجھایا۔

میں نے ایک ڈرائیور سے کہا کہ اگر تمہارا بیٹا ایک گلاس توڑ دے تو تم اس کو غصہ کیوں ہوتے ہو۔ کہنے لگا کیونکہ اس نے نقصان کر دیا ہوتا ہے تو سمجھایا کہ چونکہ تمہیں گلاس خریدنے کیلئے اتنے پیسے دوبارہ خرچ کرنے ہوں گے جو تم کسی اور نئی چیز لینے پر خرچ کر سکتے تھے۔ اس لیے غصے ہوتے ہو۔ مگر تمہیں ذاتی نقصان کے علاوہ ایک دوسرے نقصان کا نہیں پتہ جو نقصان پوری قوم کا بھی ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پورے پاکستان میں جتنے نئے گلاس بنیں گے ان میں سے ایک تم خرید لو گے۔ اگر تمہارا گلاس نہ ٹوٹتا تو وہ گلاس کسی اور نے خرید لینا تھا جو وہ اب نہیں خرید سکے گا اور یوں محروم رہ جائے گا۔ الحمدللہ کہ میری کمپنی میں ایکسیڈنٹ کی شرح بہت کم ہو گئی۔ اسی طرح ٹوٹ پھوٹ میں بھی کمی آ گئی۔

یہی حال کھانے کی اشیاء کا ہے کہ جو چیز کسی نے گھر میں ضائع کر دی اس سے کوئی نہ کوئی اس کا ہم وطن محروم رہ جائے گا۔ اگر یہ احساس جنم لے لے تو ہم تازہ سبزیوں کو خراب ہونے سے بچانے کیلئے کولڈ سٹوریج، ڈبوں میں بند کرنے کا انتظامات، پکے کھانے کو ڈبوں میں بند کرنے وغیرہ کے انتظامات کریں جیسے مغربی ممالک کرتے ہیں۔ اس طرح فروٹ کو بچانے کیلئے بھی۔ ورنہ ہمارے پھلوں سبزیوں کا ایک بڑا حصہ خراب ہو کر ضائع جاتا ہے جو کہ ذاتی اور نیشنل لیول دونوں پر بہت بڑا مالی نقصان بنتا ہے۔ ہوٹلوں اور شادی بیاہ میں پہلے پوری روٹی رکھنے سے آدھی کھائی روٹیاں ضائع ہو جاتی تھیں۔ اب ان کو دو حصوں میں کرنے سے wastage کم ہو گئی ہے کیونکہ روٹی

کا آدھا حصہ لوگ ختم کر لیتے ہیں اگر ایک دو لقمے ضائع بھی ہوں تو کم نقصان ہوتا ہے۔ اب کئی جگہ چار حصے بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف بزنس میں بچت کی غرض سے کیا گیا ہے مگر اس سے نیشنل لیول پر بھی بچت شروع ہو گئی ہے۔

دفتروں میں پہلے فل سکیپ کاغذ استعمال کرتے تھے جس سے چھوٹے خط کی شکل میں کاغذ ضائع ہو جاتا تھا۔ اب A4 سائز سے بچت ہونے لگی ہے۔ بعض ملک اے فور کا آدھا سائز بھی استعمال کرتے ہیں

جرمنی میں ہوٹل میں کھانا ضائع کرنے پر جرمانہ بھی ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پیسے آپ کے ہیں مگر کھانا قوم اور ملک کی ملکیت ہے اس لیے اتنا آرڈر کریں جتنا کھانا ہے۔ اگر بچ جائے تو ساتھ لے جائیں وہ بچا کھانا آپ کی ملکیت ہوتا ہے لے جانے میں کچھ ہرج نہیں مگر پہلے لوگ اسے چھوٹا پن اور بے عزتی سمجھتے تھے۔

اگر آپ نئی چیز خرید لیں تو پرانی کسی کو دے دیں، کپڑے بھی الماریوں میں پڑے پرانے نہ ہوتے رہیں جو نہیں پہننے، دوسروں کو دے دیں۔ مغربی یونیورسٹیوں میں طالب علم ہمیشہ ایسے پھینکنے والی چیزوں کو خرید کر گزارا کرتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں سکول کی کتابیں نئی کلاس کے لیے سنبھال کر رکھتے تھے کیونکہ اس وقت مسلمان بہت غریب تھے اور نئی کتابیں نہیں خرید سکتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بار بار غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کہ اردگرد دیکھو۔ نشانیاں دیکھو، غور وفکر کرو۔ بلکہ آیات پر بھی اندھوں کی طرح نہ گرو اور عمل شروع کر دو، بلکہ غور وفکر کر نے کے بعد عمل کرو۔ تو ہم میں سے ہر مرد، عورت، بچہ، اس موضوع پر غور وفکر کر کے استعمال کی ہر چیز ضائع ہونے سے بچانے کے طریقے ایجاد کرنے چاہئیں۔

ہمیں اپنے ہر غلط مائنڈ سیٹ سے نجات پانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کھانے کی اشیاء نعمت ہیں اور ہر نعمت کے ضائع کرنے کی بھی قیامت کے دن جواب دہی ہو گی۔ کھانے کے علاوہ ہمیں ہر چیز ضائع ہونے سے بچانی چاہئے۔ وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ الحمدللہ کہ اب فوڈ بینک بھی بننے لگے ہیں جس میں لوگ فالتو کھانا دے آتے ہیں۔

سبق:

مالک کی چیزوں کی حفاظت بندوں کا فرض ہوتا ہے۔ضائع کریں گے، غلط استعمال کریں گے تو مالک ناراض تو ہوگا۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے چاہے گھر ہو، سکول، دفتر یا کمپنی میں ہو۔

زمین پر تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں جو اس نے ہمارے استعمال کے لیے پیدا کی ہیں اس لیے ہمیں اللہ کی ہر نعمت کا احساس ہونا چاہیے کہ ضائع نہ ہو۔اس کے حکم کے مطابق استعمال ہو۔ چاہے اناج ہو، وقت ہو، پیسہ ہو، جسمانی و ذہنی صلاحیتیں ہوں۔ اگر ضائع کریں گے تو وہ یقیناً ناراض ہوگا۔اسی لیے ضائع کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہتا ہے۔

اس سنت پر عمل کرنا بھی آسان ہے کیونکہ یہ ذاتی عادت کی بات ہے۔ بات احساس کی ہے۔انسانی اخوت کی ہے۔اگر بچپن سے ہی بچوں کو یہ سکھایا جائے تو یہ عادت عمر بھر ساتھ رہے گی۔ بوڑھوں کو دیکھیں تو وہ عموماً گھر میں بچی روٹی کے پرزے کر کے پرندوں کا ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ بچپن کی عادت ہے۔

☆......☆......☆

۵۰۔ پانی ضائع نہ کرنا بھی سنت ہے۔

آسٹریلیا کی منرل واٹر کی ایک کمپنی نے پانی ضائع کرنے سے بچنے کی مہم کے لیے اپنی بوتل پر یہ حدیث لکھی ہے کہ۔ **"پانی ضائع مت کرو چاہے تم ندی کے کنارے ہو۔"** یہ مندرجہ ذیل حدیث سے لیا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کے مطابق نبی کریم ﷺ حضرت سعدؓ کے قریب سے گزرے تو پوچھا پانی ضائع کیوں کر رہے ہو تو انہوں نے پوچھا کہ کیا وضو میں بھی ہے، تب آپ نے فرمایا کہ ہاں چاہے تم بہتے دریا کے کنارے بھی ہو۔" (ابن ماجہ، 425۔ گریڈ صحیح)

پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے انہیں نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے بہتر کوئی quotation کہیں سے نہیں ملی تو اسے اپناتے ان میں کوئی مذہبی تعصب نہیں آیا۔ آسٹریلیاء کا لکھنا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ انہیں بھی نیشنل لیول پر پانی بچانے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ کیونکہ تبھی یہ باقاعدہ مہم اور تحریک شروع کر دی گئی ہے۔ ہمارے یہاں بھی زیر زمین پانی کی سطح مسلسل گرنے سے شہروں میں پینے کے پانی کی قلت ہونی شروع ہوگئی ہے۔ تمام شہروں میں گھر اور سڑکیں بننے سے بارشوں کا پانی زمین کے اندر جانے کی بجائے بہہ کر سمندر میں جا گرتا ہے۔

ہمیں بھی نبوی نصیحت ہے۔ علم و حکمت جس جگہ بھی پائیں تو لے لیں مگر ہم نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ کوئی اچھی عادت نہیں اپنانی حتی کہ نبی کریم ﷺ کی بات بھی نہیں ماننی۔ اپنے مرضی کرنی ہے۔ اسی لیے ہمیں نیشنل لیول پر دونوں طرح کے پانی کی فکر ہی نہیں کہ زراعت کے لیے ڈیم بنا کر پانی ذخیرہ کریں کیونکہ برسات میں سارا پانی سمندر میں جا گرتا ہے۔ ہندوستان ہمیں بنجر بنانے کے لیے چناب، جہلم اور سندھ کا پانی ڈیم بنا

کر بند کر رہا ہے۔ پینے کے پانی کے زمین کے نیچے ذخائر کا لیول ہر شہر میں ہر سال نیچے ہوتا جا رہا ہے۔ دیہات سے نقل مکانی سے شہروں کی آبادی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ حکومت کو انسان کی بنیادی ضرورت جس پر زندگی کا دارومدار ہے یعنی پینے کا پانی، وہ مہیا کرنے کی بالکل بھی فکر نہیں۔ اور عوام کو بھی پانی بچانے یا کم کرچ کرنے کی فکر نہیں۔

انفرادی لیول پر بھی ہم عادتاً پانی بہت ضائع کرتے ہیں۔ گھروں میں کچن میں برتن دھوتے نلکا کھلا چھوڑ کر دھوتے ہیں۔ وضو کرتے بھی یہی کرتے ہیں کہ ٹونٹی فل کھلی رہتی ہے۔ کار دھوتے بھی خوب پانی بہاتے ہیں۔ انگلینڈ میں ایک سال بارشیں کم ہوئی تو کار واش بند کر دی گئی اور دھونے کے لیے بالٹی استعمال کرنے کا طریقہ اپنایا گیا تھا۔

ہم سوچ بچار کی بجائے عادات پر جاتے ہیں اور چیزیں ضائع کرنے کی بری عادت بھی ان میں شامل ہے، جسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اگر اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت کر کے عادت بدلی جائے تو نیکیاں اور ثواب بھی مفت میں کما لیں گے۔ اللہ اور رسول کو خوش بھی کر لیں گے اور نیشنل لیول پر پانی کی بچت بھی کر لیں گے۔ کیا یہ اچھا اور سستا سودا نہیں ہے؟

سبق

پانی کے زیاں پر بھی قیامت کے دن جواب دہی ہوگی۔ کیونکہ پانی بھی اللہ کی نعمت ہے۔ اور ہر نعمت کے صحیح اور غلط استعمال پر پوچھ ہوگی۔

وضو یا غسل کرتے یا برتن دھوتے ٹونٹی کم کھولیں۔ ٹونٹی لیک کرے تو فوراً ٹھیک کرائیں۔ فلش ٹینک پانی ضائع کرنے کی بڑی وجہ ہوتے ہیں۔ فلش لیک کرے تو پیچھے سے ٹونٹی بند کر دیں ورنہ رات بھر میں اور ہیڈ ٹین خالی کر دے گا۔ جہاں فلوٹ والو ہو، اسے ہمیشہ ورکنگ حالت میں رکھیں تاکہ سپلائی کے پانی کو بند کر سکے۔

اس سنت پر عمل بھی آسان ہے۔ بس احساس کر کے اور عادت بنانی ہوگی۔

☆......☆......☆

۵۱۔احسان مندی

ایک حدیث ہے: ”دلوں کی خلقت ہی ایسے ہوئی ہے کہ اسے بھلائی کرنے والے کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے۔اور برائی کرنے والے کے ساتھ دشمنی۔“ (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی چھل حدیث)

”**ھل جزاء الاحسانِ اِلاّالاحسان** (60) سورۃ رحمٰن 55: آیت 60،61۔ احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ یا ”نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟“

احسان مندی کا اظہار کرنے سے دوسرے کے ساتھ تعلقات میں بہتری آتی ہے۔

اگر آپ کے ساتھ جب دوسرے اچھا سلوک کریں تو پھر آپ کو کیا کرنا چاہیے۔آپ کو ان کا احسان مند ہو کر ان کے سلوک کا فوری طور شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اور جب موقع ملے تو احسان کا بدلہ احسان کر کے لوٹائیں۔

احسان مندی پریکٹس کرنے والے لوگ عموماً خوش رہتے ہیں اور صحت مند جسم اور ذہن کے مالک بن جاتے ہیں۔ اور اگر کبھی ناپسندیدگی کی بات ہو جائے تو اسے برداشت کی بھی عادت ہوتی ہے کیونکہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہمیشہ دو رخ ہوتے ہیں، اچھوں کے ساتھ برے لوگ بھی ہوتے ہیں۔

ایک پوائنٹ یہ بھی کہ احسان مندی کے اظہار سے دوسرے کی ہمت بڑھتی ہے اور وہ زیادہ نیکی کا کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، یعنی شکریہ کہہ کر آپ نیکیاں پھیلانے کا باعث بن رہے ہیں۔ دوسروں کو دیکھ کر مزید لوگوں کو بھی اچھے کام کی رغبت

ہوتی ہے۔اور یوں بھلائی پھیلتی جائے گی۔

احسان مندی پریکٹس کرنے کے لیے روزانہ سوچیں کہ آپ کے ساتھ کس کس نے کیا بھلائی کی ہے۔اس سے آپ کو نوٹس لینے کی عادت پڑے گی ورنہ ہماری عادت بن گئی ہے کہ ہمارے ساتھ ہونے والی اچھائیوں کو نوٹ ہی نہیں کرتے۔کبھی کبھار اپنی پوری زندگی کا جائزہ بھی لیں کہ ماضی میں کس کس نے آپ کو کامیاب بنانے میں کیا کیا رول ادا کیا ہے۔کس نے کردار سازی میں راہ دکھائی تھی۔جیسے والدین، بیوی، ٹیچر، کوئی رشتہ دار۔ دوست، اجنبی، باس، بزرگ، عالم دین، وغیرہ۔ جب یہ کر لیں تو ان کا مناسب طریقے سے شکریہ ادا کریں۔جا کر ملیں، خط لکھ کر شکریہ ادا کریں۔اگر فوت ہو گئے ہوں تو ان کے لیے دعا کریں صدقہ کریں۔ان کی خدمات کا دوسروں کے سامنے اعتراف کریں۔اس کے لیے آئیڈیاز خود سوچیں۔یقین جانئے کہ یہ کرنے سے آپ کو دلی خوشی ہوگی۔

سبق

سب سے پہلے تو پروردگار کی احسان مندی کا احساس ہونا ضروری ہے۔ یہ دو طرفہ تعلقات کا حصہ ہے۔اللہ اور رسول دونوں کی نصیحت ہے اور بڑوں کی نصیحت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔مزید یہ کہ اس کی بھی قیامت کے دن جواب دہی ہوگی۔

گولڈن رول کے مطابق یہی بنتا ہے کہ ہم احسان کا بدلہ احسان سے دیں۔

ہمارے معاشرے میں اس سنت پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔اس کی وجہ جھوٹی انا اور اکڑ، تکبر، غرور ہے۔ جو کہ ہماری قومی مرض ہے۔بہر صورت کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

☆......☆......☆

۵۲۔مہربانی،شکریہ،Thank you کہنا سنت ہے۔ کسی کو تکلیف پہنچانے پر معاف کیجئے،سوری sorry کہنا بھی سنت ہے۔

''شکریہ اور معاف کیجئے صرف مغربی آداب کا حصہ نہیں ہیں، جیسے کہ ہم میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں بلکہ سچ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام میں حقوق العباد کا اہم حصہ ہیں۔''

''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا اور جو تھوڑی چیز کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ بڑی چیز کا بھی شکریہ ادا نہیں کرتا۔'' (کنزالعمال-6482)

''لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ شکرگزار وہ ہے جو لوگوں کا زیادہ شکرگزار ہے۔'' (کنزالعمال-6483)

پاکستان میں تھینک یو اور سوری نہ کہنے کی عادت دراصل جھوٹی انا،تکبر،غرور، انا پرستی، اکڑ، بڑائی، چودھراہٹ وغیرہ کی وجہ سے ہے کہ لوگ دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ چھوٹے بڑوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں یا معافی مانگتے ہیں، نہ کہ بڑے چھوٹوں سے بھی کریں۔یعنی ان کا مرتبہ،مال،عزت،عمر میں چھوٹے لوگوں سے یہ رویہ حق کے طور امید کرتے ہیں نہ کہ دوطرفہ سمجھتے ہیں۔

یہ صرف شکریہ کہنے یا معاف کیجئے تک محدود نہیں بلکہ السلام وعلیکم کہنے میں پہل نہ کرنے میں بھی یہی اکڑ مانع ہوتی ہے۔میں نے انگلینڈ میں اپنے ایک عزیز کے بیٹے

سے پوچھا کہ آپ لوگ گوروں کو تھینک یو یا سوری کہتے ہیں۔ پاکستانیوں کو نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ وہ ہنس کر کہنے لگا۔انکل اگر میں نے کسی کو پہلے یہ الفاظ کہہ دیئے تو وہ بڑا چودھری ہو گیا یا اپنے کو مجھ سے بڑا سمجھے گا۔ کیونکہ ہماری سوچ کے مطابق چھوٹا بڑے کو یہ کہتا ہے۔ بڑا چھوٹے کو نہیں۔ یہی حال سلام کہنے میں بھی مانع ہے۔

اس طرح کسی غلط کام کرنے پر، یا غلط طور پر ناراض ہونے کے باوجود یا کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کے باوجود اپنی غلطی ماننے کی بجائے دوسرے پر الزام تراشی بھی، اس سوچ کی عکاسی کرتی ہے کہ میں تو معافی مانگنے سے رہا۔اس لیے کہ میں تو بہت بڑا ہوں۔عوام میں بھی انا کی وجہ سے ہی سوری کہنا پریکٹس نہیں ہوتا۔

تھینک یو، سوری اور سلام کرنے کی عادات ڈالنے کے لیے گھر سے ہی آداب کی ٹریننگ سے شروع کرنا پڑے گا۔ تاکہ ہر گھر میں والدین اور بچے اس عادت کو اپنائیں۔ اگر ہر گھر اس عادت کو اپنا لے تو ہمارے معاشرے کے بہت سے دکھ کم ہو جائیں گے۔ناانصافیاں کم ہو جائیں گی۔ زیادتیوں میں کمی آئے گی۔اور تہذیب یافتہ بھی لگیں۔

ایک اخبار میں صحافی نے لکھا تھا کہ یورپ میں ایک ماہ کے دوران تھینک یو اور سوری کہتے کہتے جبڑے تھک گئے۔ جب لاہور ائرپورٹ پر اترا اور ایک آدمی کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر سوری نہ کہا تو اس آدمی نے مڑ کر فوراً کہا۔اندھے ہو۔ دیکھ نہیں سکتے۔ یہی ہمارا کلچر ہے۔

ہمیں اپنے ہر غلط مائنڈ سیٹ سے نجات پانے کی ضرورت ہے۔شکریہ ادا نہ کرنے کی بھی قیامت کے دن جواب دہی ہو گی۔ کسی کو تکلیف پہنچا کر سوری یا معاف کیجئے نہ کہنے پر بھی آخرت میں پوچھ ہو گی۔ اور تکلیف کا بدلہ دینا پڑے گا۔تو کیا اچھا نہیں ہو گا کہ یہاں ہی سوری کہہ کر معاف کرا لیا جائے۔

ہماری عادت بن گئی ہے کہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ اس کے بدلے کتنا ثواب ملے گا تو وہ کام نہیں کریں گے۔ اس لیے میں چند احادیث بتا کر قائل کرنے کی

کوشش کرتا ہوں کہ شکریہ اور سوری کہنا بھی صدقہ ہے اور صدقے کا بہت ثواب ہوتا ہے اس کا تو سب کو پتہ ہے۔ تو پھر ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ شکریہ اور معاف کیجئے کی عادت ڈال لیں

حدیث: ''مکہ کے مہاجرین صحابہ کرام، مدینہ کے صحابی کی نسبت غریب تھے۔ انہوں نے ایک دن رسول کریم ﷺ سے پوچھا کہ انصار تو مال کے صدقہ دینے سے نیکیوں میں بہت آگے چلے جائیں گے اور ہم پیچھے رہ جائیں گے (کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ صدقہ صرف روپے پیسے سے دیا جاسکتا ہے جو ان کے پاس نہیں تھا)۔ اس پر رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ صحیح سوچ نہیں ہے بلکہ ہر نیکی اور مہربانی کا کام بھی اللہ کے یہاں صدقہ ہی گنا جاتا ہے۔ نیکی کا کام کہنے میں صدقہ ہے۔ اچھے بول بھی صدقہ ہے۔ نیک کام کہنا صدقہ ہے۔ برائی سے روکنا صدقہ ہے۔''

مسلم کی ایک حدیث اس آئیڈیا اور اصول کی مزید وضاحت کرتی ہے۔

> ''اچھے بول بھی صدقہ ہیں۔ کسی کے ساتھ مسکرا کر بات کرنا بھی صدقہ ہے۔ راستہ دکھا دینا بھی صدقہ ہے۔ بیوی بچوں پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔'' (مسلم)

مختصراً یہ کہ ہر مہربانی یا kindness کا کام جو دوسروں کی مدد کے جذبے کے تحت کیا جائے صدقہ ہے۔

اس لیے ان دو احادیث کی روشنی میں صدقہ کی دو قسمیں بنتی ہیں۔ ایک مالی صدقہ اور دوسرا اخلاقی صدقہ۔ اخلاقی صدقہ پر کوئی پیسے خرچ نہیں ہوتے مگر ان کا ثواب بھی مالی صدقے کے برابر ملے گا۔ شکریہ اور سوری کہنا بھی اخلاقی صدقہ ہے۔ معاشرتی زندگی خوشگوار ہونے کے ساتھ اضافی فائیدہ ثواب ملنے کا ہوگا۔

شکریہ ادا کرنے میں ہماری سب سے بڑی کوتاہی سب سے اہم رشتے یعنی بیویوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ ان کی خدمات کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعریف کرتے رہنے سے زندگی بہت خوشگوار بن جاتی ہے۔ مثلاً

سالن کی تعریف نہیں کرتے کہ کتنا اچھا بنا ہے یا کوئی سپیشل ڈش کتنی اچھی بنی ہے۔ اس کوتاہی کی دو وجہ ہیں؛ ایک یہ کہ ہم میں یہ غلط خیال رواج پا گیا ہے کہ اپنوں کا شکریہ ادا کرنا یا تعریف کرنا ضروری نہیں۔ شکریہ دوسروں کا ادا کرتے ہیں۔ اپنوں کے ساتھ ہم حقوق اور فرائض کی بات سمجھ لیتے ہیں کہ بیوی کا کھانا پکانا تو اس کی ڈیوٹی یا فرض ہے تو تعریف کیسی۔ یہ انتہائی نقصان دہ سوچ ہے اور ہمیں اس سے نکل آنا چاہئے۔ بیویوں کا ہماری کامیابیوں میں بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح ناکامی میں بھی۔ تو ایسے اہم رشتے کو نارمل اخلاقی آداب سے نظر انداز کر دینا سخت غلطی ہے جو ہم صدیوں سے کر رہے ہیں۔

اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ شکریہ، تھینک یو، مہربانی، کہنے کی عادت نہیں ڈالتے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نوٹ کرنے اور اس کو شکریہ کہنے کی عادت بھی نہیں پڑے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ خود بتا رہا ہے کہ میرا شکریہ ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اضافہ کرونگا مزید دونگا، جبکہ آپ دیکھیں گے کہ رسول کریم ﷺ نے چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی کو نوٹ کر کے دعاء کی صورت میں عادت ڈالنے کی ترغیب اور ہدایات دی ہیں۔ مثلاً کھانا کھانے کے بعد، پانی پینے کے بعد فوری اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ جن لوگوں کو کھانا نہیں ملتا ان کو دیکھیں کہ کیا حالت ہوتی ہے جبکہ آپ کو مل رہا ہے تو یہ آپ کا استحقاق نہیں ہے کہ آپ اللہ کے نزدیک کوئی سپیشل چیز نہیں ہیں کہ اللہ نے ضرور آپ کو دینا ہے۔ بلکہ یہ اس کی مہربانی اور رحم ہے جس کے لیے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح پاخانہ سے فارغ ہو کر اللہ کا شکریہ کے لیے دعا مانگنے کی ہدایت ہے۔ اس شکریہ کی دعا کو معمولی بات نہ سمجھیں۔ روزانہ پیٹ صاف ہو جانا کتنی بڑی نعمت ہے اس شکریہ کرنے کی ضرورت کا کسی کو تب احساس ہوگا کہ جب اس کو قبض ہو جائے اور ٹھیک نہ ہو۔ یہ تین مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں کہ ہم ان معمولی باتوں کا نوٹس ہی نہیں لیتے۔ ان کو taken for granted لیتے ہیں۔

شکرگزاری کی اہمیت بیان کر دی ہے۔ اب دیکھیں کہ شکرگزاری نہ کرنے کے

کیا نتائج نکلتے ہیں:

''اور جب تمہارے رب نے بتا دیا ہے کہ اگر میری شکر گزاری کرو گے تو تم کو زیادہ نعمتیں دوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو بیشک میرا عذاب بڑا سخت ہے۔'' (سورہ ابراہیم۔آیت ۷)

''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرنا ان کا شکریہ ہے اور اسے ترک کرنا ان کی ناشکری ہے۔ جماعت میں رحمت ہے اور پھوٹ میں عذاب ہے۔'' (کنز العمال-6485)

''یہ اس لیے کہ اللہ نے ایک قوم کو جو نعمت دی ہے اس کو اس وقت تک بدلنے والا نہیں جب تک وہ نفس کی بات کو نہ بدل دیں، بیشک اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔'' (سورہ انفال آیت ۵۳)

وارننگ :۔ جو قومیں اللہ تعالیٰ کی احسان منداور شکر گزار نہیں ہوتیں ان سے نعمتیں واپس لے لی جاتی ہیں اور سزا کے طور عذاب بھی ہوتا ہے۔

چونکہ جھوٹی انا کی وجہ سے ہم لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے تو رسول کریم ﷺ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کی ذاتی اور قومی لیول پر بھی عادت نہیں بنی، جبکہ قومی لیول پر بھی اللہ سبحانہ تعالیٰ کی اپنی آزادی، اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے ہندوؤں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے عوض اس کی نعمتوں کا اعتراف کر کے اس کی عیال یعنی عوام اور انسانوں کا خیال نہیں رکھا اور بجائے کردار سازی، اخلاق، حقوق العباد کی ادائیگی اور معاملات بہتر کرنے کے ہم آزادی کے صرف بارہ پندرہ سال بعد ہی دل میں فتور آ گیا اور مال کی محبت میں گرفتار ہو کر سوسائٹی میں بگاڑ شروع کر دیا جس کے نتیجے میں اللہ سحانہ تعالیٰ نے ہماری نیتوں میں تبدیلی سے آزادی کی آدھی نعمت ہم سے چھینتے ہوئے پہلا عذاب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں آیا۔ اس سے بھی ہم نے سبق نہیں سیکھا بلکہ سوسائٹی مزید بگڑنے

لگی ہے۔ یہ کتاب یاد دہانی کرانے کے لیے ہی ہے کہ ہمیں انفرادی اور قومی دونوں لیول پر توبہ کر کے اللہ سبحانہ تعالیٰ کا شکرگزار بننا شروع کر دینا چاہئے۔ اور قومی لیول پر ایک یوم تشکر منانا چاہیے جس دن ہم آزادی کا شکریہ پوری آبادی کے ساتھ شیئر کریں۔ انٹرنیٹ پر دیکھ لیں کہ کینیڈا اور امریکہ کے باشندے کیوں اور کیسے یوم تشکر یا تھینکس گونگ ڈے مناتے ہیں۔

سبق

اگر آپ چاہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ بھلائی کرنے پر دوسرے آپ شکریہ ادا کریں تو پھر آپ خود بھی دوسروں کا شکریہ ادا کرنا اور کہنا شروع کر دیں۔ اسی طرح تھوڑی تکلیف پہنچانے پر کسی سے معاف کیجیے، سوری کہہ کر یہاں ہی معاف کرا لیں، ورنہ آخرت میں تکلیف کے بدلے نیکیاں دینی پڑ جائیں گی۔

ہم میں سے ہر ایک روزانہ ایک وقت مقرر کر لینا چاہیے جس پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا روزانہ شکریہ ادا کیا جائے۔ اس سے انسان سیدھے راستے پر بھی رہتا ہے۔

قومی لیول پر آزادی کی نعمت کے لیے یوم تشکر منانے کا سوچنا چاہیے تا کہ اجتماعی سطح پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا جا سکے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت نہیں جائے گا۔ اس لیے اگر اپنی عاقبت کا خیال ہو تو پھر دوسروں کی پرواہ نہیں کیئے بغیر یک طرفہ شکریہ اور سوری کہنے اور سلام میں پہل کرنے کی بھی کہنے کی عادت بنا لیں اور پریکٹس کریں۔ ان تین عادت سے تکبر اور جھوٹی انا سے بھی نجات مل جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ثواب کے بھی مستحق ہو جائیں گے۔

☆......☆......☆

۵۳۔ ''صفائی نصف ایمان ہے'' (حدیث)

''صفائی پسندی کا بچپن سے مائینڈ سیٹ بنانا پڑتا ہے، تب عادت پڑتی ہے۔''

ہمارے ہر سوشل مسئلے کی وجہ صدیوں سے اجتماعی سوشل سینس پیدا نہ ہوسکنا ہے کیونکہ ہم مذہبی مخلوق بن گئے ہیں اور انسانی اور معاشرتی مخلوق نہیں بن سکے۔ جب تک ہم اس دنیا کی زندگی کی مخلوق بن کر دنیا کو سنوارنے کا نہیں سوچیں گے اور اس دنیا کو جنت بنانے کا نہیں سوچیں گے تو ،صفائی نصف ایمان ہے، پریکٹس نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **ربنا آتنا فی الدنیا حسنه و فی الآخرة حسنه** اگر آخرت کا حسنہ جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تو پھر دنیا کے حسنہ کا مطلب بھی دنیا کو جنت بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا مگر ہمارا مذہبی مائیند سیٹ دنیا کی فکر نہ کرنا سکھاتا ہے۔

اس لیے ہمارا نیشنل مائنڈ سیٹ یہ بن گیا ہے کہ صفائی صرف گھر کے اندر رکھنی ہمارا فرض ہے۔ گلی، بازار، پارک سب پبلک یا مشترکہ جگہوں پر صفائی حکومت یا دوسروں کا فرض ہے۔ اس لیے ان جگہوں پر دل بھر کر گند ڈال دینا ہمارا حق ہے۔ اسی رویہ کی وجہ سے ہماری تمام پبلک جگہوں پر صفائی بالکل نہیں ہوتی۔

دراصل عام صفائی رکھنا اور واش روم استعمال کرنا گھریلو سوشل آداب میں سے ہے اور ہم نے آداب سیکھنے اور سکھانے بند کر دئے ہیں جبکہ نبی کریم ﷺ آداب سکھاتے تھے۔ یہودیوں کے نزدیک نبی تو مذہب کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اس کا دنیاوی کام سکھانے سے کیا تعلق۔ مگر وہ بھول میں گرفتار تھے کہ نبی تو دنیا کی زندگی ہی تو سنوارنے آتا ہے جس کے اعمال پر جنت ملے گی۔ ہم سب بھی یہودیوں کی طرح بھول

میں گرفتار ہیں۔ کہ دنیاوی آداب سیکھنا اور سکھانا سنت نہیں ہے اور نہ ہی مذہب کا حصہ ہے۔اسی سلسلے میں نبی کریم ﷺ کی دوسری ہدایت ہے، کہ اللہ جمیل و یحب الجمال اللہ سبحانہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ ہمیں گندگی بری نہیں لگتی تو پھر صفائی کیسے اچھی لگے گی کہ خوبصورتی اور صفائی لازم وملزوم ہیں۔

اسی لیے حکومتی دفتروں ، ہوٹلوں۔ پٹرول سٹیشنوں، ایئر پورٹوں، ہسپتالوں وغیرہ پبلک جگہوں میں عمومی طور صفائی نہیں ہوتی اور انکے باتھ روم تو انتہائی گندے ہوتے ہیں۔فلش ٹوٹے یا سیٹ کور گندے،لوگ ان پر پاؤں رکھ کران پر بیٹھ کر یا پانی سے آلودہ کر دیتے ہیں کہ دوسرا استعمال نہیں کرسکتا۔اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ ہمارے یہاں اتنی مختلف سوچوں،سوشل لیول، مالی لیول،علمی لیول اور کلچر کے لوگ ہیں کہ صرف واش روم کے استعمال کی سمجھ میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔اس لیے جب ہر قسم کے لوگ مغربی طرز کی یہ سہولت استعمال کریں گے تو وہ اپنے طرز سے ہی اور اپنی سوچ اور عادت کے مطابق ہی استعمال کریں گے۔ یورپین کموڈ بارے تب بھی اور اب بھی ان کا یہ نظریہ ہے کہ اس کے استعمال سے طہارت نہیں رہ سکتی جونماز کے لیے ضروری ہے۔اس لیے اس پر پاؤں کے بل بیٹھنے سے طہارت ہوسکتی ہے۔حالانکہ یہ بالکل غلط سوچ ہے۔اس کے صحیح استعمال سے زیادہ طہارت اور پاکیزگی رہ سکتی ہے

گھروں میں بھی جب تک بچوں کو یہ آداب سکھا کر عادت نہ ڈلوائی جائے کہ واش روم استعمال کے بعد اسے صاف کر کے دوسروں کے لیے صاف چھوڑ کر جاؤ،تو وہ استعمال کے بعد گندہ چھوڑ کر ہی چلے جائیں گے۔ کیونکہ کوئی بھی صفائی کا کام نہیں کرنا چاہتا ہر کوئی نوکر کی یا دوسروں کی ذمہ داری سمجھتا ہے یا دوسروں کا خیال ذہن میں ہوتا ہی نہیں۔صفائی کرنا ایک کمی کا کام سمجھا جاتا ہے۔ٹی وی پر سب شہروں کی تصویریں دیکھ لیں ایک ہی حال ہے۔یہ ایک نیشنل لیول کا مائینڈ سیٹ ہے۔ جب کوئی چیز کسی کی ذمہ داری نہیں ہوتی تو پھر کوئی بھی وہ کام نہیں کرتا۔ جب تک سب افراد صفائی رکھنا اپنی ذاتی ذمہ داری نہیں سمجھیں گے تو صفائی نہیں رہ سکتی۔نہ ہمارے شہر خوبصورت بن سکتے ہیں۔

پیشاب پاخانہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جو کسی کو کسی وقت پیش آ سکتی ہے مگر ہم نے اس ضرورت کو بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا کہ یہ اجتماعی ضرورت ہے اور اس کے لیے انتظام کرنا چاہئے۔ جبکہ مغربی ممالک نے صدیوں سے اس کا انتظام کیا ہوا ہے۔ ہمارے بازاروں میں کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔ سب دکاندار پیشاب کی حاجت کو خریدار کا انفرادی اور ذاتی مسئلہ سمجھتے ہیں جس کا حل اسے خود تلاش کرنا چاہیے جبکہ یہ مارکیٹ کے مالک اور نقشہ منظور کرنے والے محکموں کی بنیادی ذمہ داری ہے اور دکانداروں کی ذمہ داری ہے کہ بلڈنگ کے مالک پر اپنے خریداروں کے لیے سہولت فراہم کرنے پر زور ڈالیں۔

اگر ہم سب **''صفائی نصف ایمان ہے''**، پر دل سے یقین رکھتے ہوں اور عمل بھی کریں تو ہمارے گلی کوچے، شہر اور دیہات خوبصورت جگہیں بن جائیں گے۔ اس کے لیے ہر جگہ ہر ایک کو نئے آئیڈیاز سوچنے کی ضرورت ہے۔ مسائل آئیں تو سوشل لیول پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے آداب پر ایک باب صرف تعارف کے لیے شامل کر دیا۔ اس پر مزید کام آپ خود کر لیں۔

سبق

جو اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو، کے اصول کے مطابق،۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ جب باتھ روم جائیں تو صاف ملے تو پھر آپ استعمال کے بعد اسے دوسروں کے لیے صاف کر کے نکلیں۔ اپنا گند صاف کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ دوسروں کی نہیں اور نہ ہی یہ باتھ روم کے مالک کی ہے۔ نہ ہی اجتماعی باتھ روم میں کسی نوکر کی۔

ہم میں سے ہر پاکستانی اگر یہ سمجھ لے اور اصول بنا لے کہ ذاتی لیول پر ہر ایک کی اپنا گند صاف کرنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر جگہ گندی ہو جائے یا چیزیں نیچے گر جائیں تو خود ہی اٹھائے اور جگہ صاف کرے۔ صرف اس ایک اصول سے ہی ہر جگہ

صفائی نظر آنے لگے گی

گھر کے باہر اپنے حصے کی گلی کو صاف رکھنا ہر گھر کا کام ہے۔ باہر ہوں تو گند سڑک پر نہ ڈالیں، کار میں رکھ لیں گھر کچرے کے ڈبے میں ڈالیں۔ ذہن میں صفائی کا شوق ہوتو آئیڈیا آپ کو خود ہی آئیں گے۔

گھر کے باہر درخت، پھول بوٹوں کی کاٹ چھانٹ بھی کرتے رہیں۔تا کہ خوبصورت لگیں۔

ہندو دکاندار خود دکان کے باہر صفائی کرتے ہیں، مسلمان دکاندار نہیں کرتے۔

اس حدیث پر عمل بہت آسان ہے۔ ذاتی معاملہ ہے صرف عادت ڈالنے کی بات ہے۔

اگر ہم میں سے ہر ایک کو اپنے آدھے ایمان کی واقعی فکر ہے تو اسے چاہیے کہ صفائی پسند بنے اور کسی جھوٹی انا کو رکاوٹ نہ بننے دے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس حدیث میں حکمت دیکھیں کہ اس پر عمل کرنے سے تکبر ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر معاشرے میں صفائی کرنے والے کو سوشل لیول پر سب سے نیچے گنا جاتا ہے جیسے ہندوؤں میں شودر ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں صفائی والے چوڑے ہوتے تھے۔

گھر کے باہر گلی کی صفائی انا کا مسئلہ بن سکتی ہے کہ دوسرے کیا کہیں گے۔ ایسی بات ہو، تو رات کو صفائی کرلیں یا مثال بن کر لیڈر بنیں دوسرے آپ کی نقل کرنے لگیں گے۔

☆......☆......☆

۵۴۔ردعمل سے بچنا بہت بڑی سنت ہے۔

”Reactive Behaviour سے بچیے“

ہم سب جانتے ہیں اور پہلے بیان بھی ہو چکا ہے کہ انسانی زندگی دوطرفہ تعلقات پر مبنی ہے۔عمل اور ردعمل کا نام ہے۔ایک انسان کی اچھائی کے بدلے اچھائی یا برائی بھی مل سکتی ہے اسی طرح برائی کے بدلے برائی بھی مل سکتی ہے اور اچھائی بھی۔یعنی انسان کے عمل کا ردعمل کسی بھی صورت میں ہوسکتا ہے۔

انسان بنیادی طور پر اپنے ہر اچھے عمل کے جواب میں خداوند تعالیٰ سے یا لوگوں سے ردعمل کے طور پر فوراً صلہ وصول کرنا چاہتا ہے۔ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں کم ازکم نیکی کے جواب میں اسے ہرگز نیکی نہیں مل سکے گی۔ بلکہ اکثر نیکی کے بدلے میں ردعمل کے طور پر مدمقابل کی بدی ہی برداشت کرنی پڑے گی۔اسی لیے محاورہ ہے کہ نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال۔یعنی بھول جا کہ نیکی کی ہے اور اس کے بدلے میں نیکی کی توقع نہ کر۔حضرت علیؓ کا بھی قول ہے کہ جس سے نیکی کی ہے اس کے شر سے بچو۔

اس کی بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم میں کسی کی نیکی پر شکریہ ادا کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ ردعمل یا Reaction بنیادی طور پر انسان کی کمزوری کی دلیل ہے۔عام انسانی زندگی میں بھی برداشت کرنے کی عادت نہ ہونے، کردار کی مضبوطی نہ ہونے سے ہی ردعمل کا جواز بنتی ہے۔اگر انسان کسی کے برے عمل پر اپنے ردعمل کا فوراً اظہار کرتا ہے تو یہ خود کو کمزور ثابت کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔جیسے کہتے ہیں کہ دوائی سے ری ایکشن ہو گیا ہے اور تکلیف بڑھ گئی ہے۔ انسانی ری ایکشن یا ردعمل سے بھی ہمیشہ جھگڑا اور تعلقات میں خرابی ہی ہوتی ہے۔دوائی سے ری ایکشن نہ ہو تو بیماری دور ہو

جاتی ہے۔ کسی کی تلخ بات پر ردعمل نہ دکھایا جائے تو جھگڑا نہیں ہوگا اور تعلقات خراب کی طرح بیماری دور۔

ردعمل کا اظہار نہ کرنا خدائی صفت ہے۔ یعنی خداوند تعالیٰ کسی بندے کے گناہ پر فوری ردعمل کا اظہار نہیں فرماتا جیسے ہم انسان کرتے ہیں کہ کسی نے غلطی تو فوراً سزا دے دی۔ بلکہ اس نے یوم حساب بنا دیا ہے تب تک ڈھیل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرح، ردعمل نہ کرنے سے انسان اندر سے مضبوط ہو جاتا ہے ور وہ خدا کے قریب تر ہو سکے گا۔ اور یہی اسوۂ حسنہ کی بھی سب سے بڑی سنت بھی ہے۔ اگر انسان بھی اپنے برے حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے ردعمل کے طور پر بگڑ نہ جائے، ان کا اثر قبول نہ کرے اور کمزور نہ پڑے، تو ظاہر ہے ان صفات کے ردعمل کے طور پر وہ بھی کھرا اور مضبوط بنتا جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر انسان کو ردعمل کا اظہار کرنا پڑتا ہے لیکن کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ردعمل بھی مثبت ہو منفی نہ ہو۔ انجکشن کی طرح، معاشرے کی خرابیاں دور کرنے کیلئے اگر مثبت عمل اور ردعمل کا اظہار کیا جائے تو اس کا ردعمل بھی مثبت تبدیلیاں اور مثبت نتائج سامنے لائے گا جبکہ منفی عمل اور منفی ردعمل دونوں معاشرے کیلئے شدید طور پر نقصان رساں ثابت ہوں گے جو آج کل ہمارے معاشرے میں تکبر کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

ہمارے حضور پر نور ﷺ نے اپنی ذات مبارک پر جبر و صبر کے حوالے سے مثال قائم کر دی تھی کہ ان کے سامنے مقصد اتنا واضح اور اعلیٰ ترین تھا کہ کسی کے کسی بھی قسم کے بُرے عمل کے بدلے برداشت اور بھلائی کا اظہار اور دعوت کی نصیحت اکسیر و تریاق معاشرے کی رگوں میں اتارتے رہے کہ ان کی تنہا ذات آخر میں فاتح قرار پائی تھی۔ اگر وہ ردعمل کرنے میں ہی اپنا تمام وقت صرف کرتے تو محاذ آرائی شروع ہو جاتی۔

ہم نے بھی اگر معاشرے کی اصلاح کرنی ہے تو سب سے پہلے ردعمل سے بچنا اور برداشت کرنا سیکھنا پڑے گا۔ مگر ہمارے سیاسی اور مذہبی لیڈران، اشرافیہ اور عوام

سب ہی سوائے فوری ردعمل کے کسی اور بات کو جانتے نہیں، برداشت کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اس لیے ہم کمزورترین معاشرے کی نشانی ظاہر کررہے ہیں۔اس کی وجہ میرے خیال میں جہالت، تکبر اور منفی سوچیں اور کسی بلند مقصد کا نہ ہونا ہے۔

سبق

ہمیں بھی اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کی برائی کے بدلے پہلے تو چپ رہیں اور ردعمل کے طور غصہ نہ ہوں، بلکہ برداشت کریں اور سوچ کر جواب دیں۔ اللہ تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ برائی نکے بدلے بھلائی کریں تو تعلقات میں بہتری آ جائے۔

اللہ تعالیٰ بھی بندوں کو ڈھیل دیتا ہے کہ شاید وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائیں اور وہ انہیں معاف کر سکے۔ہمیں بھی اللہ کی سنت پر جانا چاہیئے۔

ردعمل سے اس لیے بھی بچیں کہ اس طرح آپ اپنی شخصیت بدل کر اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے۔

اس سنت پر عمل بہت مشکل کام ہے۔ عادت بدلتے بہت وقت لگے گا مگر استقامت سے جلد عادت اپنائی جاسکتی ہے۔

☆......☆......☆

۵۵۔اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنا بھی سنت ہے۔

واقعات سے سبق سیکھنا یا عبرت پذیری بھی سنت ہے

حدیث: ''مومن ایک ہی سوراخ سے دوبارہ ڈسا نہیں جاتا۔'' (بخاری۔مسلم)

اس حدیث کا بیک گراؤنڈ یہ ہے کہ غزوہ بدر میں ایک شاعر ابوعزہ(Abu Azzah) قیدی بنا تو اس وعدے پر کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑے گا، اس کو نبی کریم ﷺ نے معاف کر دیا۔غزوہ احد میں پھر قیدی بن کر آیا تو پھر وعدہ کیا جس پر آپ نے یہ مشہور الفاظ کہے تھے۔

یہ حدیث ہمیں واضح طور پر بتا رہی ہے کہ ہمیں ہر ایک غلطی تجربے، واقعے سے کچھ سبق سیکھنا چاہیے تا کہ وہی غلطی دوبارہ نہ ہو۔میرے خیال میں اس حدیث کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دوسروں انسانوں کے ساتھ تجربات سے، جن پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا، تو یہ اللہ کی طرف سے سبق سکھا کر انسان کو بہتر بنانے کا طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ''اپنی غلطی پر اصرار نہ کرو، بلکہ غلطی سے سیکھو اور بہتر انسان بن جاؤ۔'' (سورہ آل عمران۔3-135) ''اور وہ لوگ جو کوئی فحش کام کر لیں یا اپنی جانوں پر یا نفس پر ظلم کر بیٹھیں، تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، کیونکہ اللہ کے علاوہ اور کون گناہ معاف کر سکتا ہے۔اور جان بوجھ کر اس پر اصرار بھی نہیں کرتے۔اور اس کا انہیں خیال بھی ہے۔''

نبی کریم ﷺ کی ہدایات زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ حدیث ایک جنرل اصول بیان کر رہی ہے کہ مومن کو ہر وقت چوکنا رہنا چاہئے۔تا کہ دوسرے

آپ کو نقصان نہ پہنچائیں۔

یہ بھی سیکھنا ضروری ہے کہ تعلقات دو طرفہ ہونے چاہئیں اور نظر رکھیں کہ دوسرے آپ کی دوستی، چاہت کا جواب دیتے ہیں یا کہ نہیں۔ اگر نہیں دے رہے تو ان پر خصوصی عنایت کی ضرورت نہیں ہوتی، اگر ان کے ساتھ تعلقات رکھنے کسی وجہ سے مجبوری یا ضروری ہوں تو صرف ورکنگ تعلق رکھیں۔

اس سے ایک سبق اور بھی ملتا ہے کہ بار بار رحمدلی، یا معاف کرنے سے دوسرے آپ کے بارے میں غلط رائے قائم کر سکتے ہیں کہ یا وقوف ہے یا کمزور ہے اس لیے ہر دفعہ معاف کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنے فائیدے لیے استعمال کرلو۔ ایسے سوچنے والے شخص کو سبق سکھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے افعال سے اس کے دوست، ساتھی، دشمن ہونے کی پہچان کرنا اور یاد رکھنا ضروری ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ بار بار ہمیں یاد دلاتا ہے شیطان انسان کا کھلا دشن ہے۔ یا ہندوستان پاکستان کا کبھی دوست نہیں ہو سکتا،

انسان کے ساتھ تین قسم کے حالات پیش آ سکتے ہیں۔ ایک وہ خود جہالت کی وجہ سے یا غلط فیصلے کی وجہ سے نقصان اٹھائے یا تکلیف میں پڑے۔ یا پھر دوسرے لوگ اس کے ساتھ برا سلوک کریں یا تکلیف اور نقصان پہنچائیں۔ تیسرے اللہ تعالیٰ اس کو امتحان میں ڈالیں۔ (سورہ بقرہ۔۱۵۵) ''اور یقیناً ہم تمہیں ڈر خوف، بھوک، دولت کے نقصان، جان اور کھیتی کے نقصان سے آزمائیں گے۔ مگر ان صابرین کو خوشخبری دیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہی ہیں اور اسی کے پاس واپس جائیں گے۔''

امتحان دراصل خدائی ڈیزائین کردہ سکیم ہے جس سے انسان کو کچھ سکھانے، عادت اور سوچ بدلنے اور درجات بلند کرنے یا کسی کام کے لیے تیار کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر تجربے سے سیکھنے اور سوچیں اور عادات بدلنے کی ضرورت ہونی چاہیے۔ دوسرے ہمارے ساتھ کیا کرتے ہیں وہ کچھ سکھانے کے لیے ہی بھیجے جاتے ہیں اور سکھا کر ہماری زندگی سے نکل جاتے ہیں۔ اگر انسان نہ سیکھے تو پھر وہ اسی ناخوشگوار

تجربے سے گزرے گا جب تک تبدیل نہ ہو۔

یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ غار ثور میں آپ کی عبادت سوچ بچار اور دوسروں سے عبرت پذیری تھی۔ اس لیے ہمیں ہر واقعہ جو دوسروں کے ساتھ پیش آئے، چاہے دنیا میں کہیں بھی ہو، اس سے سبق سیکھنے اور احتیاطی تدابیر لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشاہدہ کرنا بھی اسی میں شامل ہے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ انہی سے ہم پھر سبق سیکھ سکتے ہیں۔

یہ ہدایت نبوی ہر قسم کے معاملات کے بارے ہیں، چاہے دنیاوی ہوں، یا دینی، یا ذاتی۔ علمی ہوں، مالی ہوں۔ دینی معاملات میں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

سبق

اپنی غلطیوں، مشاہدات، دوسروں کی کہانیوں سے سیکھنے کے لیے ہر رات کھانے پر اپنے دن کے تجربات شیئر کریں، بچوں سے بھی پوچھیں کہ انہوں نے کیا دیکھا اور اس سے کیا سیکھا۔ یہ گفتگو اور بحث بچوں میں نہ صرف مشاہد تیز کرے گی بلکہ سوچنے اور فیصلے کرنے کی عادت ڈالے گی۔ یہ ان کی تربیت کرے گی کہ وہ صحیح اور غلط میں پہچان کر سکیں۔ اگر نیت اس حدیث پر عمل کی ہو تو ثواب بھی ہو گا۔

مسلمان لیڈر شپ کے لیے پیدا کیا گیا ہے تا کہ اللہ کا پیغام دوسروں تک پہنچائے۔ اس لیے بچوں کو سوچ بچار کی عادت ڈالیں گے تو پھر ہی وہ دوسروں کی رہنمائی کے قابل بنیں گے

اس سنت پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔ اور فائدہ مند بھی۔ مثلاً اگر کسی جگہ چوری کی خبر پڑھیں یا ٹی وی پر دیکھیں، تو چوری کے اس جیسے طریقے سے بچنے کی تدابیر اختیار کریں۔ جیسے مغربی مما لک میں چوروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کسی گھر ٹیلیفون کرتے اور بچہ اٹھائے تو کہتے کہ ماں باپ میں سے کسی بات کرانے کے لیے کہتے اور اگر بچہ کہتا کہ وہ گھر نہیں تو چوری کرنے پہنچ جاتے۔ اس پر اب والدین بچوں کو سکھاتے

ہیں کہ کسی کو یہ نہیں کہنا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ کسی کو اپنا نام بھی نہیں بتانا۔

تجربات کو لکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ مغربی ممالک میں سیاحت کے بعد سفرنامے لکھنا کا رواج ہے۔ جس سے دوسرے سیکھ کر بُرے تجربات اور نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ مثلاً میں نے امریکہ سے آتے لبیا میں ٹھہرنا تھا تو مجھے ایک امریکن دوست نے لبیا کی ایک گائیڈ بک دی جس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔

☆......☆......☆

۵۶۔ ہمہ وقت ہر ایک کو معاف کرتے رہنا ہی نبی کریم ﷺ کی سب سے بڑی سنت ہے۔

میرے نزدیک یہ سنت سب سے اہم ہے۔ اسی سے آپ رحمۃ للعالمینؐ بنے تھے۔ کیونکہ معاشرے میں توازن، امن، سکون کے لیے ایک دوسرے کو معاف کرنا بہت اہم رویہ ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اپنوں اور پرایوں کو معاف کرتے رہنے ہی سے دوسروں کے لیے پھر سے رحمت بننا ہے۔ مگر اپنے کو بھی معاف کرنا اور اپنے لیے بھی رحمت بننے کی فلاسفی مجھے پہلی دفعہ سائیکالوجی کی ماہر ڈاکٹر، جوزف مرفی کی ایک کتاب power of subconscious mind سے ملی جو آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں اس لیے اس پر میں نے لمبا مضمون آپؐ کے اس فرمان کہ **الحکمہ متاع المومن فحبث و جدھا فھو احق بھا** "علم و حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے اسے جس جگہ بھی پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے" پر عمل کرتے ہوئے شیئر کر رہا ہوں کیونکہ یہ سائینسی تحقیق اور ہمارے اسلامی اصول منطبق ہوتے ہیں جس سے سائینس اور اسلام کو یک جا کرنے سے بات بہتر سمجھ میں آ جاتی ہے۔

یہ مضمون دو خاص باتیں سکھاتا ہے۔ پہلی یہ کہ دوسروں کو معاف کرنے سے آپ دوسروں کے ساتھ مہربانی نہیں کر رہے بلکہ اس سے صرف آپ کا اپنا ہی فائدہ ہو رہا ہوتا ہے کہ ذہن، پرسکون اور صاف رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ سکھاتا ہے کہ جب ہم سے کوئی غلطی، زیادتی، گناہ یا جرم ہو جائے، تو جرم کی سزا کے بعد یا گناہ سے توبہ کے بعد بھی اپنے آپ کو معاف کرنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے جو کہ عام لوگ نہیں کرتے۔ اور بار بار پرانے گناہوں کو یاد کر کے استغفار کرتے رہتے ہیں جو کہ اسلامی

فلاسفی کے خلاف ہے۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ توبہ کے بعد اپنے آپ کو یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی معاف کر دیا ہے۔ جس سے اپنے ذہن پر سے بھی احساس گناہ مٹ جائے اور ذہن صاف ہو جائے تا کہ زندگی سکون سے گزارے۔ ذہنی حالت اس حدیث کے عین مطابق ہے۔

حدیث: ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اس کا گناہ ہی نہیں تھا۔'' (بیہقی)

میں نے اپنے آپ کو معاف کرنے کا نظریہ کبھی نہیں سنا تھا، بلکہ سن رکھا تھا کہ ساری عمر گناہوں سے استغفار کرتے رہنا چاہئے۔ جبکہ میرے خیال میں اپنے آپ کو معاف کرنے کا نظریہ نفسیاتی اور اسلامی لحاظ سے بہت اہم اصول ہے جس کی تفصیل جاننا ضروری ہے۔ اس کی مختصر فلاسفی یہ ہے کہ نفسیاتی مسائل غلط سوچ سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا حل صرف سچائی بتا دینا ہوتا ہے۔ اسی لیے سچ بولنے والوں، سچ کو تسلیم کرنے والوں کو نفسیاتی مسائل نہیں ہوتے۔ اس سے ہم سیکھ سکتے ہیں کہ سچ بولنا کردار سازی کی بنیاد کیوں ہے اور معاشروں کی بنیاد سچ پر کیوں رکھنے کی ضرورت ہے۔ سچ کے بغیر دنیاوی ترقی ممکن بھی نہیں ہو سکتی۔

اس لیے میں پہلے ذہن کی ورکنگ اور سائکالوجی کی تھیوری کی چند بنیادی سچائیاں، حقیقتیں یا اصول بیان کروں گا جو کہ قرآنی اصولوں کے ہی مطابق بھی ہیں۔ ذہن کے دو حصوں یعنی شعوری ذہن اور تحت الشعور کے ذہن کی ورکنگ سمجھنے ضرورت ہے۔ ہمارے ذہن کے دو حصے ہوتے ہیں ایک شعوری حصہ: شعور سوچنے، دلائل، حساب، logic, calculations کچھ کرنے کا کام کرتا ہے جب آپ جاگ کر یہ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کمپیوٹر کے software کی طرح ہوتا ہے۔ یہی حصہ فیصلے کرتا ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا غلط۔ ور پھر اپنے فیصلے تحت الشعور میں ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔ تحت الشعور فیصلے نہیں کرتا بلکہ اسے غلط بات بھی سچ کر بتائی جائے تو اس کو ہی سچ ریکارد کر لیتا ہے اور آئندہ اسی سے موازنہ کر کے سچ یا جھوٹ کا فیصلہ کرتا ہے۔

جب کہ دوسرا تحت الشعوری حصہ ریڑھ کی ہڈی کے اوپر Medula Oblongata ہوتا ہے جو تحت الشعور کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ جسم کے خود کار حصے کے سوچ بورڈ switch board کا کام دیتا ہے۔ یہ حصہ ذہن کے شعوری حصے کو روزانہ کے افعال سوچ سمجھ کر کرنے سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور اسے دوسرے کام سوچنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اور دن کے روزانہ کے کام شعوری حصے کو بغیر سوچ کے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور یہ کام کاج صرف اسی صورت شعوری سوچ کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ ماضی کی تمام سوچوں پر مبنی خیالات اور فیصلے، جو کچھ پڑھا ہوتا ہے سیکھا ہوتا ہے، جس میں اعتقاد، ماضی کے تجربات، یادیں، تصویریں یا شکلیں جو دیکھی ہیں، زندگی کے واقعات جن سے گزرے ہیں، تمام پیشے یا سکلز جو سیکھی ہیں۔ سب اس میں ریکارڈ رہتی ہیں ہوتی ہیں۔ یہ کمپیوٹر کی hard disk کی طرح ہوتا ہے۔ کہ کمپیوٹر کا پروگرام خراب یا کرپٹ بھی ہو جائے تو ہارڈ ڈسک میں آپ کا سارا کام محفوظ ہوتا ہے اس سے نکال سکتے ہیں۔

تحت الشعور کے ذریعے ہی جسم خود کار سسٹم کے تحت کام کرتا ہے۔ اور روزانہ کے کام عادات کے تحت کرتا ہے یہ جسم کے تمام اعمال جیسے کھانا، سانس لینا، ہاضمہ دل کی حرکت وغیرہ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اگر آپ سانس کچھ دیر کے لیے کنٹرول کرنا چاہیں گے تو یہ شعوری حصہ کرے گا مگر جونہی آپ شعوری کنٹرول کرنا بند کریں گے تو دوسرا حصہ ٹیک اوور کر لے گا۔

ان دونوں حصوں کا کام سمجھنے کے لیے یہ مثال اچھی ہے جب آپ شروع میں ڈرائیونگ سیکھتے ہیں تو آپ صرف شعوری حصے کو استعمال کر کے ڈرائیونگ پر توجہ دے سکتے ہیں اور ساتھ ہی موبائل فون استعمال نہیں کر سکتے یا ادھر ادھر بھی نہیں دیکھ سکتے صرف سیدھے دیکھتے ہیں۔ مگر جب بار بار کی پریکٹس سے ایکسپرٹ ہو جاتے ہیں تو یہ کام تحت الشعور میں ریکارڈ ہو جاتا ہے اور پھر تحت الشعور ہوائی جہاز کے آٹو پائلٹ کی طرح بن جاتا ہے، ڈرائیونگ کا کام کو دسنبھال لیتا ہے اور شعوری ذہن کو آزاد کر دیتا ہے اور ڈرائیونگ کے ساتھ آپ باتیں بھی کر سکتے ہیں اور فون بھی استعمال کر سکتے ہیں ادھر ادھر

بھی دیکھ سکتے ہیں۔یعنی ڈرائیونگ کی عادت اب تحت الشعور نے ٹیک اوور کر لی ہے اور شعوری حصہ نئے کام کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔

جب ہم زخمی ہو جاتے ہیں تو تحت الشعور کا ذہن زخمی ہوتے ہی ٹرگر ہو کر خود بخود ہی جسم کا خون روکنے کا سسٹم شروع کر دیتا ہے۔کھال بھی نیچے سے نئ بننی شروع ہو جاتی ہے۔ہم کو سوچنا بھی نہیں پڑتا۔ڈاکٹر جب پٹی کرتا ہے تو صرف انفیکشن روکنے کے لیے کرتا ہے، باقی کام ذہن ہی کرتا ہے۔جب کسی کو دیکھ کر آپ کے جذبات ایک بھڑک اٹھتے ہیں یا غصہ ہو جاتے ہیں تو یہ آٹو میٹک کام تحت الشعور ہی ٹرگر ایکشن کے طور پر کرتا ہے کیونکہ اس میں موجود ریکارڈ بتا تا ہے کہ اگر شعوری ذہن میں حواس سے یہ چیز، موقع، حالا فیڈ ہو تو ہمیشہ اس کا ردعمل یہ ہونا چاہئے۔یا لیکچر دیتے ڈر یا گھبراہٹ بھی ذہن کے اسی حصے سے ٹرگر ہوتی ہے۔

دونوں ذہنوں کی ٹیم کو استعمال کر کے ہی بہترین کام لیا جا سکتا ہے۔شعور کچھ کام کر کے اسے تحت کے حوالے کر دے جبکہ تحت فیڈ بیک کے طور پر جذبات کی انفارمیشن شعور کو بھیجتا رہے۔جذبات دراصل پیغامات کے علاوہ کچھ نہیں جو کہ وہ شعور کو انفارم کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔دونوں کے بارے جان کر آپ اپنی مہارت یا سکلز بہتر بنا سکیں گے اور آپ کا جذبات پر کنٹرول بھی ہو جائے گا۔جو کہ ہر لیڈر اور کامیاب آدمی کے لیے ضروری ہے۔یعنی مائینڈ سیٹ mindset چینج کرنے کی ضرورت ہے۔

تحت الشعور ہماری زندگیوں کے نوے فیصد کو کنٹرول کرتا ہے

ڈاکٹر بروس لپٹن، سٹینفورڈ میڈیکل سنٹر کے مطابق تحت الشعور ہماری زندگیوں کے نوے فیصد کو کنٹرول کرتا ہے۔اور اس کے اندر کے خیالات ہی ہر بات کنٹرول کرتے ہیں کہ آپ کتنے خوش ہوں گے، کتنے کامیاب یا تعلقات کتنے اچھے ہونگے۔اگر آپ نے تحت الشعور کی پروگرامنگ غلط کی ہے اور اس میں کامیابی کی امید کی جگہ ناکامی کا ڈر ڈالا ہے تو آپ چاہیں کتنا علم حاصل کر لیں، کتنی محنت کر لیں اس سے

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔اس لیے تحت لشعور کے پروگرام کو تبدیل کر کے آپ زندگی میں تبدیلی لانے اور کامیابی کی طرف پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ بہت آسان بھی۔

اسی بات کو مذہب کے لحاظ سے دیکھیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں۔ اگر وہ اچھی امید لگائے گا تو اسے وہی ملے گا۔اگر برا سوچے گا تو وہی ملے گا۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو سختی چاہتا ہے اس پر سختی ہے۔ اللہ کلام پاک میں فرماتا ہے کہ میں تمہارے لیے آسانی چاہتا ہوں سختی نہیں۔ جب وہ آسانی دے تو وہ استعمال نہ کرنا اس کی حکم عدولی ہے اور اس کی ناراضگی کا باعث ہوگا، یہ خدا کی بندوں کے لیے محبت اور رحمت کی بے عزتی اور ناقدری ہوگی۔اس لیے خدا کو ہمیشہ نرمی سے سمجھو اور اس کے سامنے نرم رہو۔ایک بدو نے اللہ سے پوچھا کہ قیامت کے دن حساب کون لے گا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ۔ بدو خوشی سے جھوم اُٹھا اور بولا کہ پھر تو ہم بخشے گئے۔آپ نے پوچھا کہ وہ کیسے تو کہنے لگا کہ اللہ کریم ہے اور کریم جب قابو پا لیتا ہے تو معاف کر دیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور جب تک وہ نظر آتا رہا تو آپ فرماتے رہے کہ اس نے اللہ کو پہچان لیا۔

ہر آدمی کی شخصیت اس کے خیالوں، سوچ کی پیداوار، آئینہ دار اور جسمانی شکل ہوتی ہے اس لیے کہتے ہیں کہ اپنے خیالات پر نظر رکھیں کہ وہ الفاظ بن جاتے ہیں۔ الفاظ پر نظر رکھیں وہ افعال بن جاتے ہیں۔افعال پر نظر رکھیں کہ وہ عادات بن جاتی ہیں۔ عادات پر نظر رکھیں کہ وہ کردار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔اور کردار پر نظر رکھیں کہ وہ قسمت بن جاتی ہے۔

تحت الشعور کی پرانی پروگرامنگ کو ختم کر کے نئی پروگرامنگ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ نئی اور مثبت بات کو بار بار دہرایا جائے۔تو تحت الشعور نیا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور پرانی بات حذف کر دیتا ہے

کریکٹر بھی تحت الشعور کے ذریعے ہی بنتا ہے۔

سچائیاں

سچائی۔ ''اللہ تعالیٰ سب انسانوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا ہے۔''

God, or Life, is no respecter of persons. Life plays no favorites. Life, or God, seems to favor you when you align yourself with the principle of harmony, health, joy, and peace.

یہ زندگی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب انسان برابر ہیں جن کو وہ اپنی عیال یا فیملی کہتا ہے۔ اس دنیاوی زندگی کے سوشل، اخلاقی، معاشی، سیاسی اصول بھی ہر انسان کے لیے برابر ہیں۔ انسان کسی بھی مذہب، رنگ، نسل، کلچر کا ہو، جو بھی ان پر عمل کرے گا وہی کامیاب ہوگا۔ س لیے کسی بھی مذہب کا آدمی اس کا پسندیدہ نہیں۔ بلکہ اللہ کے نزدیک انسانوں میں صرف وہ بندہ پسندیدہ ہوتا ہے جو اس کے دیئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارے، ایسے آدمی کو ہی متقی اور پرہیزگار کہتے ہیں

دوسری سچائی: انسان کے ذہن میں خدا کا بالکل صحیح تصور ہونا چاہیے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے، یہ سب سے اہم سچائی ہے جس پر دل سے یقین ہونا چاہیے یہ ہو، تو اسے کوئی بھی نفسیاتی مسئلہ نہیں ہوسکتا۔ اور زندگی میں کامیابیاں حاصل ہوں گی۔

Your concept of God is the most important thing in your life. If you really believe in aGod of love, your subconscious mind will respond in countless blessings to you. Believein a God of love.The minute these people entertain a God of love in their minds and hearts, and when they believe that God who watches over them, cares for them, guides them, sustains and strengthens them, this concept and belief about God or the Life Principle will be accepted by their subconscious mind, and they will find themselves blessed in countless ways.

اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے آپ کو رحمان ورحیم، ہونے کا اعلان کرتا ہے کہ اس طرح

وہ اپنے آپ کو تمام انسانوں کے لیے محبت، سلامتی، رحمانیت، امن، معاف کرنے والا یعنی غفور الرحیم، غفار بن کر دکھانا چاہتا ہے۔ نہ کہ قہار اور سخت گیر خدا، جو ہر وقت چھوٹی سی بات پر بھی پکڑ لے۔

''اللہ نے رحمت اپنے اوپر خود لازم مقرر کرلیا ہے۔'' (7-156)

''آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ جس کی ملکیت ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں اور زمین میں ہے کہتا ہے کہ میں نے اپنے لیے اپنے اوپر رحمت کو لازم مقرر کر لیا ہے۔'' (سورہ انعام۔6-12)

ایک دن حضور اکرم ﷺ صحابہ کرامؓ کے ساتھ جا رہے تھے کہ انہوں نے ایک پرندے کو گھونسلے میں اپنے بچوں کو کیڑے کھلاتے دیکھا تو فرمایا کہ تم اس ماں کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہو، اللہ تعالیٰ انسانوں سے اس ماں کی نسبت ستر گنا زیادہ محبت کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کو سو حصوں میں تقسیم کیا اور ننا وے حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ دنیا میں بھیجا اور اس ایک حصہ کی وجہ سے لوگ ایکدوسرے کے ساتھ رحم کرتے ہیں حتیٰ کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کے دودھ پیتے وقت اپنی ٹانگ اٹھالیتی ہے۔

حدیث قدسی: رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں بندے کے گمان کے مطابق اس سے معاملہ کرتا ہوں۔''
(صحیح بخاری7405)

اس لیے بہتر ہے کہ اس حدیث کے مطابق سب لوگ اپنے خیالوں اور دل میں اللہ تعالیٰ کو محبت کرنے والا خدا بنائیں جو کہ رحمان اور رحیم ہے جو کہ ان کو پالتا ہے حفاظت کرتا ہے اور ان پر نگہبان ہے تو یہی خیالات اور خدا کی شکل اور تصویر ان کے ذہن میں پکی ہو جائے گی اور تب سے ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت مختلف طریقوں سے ملنی شروع ہو جائے گی۔ اس لیے مسلمان کو ہر وقت مثبت اور پر امید سوچ رکھنی چاہئے۔ اللہ

جب خود کہہ رہا ہے کہ "مجھ سے مایوس نہ ہونا میں سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہوں کیونکہ میں غفور رحیم ہوں"۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ میں گناہوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔تو پھر اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔؟ سوائے بے وقوفی کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ **تخلقوا باخلاق الله**۔اپنے میں اللہ کے ناموں والے اخلاق پیدا کرو۔یعنی غفور، رحیم، قدوس، قادر وغیرہ۔تو انسانوں کو بھی اللہ کی رحمان اور رحیم کی صفت اپنا کر اپنے اور دوسروں انسانوں کے لیے بھی اور تمام مخلوقات، جانوروں، نباتات، کے لیے رحمت بننا ہے۔یہی اللہ کی مرضی ہے ارادہ ہے۔خواہش اور حکم ہے۔

سچائی: انسان غلطی کا پتلا ہے اس سے بھول چوک ہونا یا غلطی ہو جانا یعنی error of judgment ممکن ہے اور اس کی فطرت میں ہے۔(اس لیے ہمیں یہ دعا سکھاتا ہے) کہ ''اے اللہ؛ اگر ہم بھول جائیں یا غلطی اور خطاء کر جائیں، یعنی omission or commision تو ہمیں اس پر مواخذہ نہ کریں سزا نہ دیں (یعنی ہم نے ارادے سے وہ یعنی غلط کام نہ کیا ہو)(۲۔۲۸۵)

سچائی۔''اللہ تعالیٰ کو بندوں کا غلطیاں کرنا اور اس سے ان کا معافی مانگنا پسند ہے تا کہ وہ اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔''

حدیث:''میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم وہ لوگ ہوتے جن سے کوئی گناہ نہ ہوتا تو وہ تمہاری جگہ دوسرے لوگ لے آتا جو غلطیاں کرتے اور پھر اللہ سے معافی مانگتے تا کہ وہ ان کو معاف کر دیتا۔'' (مسلم۔۲۶۸۷)

سچائی:''جس اتھارٹی کی حکم عدولی کی جائے تو صرف وہی سزا دے سکتی ہے یا معاف کر سکتی ہے۔''

''جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ہی ملکیت ہے۔'' (2-284)

اور چاہے تم اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو جو کہ تمہارے دلوں کے اندر ہے اللہ اس کا حساب لے

گا۔ پھر وہ جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا اور وہ ہر چیز پر قدرت اور اختیار رکھتا ہے،

''اللہ کے علاوہ کوئی اور گناہ معاف نہیں کرسکتا۔'' (آل عمران ۔3-135)

سچائی: ''غلطی مان لینے سے معافی مل جانے کا اصول''

''اور جو کوئی گناہ کرے یا اپنے ساتھ زیادتی کرے اور بعد میں اللہ سے معافی مانگ لے تو وہ اللہ کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔'' (سورہ نساء۔آیت ۱۱۰)۔ نافرمانی کو اللہ بندے کی اپنے ساتھ زیادتی یا ظلم قرار دیتا ہے کیونکہ وہ اس طرح سزا کا مستحق ٹھہر جاتا ہے۔

سچائی: ۔ اللہ تعالیٰ سزا نہیں دینا چاہتا۔ اس لیے مواقع فراہم کرتا رہتا ہے۔

''اللہ کہتا ہے کہ میں تم کو سزا دے کر کیا کروں گا اگر تم ایمان لے آؤ۔'' (4-147)

سچائی: حکم ماننے یا نہ ماننے سے اللہ کی ذات کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ''جو بھی اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے تو وہ اپنے فائدے کے لیے عمل کرتا ہے اور جو نہیں کرتا وہ اپنے نقصان کے لیے خود ہی ایسا کرتا ہے۔ ایک کے اچھے یا برے اعمال اثر کسی دوسرے پر نہیں پڑے گا۔''

سچائی: ''اور اگر تم بڑے گناہ چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کردے گا اور تمہیں معزز جگہ میں داخل کردے گا۔'' (سورہ نساء، 4-31)

سچائی: اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر کے برابر ہے۔ (سورہ زمر 39-53)

''اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تو میری رحمت سے ناامید مت ہو جانا۔ اللہ تو سب کے سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بے شک وہ غفور اور رحیم ہے۔'' (سورہ ابراہیم ۔15-56)

''ابراہیم نے کہا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوسکتا ہے سوائے گمراہ لوگوں کے۔''

سچائی: اللہ سبحانہ تعالیٰ تو گناہوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل کردے گا۔ (سورہ

فرقان۔۲۵۔آیت ۶۹،۷۰۔)

''جو پچھتا کر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں اور نیک اعمال کریں تو اللہ ان کے گناہ نیکیوں میں تبدیل کر دیگا اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔''

سچائی: (نیکیوں سے برائیوں کو دور کرنے کا اصول)

''بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاددہانی ہے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔'' (11-114)۔

حدیث: حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ: ''رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ غلط کام ہو جائے تو اس کے بعد اچھا کام کر لو تو وہ برائی دور کر دے گا۔ تو انہوں نے پوچھا کہ کیا لا الہ الا اللہ کہنا بھی نیکی ہے تو فرمایا کہ یہ بہترین نیکی ہے۔'' نیکیوں میں صرف وہ اچھی سوچ بھی شامل ہے جس کا ارادہ کر لیا جائے مگر کر نہ سکے۔ اور یہ اس کی طرف فضل و کرم کی وجہ سے ہے۔ صرف نیک کام کے سوچنے پر بھی ایک نیکی کا ثواب مل جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے ہر وقت نیک سوچیں ہی رکھنی چاہئیں۔ حدیث:۔ حضرت ابن عباسؓ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بندے کا حساب کیسے رکھا جاتا ہے اگر بندہ نیکی کرنے کا صرف سوچتا ہے تو اس کے حساب میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے۔ اگر کر لیتا ہے تو دس سے سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اگر گناہ کا ارادہ کرتا ہے مگر نہیں کرتا تو اس کے حساب میں ایک نیکی لکھ لی جاتے ہے۔ اگر وہ گناہ کر لیتا تو تو صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے۔

صرف غلطی نہ ماننے اور توبہ نہ کرنے والے لوگ ہی مجرمانہ ذہنیت کے لوگ hard core criminals قرار دئے جانے کا اصول ''تمہارے رب نے مہربانی اور رحمت فرمانا اپنے ذمہ مقرر فرما لیا ہے (لازم کر لیا ہے) کہ جو شخص تم میں سے جہالت سے کوئی برا کام کر بیٹھے، پھر وہ اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح رکھے تو اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں۔ (۵۴) اور اسی طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے رہتے ہیں تاکہ مجرمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے۔'' (سورہ انعام۔6-55)

''اوراس سے پہلے کہ اللہ کا عذاب آ واقع ہو اس کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ۔ ورنہ بعد میں تم کو مدد نہیں ملے گی۔'' (سورہ ابراہیم۔15-56)

سچائی: ان سچائیوں کو نہ ماننے والے کچھ لوگ خدا کو دنیا میں مشکلات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ یہ غلط سوچ ہے۔

Many persons habitually set up mental resistance to the flow of Life by accusing and reproaching God for the sin, sickness, and suffering of mankind. Others cast the blame on God for their pains, aches, and loss of loved ones, personal tragedies, and accidents. They are angry at God, and they believe He is responsible for their misery.As long as people entertain such negative concepts about God, they will experience the automatic negative reactions from their subconscious minds. Actually, such people do not know that they are punishing themselves. They must see the truth, find release, and give up all condemnation, resentment, and anger against anyone or any power outside themselves. Otherwise, they cannot go forward into a healthy, happy, or creative activity.

Life, or God, holds no grudge against you. Life never condemns you. Life heals as ever cut on your hand. Life forgives you if you burn your finger. It reduces the edema and restores the part to wholeness and perfection.

کچھ لوگ اپنی یا دنیا کے حالات یا تمام مشکلات کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتے ہیں، یعنی اسے سخت گیر، سزا دینے والا سمجھیں گے کہ ذرا سی غلطی پر وہ فوراً سزا دے دیتا ہے یہ یقیناً صحیح سوچ نہیں ہے۔ جو ایسا سوچتے ہیں یہ دراصل اپنے آپ کو ہی سزا دینے کے

مترادف ہے اور یوں یہ اپنے کو لگاتار سزا دیتے رہیں گے کسی اور کو کچھ نہیں ہوگا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ تو رحمان و رحیم ہے وہ کسی سے کیوں دشمنی لگائے گا۔ اس کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔۔ تمام مخلوق کو وہ اپنی عیال یا فیملی کہتا ہے۔ بلکہ خدا کے معاف کرتے رہنے کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ اپنی غلطی سے انگلی جلا بیٹھتے ہیں تو وہ فوراً اس کو ٹھیک کر دیتا ہے۔

سچائی: اس دنیا میں فساد انسانوں کے اپنے برے اعمال کے نتیجے سے ہوتا ہے۔

God, or Life, never sends disease, sickness, accident, or suffering. We bring thesethings on ourselves by our own negative destructive thinking based upon the law as wesow, so shall we reap.-God has nothing to do with unhappy or chaotic conditions in the world.Man's negative and destructive thinking brings about all these conditions. Therefore, it is silly to blame God for your trouble or sickness.

اللہ تعالیٰ اس دنیا کی زندگی کو کھیتی سے تشبیہ دیتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا ہی کاٹو گے۔ جو خیال ذہن میں بوئیں گے، ویسے ہی نتائج نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''بر و بحر میں فساد لوگوں کے اعمال کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔'' (سورہ روم، ۳۰۔۴۱) اس لئے دنیا میں بیماری، ایکسیڈنٹ، مصیبتیں، جنگ، فساد، خدا نہیں بھیجتا، یہ لوگوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہی سب کچھ ہوتا ہے یعنی لوگوں کی منفی سوچوں سے ہی منفی حالات پیدا ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ''بُرائی کے ذکر سے برائی پھیلتی ہے اور اچھائی کے ذکر سے اچھائی پھیلتی ہے۔'' دوسرا فرمان ہے کہ ہر وقت اچھی بات کریں یا خاموش رہیں۔

سچائی:۔ اگر فطرت کے اصولوں کے خلاف کریں گے اور منفی سوچیں رکھیں گے تو منفی حالات ہی پیش آئیں گے۔

you set up resistance in your mind to the flow of Life through you, this emotional congestion will get snarled

up in your subconscious mind and cause all kinds of negative conditions.

یعنی اگر آپ اپنے ذہن میں اللہ کے انسانی فطرت یا کائنات کے قوانین، سچائیوں اور اصولوں کے خلاف سوچیں گے، اور ذہن میں منافقت، غلط اعتقاد اور منفی باتیں جمع کرلیں گے اوران پرعمل کریں گےتواس کے نتیجے میں ہونے والی خیالات اور جذبات کی پراگندگی اوراس کے منفی اثرات نہ صرف آپ کو بے چین رکھیں گے بلکہ وہ معاشرے میں بھی منفی تجربات اور واقعات کی شکل میں سامنے آنے لگیں گے۔اس لیے ہر انسان کے اعمال اجتماعی اثرات کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ لوگ ان سے نقل کے ذریعے سیکھ کر بھلائی یا برائی پھیلانے والے بن جاتے ہیں۔

لوگوں کی منفی اور تباہ کرنے والی منافقت والی سوچوں سے یہ فساد پھیلتا ہے اسی لیے منافقت کواللہ فساد کہتا ہے۔کم تولنے کوفساد کہتا ہے۔یعنی دائمی سچائیوں کو نہ ماننے کوفساد یا mischief کہتا ہے۔اس لیے اس دنیا میں جوفساد ہے اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ سب انسانوں کا خود پیدا کردہ عذاب ہے،

سچائی:۔ آدمی جیسے سوچتا ہے ویسے ہی بن جاتا ہے۔

To understand all is to forgive all

When man understands the creative law of his own mind, he ceases to blame other people and conditions for making or marring his life. He knows that his own thoughts and feelings create his destiny. Furthermore, he is aware that externals are not the causes and conditioners of his life and his experiences. To think that others can mar your happiness that you are the football of a cruel fate that you must oppose and fight others for a living— all these and others like them are untenable when you understand that thoughts are things. The Bible says the same thing. For as a man thinketh in his heart, so is he.PROVERBS 23:7. God,

or Life, never punishes. Man punishes himself by his false concepts of God, Life, and the Universe. His thoughts are creative, and he creates his own misery.

خیالات بھی چیزوں کی طرح ہوتے ہیں۔ خیالات ہی جسمانی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو سوچیں گے وہی کاغذ پر الفاظ بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نیلے رنگ کے کپڑے خریدتے ہیں تو اس لیے کہ خیال میں نیلا رنگ پسند ہے تبھی نیلے خریدیں گے۔ بیرونی تجربات آپ کے لیے مشکلات پیدا نہیں کرتے بلکہ آپ کے اپنے اندر منفی سوچوں پر مبنی یہ خیالات ہی بیرونی تجربات کا باعث بنتے ہیں۔ اگر آپ ہر وقت کامیابی کا سوچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے ذرائع سے ملاقات کرا دیتا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ آپ کے خیالات ہی آپ کی قسمت بناتے ہیں۔ اگر منفی سوچیں رکھیں گے تو ویسے ہی تجربات ملیں گے۔

جب ذہن کے خیالات اوران سے اعمال پیدا کرنے کے کام کرنے کا طریقہ معلوم ہو جائے اور سمجھ آ جائے کہ ہر آدمی کیسے کام کرتا ہے اور یہ کہ آپ کا صرف اپنی سوچوں پر کنٹرول ہوتا ہے دوسروں کی سوچوں پر نہیں۔ اور ہر بندہ کو اللہ نے سوچنے اور عمل کی آزادی دی ہوئی ہے تو آپ دوسروں کی آزادی چھین نہیں سکتے۔ تو پھر دوسروں کو الزام دینا بند کر دینا چاہیے کیونکہ انسان کے اپنے خیالات اور دوسروں کے خیالات اور اس کے نتیجے میں اعمال پر ردعمل کو کنٹرول کرنا سیکھ لے تو پھر آپ کی زندگی خوشگوار گزرے گی۔ دوسروں سے امیدیں نہ لگاؤ، کا اصول بھی یہی ہے کہ آپ دوسروں کو ایک خاص طریقے سے برتاؤ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے تو پھر دوسرے جس طرح کریں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان کے برتاؤ کو انجوائے کریں اور اللہ کا شکر کریں کہ آپ اچھے ہیں۔ اور یہی آپ کی کامیابی اور تقدیر ہے جس پر آپ کی شخصیت کا حساب ہوگا۔

سچائی: اگر آپ فطرت کے کسی بھی قانون کی خلاف ورزی کریں گے تو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ جیسے بجلی کے ننگے تار کو ہاتھ لگائیں گے تو شاٹ لگے گی۔

For example, if you misuse the laws of life, you will suffer accordingly. If you put your hand on a naked charged wire, you will get burned.

سچائی: قدرت یا فطرت کے قوانین برے یا اچھے نہیں ہوتے بلکہ ان کا استعمال انہیں ایسے بناتا ہے۔یعنی ہر عمل کے نتائج نیت پر منحصر ہے۔اچھائی یا برائی سوچنے اور نیت کرنے والے کو واپس لوٹتی ہے۔rebound کرتی ہے۔

God, or Life, does not condemn or punish you. The forces of nature are not evil. The effect of their use depends on how you use the power within you. You can use electricity to kill someone or to light the house. You can use water to drown a child, or quench his thirst. Good and evil come right back to the thought and purpose in man's own mind.There is nothing good or bad, but thinking makes it so. There is no evil in sex, the desire for food, wealth, or true expression. It depends on how you use these urges, desires, or aspirations. Your desire for food can be met without killing someone for a loaf of bread

بذاتِ خود کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی۔صرف اس کے استعمال سے وہ اچھی یا بری بن جاتی ہے مثلاً خیالات کے اظہار میں کوئی برائی نہیں ہوتی، بلکہ یہ اس پر منحصر ہے کہ آپ ان جذبات، خواہشات، کو کیسے استعمال کرتے ہیں اور کیوں کرتے ہیں۔اسی لیے حدیث ہے کہ انما الاعمل بالنیات۔ اچھے برے خیالات کے اثرات سوچنے والے کی طرف ہی واپس آتے ہیں

سچائی:۔ بات نیت کی ہوتی ہے۔سازش کرنے والے کی سازش اس کے بنانے والے کی طرف لوٹتی ہے۔

The evil plot will beset none but the its authors. (Surat Fatir, No. 35, Ayat 43);--On account of their arrogance in the land and their plotting of Evil, but the plotting of

Evil will hem in only(engulf) the authors thereof. Now are they but looking for the way the ancients were dealt with? But no change wilt thou find in Allah's way (of dealing): no turning off wilt thou find in Allah's way (of dealing).

سچائی:۔سب سے بڑا گناہ جہالت ہے۔سچائی جان لینے سے پھر غلطی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی سزا ملے گی۔

قانون نہ جاننے سے ہی قدرتی طور پر کوئی قانون توڑے گا یا غلط استعمال کرے گا تو اسے سزا مل جائے گی اسی لیے کہتے ہیں کہ ignorance of law is no excuse۔ نہ جاننے سے ہی غلط بات ہوگی...... اور اس غلطی کی سزا کسی بھی قانون، جیسے فطرت، فزیکل، کیمسٹری، کے غلط استعمال کے ردعمل سے ہوتا ہے۔ جیسے اگر کیمسٹری میں تجربہ کرتے غلط چیزیں ملا دیں تو دھماکہ ہوگا جس سے آپ خود یا فیکٹری بھی تباہ ہوسکتی ہے۔ اگر میز پر زور سے مکہ ماریں گے تو ہاتھ زخمی ہوگا۔ میز کو کچھ نہیں ہوگا۔۔ پودا بوئیں گے اور اگر اس کی دیکھ بھال کے اصول کی خلاف ورزی کریں گے تو وہ سوکھ جائے گا۔ اسی طرح جب ہم اللہ کے فطرت یا معاشرت کے اصول یا دنیادی قانون نہ جاننے سے غلط حرکت کریں گے تو سزا تو ضرور ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کو یا حکومت کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے اہم سبق یہ ہے کہ جہالت کو دور کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان عورت اور مرد پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے اور یہ عمل موت تک ختم نہیں ہوتا۔ اور علم ہر قسم کا علم بارے ہے نہ کہ صرف دینی علم طارے یہ حدیث ہے۔ پنگھوڑے سے قبر تک علم حاصل کرنا اور زندگی کو بہتر بناتے رہنا فرض اسی لیے بنایا گیا ہے اور اس علم کو کیسے استعمال کیا ہے اس کی بھی پوچھ ہوگی۔

اصول یہ ہے کہ صرف سچ ہی ذہنی، شک، غلط سوچ اور معاشرتی فساد کو دور کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ باطل کو بھاگنا ہی ہوتا ہے۔ ہر سائیکالوجسٹ علاج کے دوران ذہنی تجزیہ کر کے صرف یہ معلوم کرتا

ہے کہ مریض کی کون سی غلط سوچ یا فکر ذہن کو پریشان کر رہی ہے۔ اور پھر انسان کو اس غلط سوچ اور غلط خیالات کی نشان دہی کر کے ان کی جگہ صحیح سوچ بتا دیتا ہے تو ذہنی بوجھ ایک دم ختم ہونے سے بیماری فوراً ٹھیک ہو جاتی ہے۔ پاگل بھی صرف سچ بات سمجھانے سے فوراً ٹھیک ہو جاتا ہے۔ صوفیاء اور اصلی پیر بھی یہی کرتے ہیں کہ سچ بتا دیتے ہیں چونکہ ان کی بات پر یقین ہوتا ہے تو ذہن فوراً صاف ہو جاتا ہے۔

سچائی احساس گناہ کیا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟

5. Your guilt complex is a false concept of God and Life. God, or Life, does not punish or judge you. You do this to yourself by your false beliefs, negative thinking, and self condemnation.

نبی کریم ﷺ نے نیکی اور گناہ کا ٹسٹ یہ بتایا ہے کہ: ''جب تمہیں اپنی نیکی اچھی لگنے لگے اور برائی بری لگنے لگے تو تم مومن ہو۔'' (احمد، مشکوٰۃ۔۴۹)

احساسِ گناہ دراصل اللہ بارے غلط نظریے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں احتساب نہیں کرتا صرف آخرت میں کرے گا۔ اس دنیا میں ہم اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔ کیسے وہ میں مختصراً بتاتا ہوں۔

ہمیں والدین، سوسائٹی، مذہب، معاشرہ جو بھی اصول، عقیدے، رسومات سچ بتا کر سکھاتا ہے وہی ہمارے تحت الشعور میں سٹینڈرڈ سچائی سمجھ لی جاتی ہے۔ ہر نئی بات، فعل، عمل کا اسلامی غیر اسلامی، صحیح یا غلط، جائز یا ناجائز کا فیصلہ تحت الشعور یا ضمیر، بچپن سے دیئے گئے اور ریکارڈ شدہ بنیادی نظریات عقیدے، سٹینڈرڈ، اصول، قانون، رولز سے موازنہ کر کے ہی فیصلہ کرتا ہے کہ میں نے فلاں اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔ تحت الشعور کمپیوٹر کی hard disk ہے۔ مثلاً ہمیں بچپن سے بتایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ بدن ننگا کرنا گناہ ہے، رشوت لینا گناہ ہے تو جھوٹ بولتے ہی اور ننگا ہونے سے پہلے ہی گناہ کا احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے کیہ مت کرو یہ غلط ہے۔ اگر کوئی پھر بھی

کرلیتا ہے تو اس کے نتیجے میں معاشرتی لیول پر سب کے سامنے ہونے والی ممکنہ بے عزتی اور سزا ملنے کا چانس اور ڈر سے ہی ذہن بے چینی پیدا کرتا ہے۔یہی احساس گناہ کہلاتا ہے۔اس بے چینی کو دور کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ فوری طور پر خود ہی فیصلہ کرے کہ میں اگر نہ بھی پکڑا گیا تو بھی آئیندہ یہ اصول یا قانون یا حکم نہیں توڑوں گا تو فوراً ذہنی سکون حاصل ہو جائے گا۔اگر پکڑا جائے اور سزا بھی مل جائے تو پھر یقین کرلیں کہ آخرت میں ریکارڈ بھی ختم ہو گیا ہوگا۔تو یہ بھی سکون کا باعث بن جائیگا۔

ہمارے یہاں جس فرد، سیاست دان، فرعون، اشرافیہ، وغیرہ کو پتہ ہو کہ سزا تو بعد کی بات ہے، کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا، تو اسے رول توڑتے احساس گناہ کی بجائے احساس فخر ہوتا ہے کہ میں بہت بڑی چیز ہوں۔رہا اللہ تعالیٰ کے احتساب کا خوف، وہ تو اس کے تحت الشعور میں بچپن سے ریکارڈ ہی نہیں ہوتا اگر ہوا بھی تھا تو اسے حذف کر دیا گیا ہوتا ہے۔یا سٹور میں پھینک دیا ہوتا ہے۔یہ سٹور سے تب نکلتا ہے جب کوئی بہت بڑا شاک ملے تب سٹور سے نکال کر شعور میں دوبارہ لاکر پروردگار کی یاد آتی ہے۔

مغربی ممالک کا بھی آج سے سو سال پہلے یہی حال تھا کیوں کہ مذہب کا اثر تھا۔مگر آج کل صحیح اور غلط کا فیصلہ سوسائٹی کرتی ہے، ضمیر کو سلا دیا جاتا ہے اور خدا کو تو وہ فیصلوں میں لاتے نہیں۔جب کوئی سوسائٹی کسی غلط کام کو بھی صحیح سمجھ لیتی ہے تو پھر ضمیر یا تحت الشعور بھی reprogramme ہو جاتا ہے جیسے کہ مغربی سوسائٹی میں ساحل سمندر پر ننگے پھرنا۔کم سے کم کپڑے پہننا۔اب بچپن سے ہی سکھایا جاتا ہے کہ ننگا ہونا برا یا گناہ ہی نہیں، تو نہ ان کا تحت الشعور ان کو برا نہیں کہتا ہے تو پبلک میں بھی ننگے ہونے سے معاشرہ بھی کسی کو برا نہیں سمجھتا بلکہ ہنستے ہیں اور انجوائے کرتے ہیں۔صرف مذہبی ذہن کے لوگ اس کو پھر بھی برا اور گناہ سمجھیں گے۔مگر جھوٹ بولنا مغربی معاشروں میں اب بھی بہت بڑا گناہ یا جرم سمجھا جاتا ہے۔ان لوگوں میں بھی اللہ تعالیٰ کے پروگرام کردہ ضمیر کو شعور میں تب لایا جاتا ہے جب خدا کی طرف سے شاک ملے تو پھر پیدا کرنے والے کا احساس جنم لیتا ہے اور ضمیر بھی خدا کی پروگرامنگ پر واپس آجاتا ہے۔

ہماری سوسائٹی بھی بتدریج مغربی طرز پر جارہی ہے مگر ہمارے اپنے سٹینڈرڈ ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اب جھوٹ رشوت لینا، قانون توڑنا، کرپشن کرنا، غلط کام جھوٹ منافقت جرم یا گناہ گنا ہی نہیں جاتا بلکہ فخر کی بات ہوتی ہے۔ نیک بیٹا جو حلال کمائی پر رہے اسے ناکام قرار دیا جاتا ہے تو پھر ضمیر میں احساس گناہ کیسے پیدا ہوگا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کی واضح ہدایت ہے کہ برائی کو زور سے روکو، ورنہ الفاظ۔ یہ دونوں نہیں کرسکتے تو کم ازکم برائی کو برائی ہی سمجھتے رہو۔ جس دن برائی کا احساس ختم ہو جائے تو پھر وہ معاشرہ point of no return کے پار چلا جاتا ہے جو کہ خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے مستحق ہو گئے ہیں۔ وہ کب پکڑتا ہے یہ اس کی اپنی ٹائمنگ ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اس فلاسفی کو سمجھ کر احساس گناہ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی چاہیے۔ بلکہ توبہ کر کے نیا فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ غلطی دہراؤں گا نہیں بلکہ بہتر انسان بن جاؤں گا۔ اگر پھر غلطی ہو جائے تو پھر توبہ کرلے اور کوشش کر کے بری عادت سے جان چھڑا لے۔

سچائی:۔ ہر بات میں انجانے گناہ ثواب کو، سر پر سوار کر لینا اور احساس گناہ کے ساتھ زندہ رہنا غلط سوچ اور زندگی گزارنے کا رویہ ہے۔

A girl who refused to marry came to me once weekly for about ten weeks, and I taught her the workings of the conscious and subconscious mind set forth in this book. This young girl gradually came to see that she had beencompletely brainwashed, mesmerized, and conditioned by an ignorant, superstitious, bigoted, and frustrated mother. She broke away completely from her family and started to live a wonderful life.She prayed for a divine companion by claiming that Infinite Spirit would attract to her a man who harmonized with her thoroughly. Eventually this came to pass.

کچھ عرصہ پہلے ایک بائیس سالہ لڑکی بار بار شادی سے انکار کر رہی تھی کیونکہ اس کی مذہبی ذہن کی ماں نے اسے ہر بات یا کام میں گناہ ہے یا ثواب چیک کرنے کی

سوچ ڈال دی تھی، اس لیے وہ اکثر احساس گناہ اور جھجک میں گرفتار رہتی۔ جس نے اس کی زندگی حرام کی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ سادہ رہتی تھی، لپ سٹک نہ لگانا اور کالے کپڑے پہننا اس کی عادت بن گئی تھی جب اسے صحیح بات بتائی گئی تو اس نے اپنے آپ کو معاف کرنا سیکھ لیا تو یہ احساس گناہ کم ہوا تو پھر اس نے شادی کر لی۔

ہمارے یہاں بھی جو زیادہ مذہبی ہو جاتا ہے اس کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے رحمان رحیم اور محبت کرنے والے خدا کی بجائے اسے سخت گیر سمجھ کر زندگی انجوائے نہیں کر سکتا۔ ہر ایک بات کرنے کے بعد انجانے گناہ کا احساس کہ کہیں غلط تو نہیں ہو گیا زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ یا ہر بات میں شرعی یا غیر شرعی پوچھنا مشکل بنا دیتا ہے جیسے کسی نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ گھڑی دائیں کلائی پر پہننی چاہیے یا بائیں پر، شرع کیا کہتی ہے۔۔ ہم نے اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کی ہدایات کو صحیح طرح نہیں سمجھا اس لیے ایسی سوچیں جنم لے رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ اصول فرما دیا ہے کہ ”اور اگر تم بڑے گناہ چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں معزز جگہ میں داخل کر دے گا۔“ (سورہ نساء، 4-31) تو پھر ہمیں بڑے گناہوں کا پتہ ہونا چاہئے۔ احادیث کے مطابق تو اچھے وضو، دو نمازوں کے درمیان چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ کوئی نیکی کرنے، صدقہ خیرات سے بھی گناہ معاف ہو جاتے ہیں وغیرہ تو پھر چھوٹی موٹی بھول چوک تو اس دعاء، اے اللہ اگر ہم غلطی کر جائیں یا بھول جائیں تو مواخذہ مت کرنا، سے بھی معاف ہو جاتے ہے۔ تو ذہن کو ہر وقت سکون میں رکھیں

سچائی: ہمارا کسی چیز پر کنٹرول نہیں، سوائے اپنے آپ کے۔ اس لیے ردعمل نہ دکھائیں یہ بہت اہم اصول اور حقیقت ہے جس کا ادراک بہت ضروری ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے یہود کو کہا کہ تم فلسطین میں جاؤ تو وہ کہنے لگے کہ وہ بڑے طاقتور لوگ ہیں ہم تو نہیں جائیں گے تم اور تمہارا خدا جائے اور لڑے ہم تو یہاں ہی بیٹھے رہیں گے۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے التجا کی کہ میرا کنٹرول تو اپنے آپ اور اپنے بھائی پر ہے تو آپ ان فاسق لوگوں میں اور میرے

درمیان فرق کرلیں۔ ہمارا روز کا تجربہ ہے کہ بچے والدین سے کسی وقت بھی باغی ہو سکتے ہیں۔والدین نافرمان بچے کو گھر سے نکال سکتے ہیں۔کسی بھی تعلق میں کوئی شخص بھی کسی وقت بدل سکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو فیصلہ کرنے کی آزدی دی ہوئی ہے۔اسی لیے تمام پیغمبروں کا کام بھی صرف پیغام پہنچا دینا رہا ہے، ماننا یا نہ ماننا لوگوں کی اپنی ذاتی مرضی ہوتی ہے، اسی طرح استاد کا کام پڑھانا اور سکھانا ہے۔سیکھنا یا نہ سیکھنا ہر ایک کی مرضی ہوتی ہے۔اسی لیے صرف نصیحت کرنا یا کسی کام کی یاد دہانی کراتے رہنا یا وارننگ دینا ہی فرض ہے شاید کہ دوسرا مان جائے۔

آپ نوٹ کریں کہ روزانہ ہمیں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، اچھے بھی اور برے بھی۔راہ جاتے کون اس کو ٹکر مار جائے گا یا جھگڑ پڑے گا یا اس کی مدد کے لیے آئے گا اسے پتہ نہیں ہوتا اسی طرح ملکی اور غیر ملکی حالات ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جن پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔اور ہم نے ان کے ساتھ اپنی بقاء کے لیے سمجھوتے کرنے ہوتے ہیں۔انسان صرف محنت کرسکتا ہے، نتائج اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتے۔نہ ہی یہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ اس کے بچے کیسے ہونگے۔نہ ہی رزق۔عزت، زندگی یا موت، صحت یا بیماری، دولت یا غریبی اس کی چوائس کے مطابق ملتی ہے۔کوئی چیز بھی اس کے ہاتھ میں نہیں یہ تقدیر کا کھیل ہوتا ہے۔آدمی کے ہاتھ میں صرف ردعمل کرنے کی چوائس ہوتی ہے کہ ہم ان کساتھ بدلے میں کیا ردعمل دکھاتے ہیں وہی ہماری عقل مندی کا امتحان ہوتا ہے۔اور اسی سے ہماری زندگی خوشگوار یا خراب بھی ہو سکتی ہے۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی کو اچھا گزارنا ہے تو منفی سوچوں اور دوسروں کے غلط طرز عمل پر منفی ردعمل نہ دکھائیں، بلکہ مثبت ردعمل کریں یا برداشت کریں۔جیسے حضرت موسیٰؑ کے پاس بنی اسرائیل کے خلاف اللہ سے مدد مانگنے کی چوائس کے علاوہ اور کوئی چوائس نہیں تھی۔ہمارے پاس بھی اگر کچھ نہ کر سکنے کی بات ہو تو اللہ سے مدد مانگنے کی چوائس ہی ہوتی ہے۔اس کو استعمال کریں تو جھگڑوں سے بچ سکتے ہیں۔اس لیے ردعمل سے بچیں۔

ردعمل نہ دکھانا بہت بڑی سنت ہے۔

اپنی شخصیت کا آپ خود فیصلہ کریں۔آپ کی زندگی کو دوسرے کیوں کنٹرول کریں۔آپ خود وہ بنیں جو بننا چاہتے ہیں۔ردعمل کی عادت سے آپ خود اپنی شخصیت کو نقصان پہنچائیں گے۔دوسرے کو کچھ نہیں ہوگا۔

اپنے خیالات پر، اپنے پر سیلف کنٹرول ہونا ضروری ہے۔طریقہ ضمیمے میں دیا ہے

You cannot be hurt when you know that you are master of your thoughts, reactions, and emotions. Emotions follow thoughts, and you have the power to reject all thoughts, which may disturb or upset you.

تنقید بھی آپ کی مرضی ہی سے آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔یہ تب ہوسکتا ہے کہ آپ کو اپنی سوچ اور جذبات پر پورا کنٹرول ہو اور ردعمل نہ دکھایا جائے تو کچھ ذہنی کوفت نہ ہوگی۔تنقید پر سوچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ:

If another criticizes you, and these faults are within you, rejoice, give thanks, and appreciate the comments. This gives you the opportunity to correct the particular fault.

اگر آپ پر کوئی صحیح تنقید کرے یا غلطی کی نشان دہی کرے تو ہمیشہ اس کا شکریہ ادا کریں۔وہی آپ کا دوست ہے تاکہ آپ خامی دور کر کے بہتر انسان بن کر جنت کے مستحق بنیں۔

اگر کوئی غلط تنقید بھی کرے، تو آپ اپنے جذبات کا مالک بن کر ردعمل شو نہ کریں بلکہ اس کو معاف کرتے ہوئے دعا کریں کہ اللہ اسے سمجھ دے اس سے آپ کو ہی اجر ملے گا۔ اس اصول کی مثال دیکھیں:۔ایک ٹیچر کی تقریر کے بعد اس پر دوسری ٹیچر نے سخت تنقید کا نوٹ لکھا۔ پہلے تو اسے غصہ آیا کہ شاید تعصب، حسد، یا دشمنی کی وجہ سے اس نے لکھا ہے مگر دوسرے لمحے ہی اس نے سوچا کہ وہ شاید ٹھیک کہہ رہی تھی۔تو اس

نے تقریر کرنے کے فن کا کورس لے لیا اور اس کورس کے بعد اس کی ہر تقریر کی لوگ تعریف کرنے لگے۔ تو اس نے اس ٹیچر کو شکریے کا خط لکھا کہ بہت شکریہ اور مہربانی۔ تمہاری سچ پر مبنی تنقید نے مجھے تقریر کا فن سیکھنے پر قائل کر دیا تھا اور یوں میں نے ترقی کر لی ہے

اگر تنقید کرنے والی ٹیچر واقعی اس کی اچھی پرفارمنس سے حسد سے جل بھی گئی تھی تو تب بھی اس پر غصے کی بجائے رحم آنا چاہیے تھا اور اس کے لیے دعا بھی کرنی چاہیے تھی کہ اللہ اسے سکون دے۔ اس سوچ سے بھی اس ٹیچر پر جھوٹی تنقید کا کوئی برا اثر نہ پڑتا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کو آپ کی مرضی کے بغیر کوئی ذہنی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جب تک آپ اپنی سوچوں، ردعمل اور جذبات کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے ردعمل نہ دکھانا بہت بڑی سنت ہے۔

دوسری مثال: ایک لڑکی کا منگیتر چرچ میں شادی کے لیے نہیں آیا تو اس نے پریشان ہونے کی بجائے کہا کہ شکر ہے ابھی سے اس کا پتہ لگ گیا ہے ورنہ شادی کے بعد تنگ کرتا۔ کوئی اور جذباتی لڑکی ہوتی تو بے ہوش یا پاگل ہو جاتی۔ منفی ردعمل نہ کرنے سے بچ گئی۔ ان کہانیوں سے آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ ردعمل سے بچنا ہی صحیح اور فائدہ مند عادت ہے۔

چوٹ کی اقسام

انسان کو دو طرح کی چوٹ لگ سکتی ہے۔ جسمانی چوٹ یا ذہنی سوچ جس سے جسم یا ذہن یا روح کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ نے علاج رکھا ہے۔ جو کہ تحت اشعور کے ذہن کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔

جسمانی چوٹ کے اصول:

جسمانی چوٹ دو طرح سے لگ سکتی ہے۔ چاہے کسی دوسرے کی غلطی سے زخمی

ہوں یا آپ کی اپنی غلطی سے زخم لگے، مگر علاج کا طریقہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مثلاً دونوں صورتوں میں اگر آپ کی انگلی کٹ جائے یا جل جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً آپ کو اس غلطی کے لیے فوراً معاف کر دیتا ہے اور، جسم کے تحت الشعور کے خود کار سسٹم کو آرڈر کر دیتا ہے کہ اسے ٹھیک کرو اور آپ کا تحت الشعور فوراً آٹو میٹک طریقے سے اس زخم کو ٹھیک کرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور آپ بھی ذہن کے ساتھ متعلقہ احتیاط کر کے کو آپریٹ کرتے ہیں تو جلد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد کبھی اس بارے میں سوچتے بھی نہیں کہ کبھی چوٹ لگی بھی تھی یا نہی۔ یا بار بار یاد کر کے اپنے آپ کو کوستے بھی نہیں رہتے کہ مجھ سے یہ غلطی کیوں ہوئی تھی بلکہ اسے بھول جاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو جسمانی چوٹ کے لیے معاف کر دیا ہے۔ گر دوسرے کی غلطی سے چوٹ لگی تھی تو شفاء کے بعد اسے بھی معاف کر دیتے ہیں اور اس بات اور شخص کو پھر ہمیشہ کے لیے بھول بھی جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک کا نارمل رویہ ہوتا ہے

Life always forgives you when you cut your finger. The subconscious intelligence within you،sets about immediately to repair it. New cells build bridges over the cut. Should you take some tainted food by error, Life forgives you and causes you to regurgitate it in order to preserve you. If you burn your hand, the Life Principle reduces the edema and congestion, and gives you new skin, tissue, and cells. Life holds no grudges against you,and it is always forgiving you. Life brings you back to health, vitality, harmony, and peace, if you cooperate by thinking in harmony with nature. Negative, hurtful memories,bitterness, and ill will clutter up and impede the free flow of the Life Principle in you.

جب کوئی دوسرا جسمانی یا ذہنی تکلیف دیتا ہے تو عموماً ردعمل کے طور ہم دو چوائس استعمال کرتے ہیں کہ یا اسے معاف کر دیا جائے یا تکلیف کا بدلا یا انتقام لیا

جائے، مگر اللہ تعالیٰ تین چوائس دیتا ہے:۔ پہلی چوائس۔ اگر تکلیف کا بدلہ ہی لینا ہے تو انصاف کے اصول سے اتنا ہی بدلہ لو جتنا کسی نے تکلیف دی ہے۔

The repayment of a bad action is one equivalent to it. (42:40); And if you punish, then punish them with the like of that with which you were afflicted) (16:126)

دوسری چوائس، معاف کردینے کو ترجیح دینے کی نصیحت ہے۔

42-40. The recompense for an evil is an evil like thereof, but whoever forgives and makes reconciliation, his reward is due from Allah. Verily, He likes not the Zalimun

اگر اللہ کے اجر کی فکر ہو تو پھر لوگوں سے بدلہ لینے کی خوشی کی جگہ معاف کردینے میں زیادہ خوشی ملے گی۔

۳۔ برائی کے بدلے اچھائی کرکے دوست بنانا ہے

برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ: برائی کو اچھائی سے دُور کرو۔ ''اچھے اور بُرے اعمال برابر نہیں ہوسکتے۔ برائی کو اچھائی سے دور کرو۔ پھر وہ جو تمہارا دشمن تھا دوست بن جائے گا۔ مگر یہ صرف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو صبر کرتے ہیں اور کسی کو یہ استطاعت نہیں ملتی سوائے خوش قسمت لوگوں کے۔''

41-34 The good deed and the evil deed cannot be equal. Repel (the evil) with one which is better (i.e. Allah ordered the faithful believers to be patient at the time of anger, and to excuse those who treat them badly), then verily! he, between whom and you there was enmity, (will become) as though he was a close friend.35. But none is granted it (the above quality) except those who are patient, and none is granted it except the owner of the great portion (of the

happiness in the Hereafter i.e. Paradise and in this world of a high moral character).

معاف کرنے کی بجائے انتقام لینے کے نقصانات

عموماً لوگ ان تین چوائس میں سے انتقام لینا زیادہ پریکٹس کرتے ہیں۔ یعنی سزا کے طور بہت زیادہ تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں جس کا مقصد دوسرے کے دل میں ڈر اور خوف پیدا کرنا ہوتا ہے تا کہ دوبارہ تکلیف پہنچانے سے باز رہے۔

انتقام سے صرف دلی تسکین ملتی ہے مگر انتقام لینے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ انتقام سے پھر انتقام ہی جنم لے گا اور برائی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ انتقام لینے سے سینے کی جلن تو ٹھنڈی ہو جائے گی مگر پھر فکر لگ جائے گی کہ اب دوسرا کیا کرتا ہے۔ ایک تکلیف کے بعد دوسری شروع ہو سکتی ہے،۔ وقت اور پیسے اور انسانی جان کا زیاں ہوگا۔ مثلاً ہمارے قریبی گاؤں میں 1960 کی دہائی میں ایک چوہدری کی ایک مضارع کی بیوی سے بدسلوکی سے چوہدری قتل ہو گیا تو بدلے میں انہوں نے تین قتل کیے تو انہوں نے بدلے میں سات قتل کیے اور یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ ہمارے اپنے گاؤں میں 1950 کی دہائی میں تین قتل ہوئے انتقام کے تسلسل میں تین نسلیں ایک دوسرے کو قتل کر چکے ہیں۔ اس سے بچنے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ برائی کے بدلے معاف کرنے یا اچھائی کرنے کا گر بتاتا ہے۔

انتقام کی بجائے معاف کرنے سے فائدے کی مثال ہمارے گاؤں کی ہے۔ جس میں بیٹے نے اپنے باپ کا خون معاف کر کے پورے خاندان کو انتقام در انتقام سے بچا لیا۔ یہ 1905 کے لگ بھگ کی بات ہے۔ تب سے وہ امن سے رہ رہے ہیں۔ اس لیے معاف کرنے کی بڑی سنت پر عمل کر کے فائدے میں ہی رہے ہیں اور آخرت کا اجر اس کے علاوہ ہے۔،

ذہنی چوٹ کے اصول:

جسمانی چوٹ کی طرح ذہنی چوٹ بھی دوطرح کی ہوسکتی ہے۔۔یعنی آپ خود سے کوئی غلط فیصلہ کر کے نقصان اٹھائیں یا تکلیف پہنچائیں یا ملکی قانون توڑ کر کوئی جرم ہوجائے، یا خدا کے قوانین کو توڑ کر گناہ ہوجائے تو ان سے احساسِ گناہ یا جرم اور ممکنہ سزا کا ڈر اور بےعزتی کے ڈر سے ذہنی چوٹ لگتی ہے اور دماغ پریشان رہنے لگتا ہے۔اسی بارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس بات کے کرنے سے دل میں کھٹکا تشویش پیدا ہو کہ دوسروں کو نہ پتہ لگ جائے، وہ گناہ کی بات ہے، چاہے دوسرے اسے ٹھیک ہی کہتے رہیں۔

یا پھر کوئی دوسرا آپ کو ذہنی تکلیف پہنچائے۔جیسے ارادتاً جان، مال، عزت سے متعلقہ نقصان پہنچائے پھر رشتہ داری دوستی میں کوئی غلط کام یا جرم یا گناہ کروائے، تو دوستی میں غلط کام تو کرلیا مگر بعد میں جب احساس ہوتا ہے تب ذہنی تکلیف ضرور شروع ہوجاتی ہے۔

اس لیے ذہنی چوٹ سے چھٹکارے کے لیے بھی معاف کرنا دوطرح سے ہی ہوسکتا ہے۔اگر دوسرے نے چوٹ لگائی ہے تو دوسرے کو معاف کر دیا جائے اور آئیدہ کے لیے توبہ کی جائے کہ کسی نے غلط کام کا کہا تو اسے کہہ دیا جائے کہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرسکتا کیوں کہ اگلے جہاں تو مجھے خود ہی جواب دینا ہوگا۔اور سزا بھگتنی ہوگی

اگر آپ کی ذاتی غلطی سے ذہنی چوٹ لگی ہے،تو اس سے نجات کے لیے پہلے اس غلطی کی تلافی کرنی ہوگی اور اس کے بعد پھر اپنے آپ کو معاف کر دیں۔۔اہم بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں فائدے میں انسان خود ہی رہتا ہے۔چونکہ یہ اہم بات ہے اس لیے اس کو ذرا تفصیل سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔

اصول: توبہ کا اصول یا نظریہ کیا ہے؟

توبہ کا نظریہ یا مطلب کسی جرم یا گناہ، غلطی کے بعد احساس ہونے سے آئندہ کے لیے اللہ کے احکام، یا ملکی، معاشرتی قوانین کے مطابق عمل کی طرف قدم بڑھانے کا مصمم ارادہ ہوتا ہے۔ اور ماضی کے احساس گناہ یا جرم کو ختم کرنے کے لیے اپنے آپ کو بھی معاف کرنا سیکھنا ہی توبہ کی تکمیل کرتی ہے۔ احساس گناہ کے ساتھ جینا جہنم کے مترادف ہے اور اپنے کو معاف کر کے پرسکون کر کے رہنا جنت کے برابر ہوتا ہے۔

11.Forgiveness is to forgive yourself.

Forgiveness is getting your thoughts in line with the divine law of harmony. Self condemnation is called hell (bondage and restriction); forgiveness is called heaven (harmony and peace)."

اگر کوئی جرم کیا ہے مگر جرم میں پکڑے نہیں گئے یا گناہ کیا ہے تو احساس گناہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بے عزتی اور سزا کے ڈر سے دراصل ذہن میں کھلبلی مچنے، بے چینی ہوتی ہے یا پھر آخرت میں سزا کی فکرمندی کی صورت میں ملنی شروع ہو جائے۔ اس سے نجات کا طریقہ سچ پر مبنی سوچ ہی ہوتی ہے کہ پہلے تو اپنی غلطی فوراً مان لی جائے اور اللہ سے سوری کہا جائے، جیسے کسی کو تکلیف پہنچانے پر فوراً سوری کہہ کر معافی مان لیتے ہیں کہ بھئی مجھے اس بھول چوک کے لیے معاف کر دو۔ یہ سوری کہنا دینی طریقے سے ہونا چاہیے اور دوسرے مرحلے پر توبہ کے شعوری سوچ بچار کے نتیجے میں وہی غلطی دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عہد اور ارادہ کرنا ہوتا ہے کہ میں نے سبق سیکھ لیا ہے اور آئندہ یہی غلطی دوبارہ نہیں کرونگا۔ جب اپنی غلطی، گناہ سے سبق سیکھ کر، ارادہ کر لیا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرونگا۔ تو پھر یہ یقین ہو جانا چاہیے کہ اللہ نے بھی معاف کر دیا ہے اور معافی مل گئی ہے۔ اس لیے اپنے ذہن کو بھی بالکل صاف اور پرسکون کر لیں اور اس غلطی یا گناہ کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیں اور اپنے آپ کو بھی معاف کر دیں کیونکہ اللہ کے سسٹم نے بھی تمہیں معاف کر دیا ہے اور اللہ کا شکریہ بھی ادا کریں کہ مجھے صحیح راہ کی سمجھ

عطا فرمائی ہے۔اسی لیے یہ بھی سنا ہے کہ توبہ کے بعد معافی کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کبھی یاد نہیں آتا۔جیسے کہ جسمانی چوٹ کبھی یاد نہیں آتی۔

اپنے آپ کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ساتھ دوبارہ پیار محبت، فرمانبرداری کا تعلق قائم ہو گیا ہے اور تعلقات میں خوش گواری آ گئی ہے۔جیسے کسی قریبی رشتہ دار یا دوست کے ساتھ زیادتی ہونے کے بعد معافی مانگ لیں تو تعلق میں ویسی گہرائی آ جاتی ہے چاہے کچھ عرصہ لگ جائے۔یوں ذہن پھر سے امن اطمینان کے اصول کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔اور دلوں کا اطمینان اللہ کی یاد میں ہونے سے اطمینان ملنا شروع ہو گیا ہے۔اپنے آپ کو ذہنی طور گناہ گار سمجھتے رہنا اور اپنے کو بُرا انسان سمجھتے رہنا ہی دراصل ذہنی جہنم ہوتا ہے جبکہ اپنے آپ کو معاف کر دینا ہی ذہنی جنت ہوتی ہے۔ کیونکہ جنت کا مطلب ہی وہ جگہ ہے جس میں دلی اور ذہنی امن، سلامتی، سکون، خوشی اور اطمینان حاصل ہو گا۔

اسی فلاسفی کو مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، اپنی کتاب، گناہوں سے بچنے کا طریقہ صفحہ ۱۴۲۔ میں ایک بزرگ ڈاکٹر عارف باللہ صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ توبہ کے بعد میں معاف کر کے گناہ نامہ اعمال سے مٹا دوں گا تو پھر بھی اپنے کسی پرانے گناہ کو یاد کرنا اللہ کی مغفرت کی ناقدری یا اللہ کی بات پر یقین نہ کرنا بنتا ہے کہ اس نے نہیں مٹایا۔'' (حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اس کا گناہ ہی نہیں تھا۔بیہقی)۔توبہ کر کے ماضی کی فکر چھوڑو۔صرف حال کی فکر کرو۔صرف حال ہی حقیقت ہے جس میں اعمال ہونگے۔مستقبل کا پتہ نہیں کہ آئے یا نہ آئے۔''

ہم جب اس دنیا میں کسی دوسرے انسان سے غلطی کی معافی مانگ لیں اور وہ معاف کر دے تو کیا ہم اس سے پھر بھی وقتاً فوقتاً معافیاں مانگتے رہتے ہیں؟ اس کا جواب جب نفی میں ہے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے بعد بار بار معافی مانگنے کا کوئی جواز کسی بھی دلیل سے بنتا ہے؟

اصول: سوری کہنے اور توبہ کے بعد اور اپنی سوچ اور عادت بدلنے کے بعد

انسان دراصل ایک نیا اور پاک صاف آدمی بن جاتا ہے۔ جیسے کہ ہم حج کے بعد سمجھتے ہیں کہ سلیٹ بالکل صاف ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر اس کی یہ مثال دیتا ہے:

ایک آدمی نے قتل کر دیا تو اسے پندرہ سال کے بعد جب یہ بتایا گیا کہ اب وہ جسمانی لحاظ سے ایک نیا آدمی ہے کیونکہ اس کے باڈی سیل اتنے عرصے میں پورے تبدیل ہو گئے ہیں، اور روحانی لحاظ سے بھی اب نیا آدمی بن گیا ہے۔ جب اس نے یہ بات سمجھ لی کہ اب وہ پرانا آدمی نہیں بلکہ ایک نئے جسم کا مالک ہے اور وہ اب قاتل جسم والا نہیں رہا تو بہت ہی اچھا نیا انسان بن گیا۔''

A murderer learned to forgive himself

My explanation to him was that physically and psychologically he was not the same manwho shot his brother, since scientists inform us that every cell of our bodies changesevery eleven months. Moreover, mentally and spiritually he was a new man. He was now full of love and good will for humanity. The “old” man who committed the crime fifteen years before was mentally and spiritually dead. Actually, he was condemning an innocent man!This explanation had a profound effect upon him, and he said it was as if a great weight had been lifted from his mind. He realized the significance of the following truth in theBible:ISAIAH 1:18. Come now, let us reason together, saith the Lord: though your sins be as scarlet,they shall be as white as snow; though they be red like crimson, they shall be as wool.

اس فلاسفی کا پتہ لگنے کے بعد سے آپ فوراً یہ کریں کہ اگر کسی ماضی کے گناہ یا گناہوں کے احساس گناہ میں مبتلا ہیں تو پھر ایک ایک گناہ سے توبہ کرنے کے تمام مراحل سے گزر کر اپنے ذہن کو مطمئن کرتے جائیں کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو شعوری طور پر معاف کر دیں اور اس گناہ کو یہ سوچ کر بھول جائیں کہ اللہ

تعالیٰ کی ذات نے معاف کر دیا ہے۔ پھر دوسرے گناہ کے احساس کو بھی اسی طریقے سے ختم کر کے اپنے آپ کو اس گناہ کے لیے معاف کر دیں۔ اسی طرح سب گناہوں کے لیے توبہ کے بعد معاف کروالیں۔

آپ اپنی ماضی کی تمام غلطیوں اور گناہوں کے بارے رویہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ سکھانا تھا جس سے آپ کو سیکھ کر بہتر انسان بن جانا چاہیے تھا اور بس۔ اگر آپ نے اپنی کسی غلطی سے سبق سیکھ کر اپنے کو بہتر انسان بنالیا ہے تو پھر خوش ہو کر اپنے آپ کو اس اپنی غلطی کے لیے معاف کر دیں۔ جیسے آپ کسی پرانی جسمانی چوٹ کو پھر کبھی یاد بھی نہیں کرتے بلکہ ذہن میں آتی بھی نہیں، تو جسمانی چوٹ کی طرح، اس ذہنی چوٹ کو بھی ہمیشہ کے لیے بھول جائیں اور اس پر کڑھتے نہ رہیں۔ اگر دوسروں سے تکلیف پہنچنے پر سبق سیکھ لیا تو پھر اللہ جو کرانا چاہتا تھا اس نے کرلیا۔ تو دوسروں کو بھی یہ سوچ کر معاف کر دیں کہ شکریہ تمہارے ذریعے میں بہتر مسلمان بن گیا ہوں۔ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ کر اپنے کو معاف کر کے اپنے کو شاباش بھی دیں کہ جو اللہ تعالیٰ سکھانا چاہتا تھا سیکھ لیا ہے۔ یہی اسلام کا توبہ کا نظریہ ہے۔ جس کو نفسیاتی علاج کے ماہرین بھی استعمال کرتے ہیں۔

توبہ اگرچہ اللہ سبحانہ تعالیٰ سے ہی کی جاتی ہے مگر یہ سوشل معاملہ بھی ہوتا ہے اور ہونا چاہیے کیونکہ کسی بھی ملک اور نسل، رنگ، زبان یا مذہب کے انسان سے بھی گناہ یا زیادتی منسلک ہوسکتی ہے۔ تو اس کی تلافی خدا سے بھی ہوگی اور اس انسان سے بھی سوشل جذبے سے ہونی چاہیے تاکہ سوشل توازن بحال ہو جائے۔ اور انسانی تعلقات بہتر ہو جائیں اور دوستی ہو جائے اور دشمنی، کینہ کا خاتمہ کیا جائے جو کہ خدا تعالیٰ کا مقصد ہے جو قرآن کی آیت سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ تو اس آیت کی یہ معاشرتی application ہے اور یہی اپلائیڈ اسلام ہے جو ہمیں کلام پاک اور اسوۂ حسنہ سے سیکھنا ہے۔

توبہ یا غلطی سے سیکھ کر اصلاح میں چھ مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک بدو کے توبہ توبہ کے الفاظ ادا کرتے سن کو حضرت علیؓ نے فرمایا، یہ جعلی توبہ ہے۔ دل سے خالص توبہ

ایک سوچا سمجھا اور شعوری ارادے کا عمل ہوتا ہے جس کے چھ حصے ہوتے ہیں:۔

۱۔ کسی غلطی کا احساس کرنا اور پچھتانا۔اور اس کی تلافی کا سوچنا۔

۲۔ جو فرض نہیں نبھایا، تلافی کے طور اس کو ادا کرو۔

۳۔ اگر کسی کا حق مارا ہے، نقصان کیا ہے تو وہ واپس کرو۔

۴۔ اس شخص سے معافی مانگ لینا جس کو تکلیف دی ہے۔بے عزتی کی ہے

۵۔ پھر پکا ارادہ کرو کہ دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرو گے۔یعنی سبق سیکھ لیا ہے

۶۔ پورے دل سے توبہ کر کے اللہ کے ہو جاؤ تاکہ تم فرمانبرداری کی مشکل کا اندازہ کر سکو کیونکہ ابھی تک تم اپنی مرضی کرنے کی عیاشی کرتے رہے ہو۔

یہ یقین کر کے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے معاف کر دیا ہے اور اپنے آپ کو بھی معاف کر کے پر سکون ہو جائے جیسے کہ گناہ کیا ہی نہیں تھا۔سلیٹ صاف ہو گئی ہے۔

اپنے آپ کو معاف نہ کرنے کا نقصان

اگر آپ اپنے آپ کو معاف نہیں کرتے تو یہ ذہنی چوٹ کو یاد رکھنے کی بات ہو جائے گی، اور ذہن ہر وقت اسی احساس گناہ کی یاد میں کھویا رہے گا، اور نہ بھولنے سے زندگی میں مختلف روپ دھار کر سامنے آئے گی۔اس کی مثال ڈاکٹر نے یہ دی ہے کہ ایک آدمی ہر وقت کام میں مصروف رہتا تھا۔چاہنے کے باوجود وہ اپنی بیوی اور بچوں کو وقت نہیں دیتا تھا۔تو اسے جب بتایا گیا کہ کوئی احساس گناہ ہے جس کا اس کے اندر شور ہے، جس سے بچنے کے لیے وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے۔تو وہ مان گیا کہ ہاں، اس نے اپنے بھائی کو ایک بار دھوکہ دیا تھا جو اسے تنگ کرتا رہتا ہے۔تو اسے بتایا گیا کہ خدا تمہیں سزا نہیں دے رہا بلکہ تم خود اپنے آپ کو سزا دے رہے ہو۔جیسے آپ بجلی کی ننگی تار کو ہاتھ لگائیں گے تو شاٹ لگے گی۔اسی طرح آپ نے اللہ کے بنائے زندگی کے اصول کو توڑا تھا جس سے ذہنی اور روحانی چوٹ لگی تھی اور اس کی ظاہری شکل مختلف ہو کر مصروفیت کی شکل بن گئی تھی۔تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم اب بھی اسے دھوکہ دو گے تو اس نے کہا کہ

کبھی نہیں، میں نے سبق سیکھ لیا ہے کہ کسی کو دھوکہ دینا درست نہیں۔تو اس کو کہا گیا کہ جب تم نے سبق سیکھ لیا ہے کہ آئیندہ کسی کو دھوکہ نہیں دو گے تو احساس گناہ مٹا دو اور اپنے آپ کو معاف کر دو اور غلطی کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔ جب اسے بات سمجھ میں آ گئی تو اس کے تحت شعور نے بھی اس کو سمجھ کر ریکارڈ کر لیا اور اسے پھر یاد نہ دلایا تو اس نے نارمل زندگی گزارنی شروع کر لی۔

اسے یہ بھی بتایا گیا کہ خدا اسے سزا نہیں دے رہا تھا بلکہ وہ خود اپنے آپ کو سزا دے رہا تھا۔خدا نے تو اسے سبق سکھانا تھا کہ اپنے بھائی سے معافی مانگ لو۔اگر یہ سبق سیکھ لیتا تو اتنا عرصہ یہ ذہنی عذاب نہ سہتا۔

اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ تقدیر کے ذریعے انسان کو سبق سکھا کر بہتر انسان بنانے کے لیے اسے مختلف تجربات سے گزارا جاتا ہے، چاہے وہ خود غلطی کرے یا دوسرا اسے تکلیف پہنچا کر کرے۔اگر اللہ کی مشیت کی اور اس کے امتحان لینے کی یہ بات سمجھ میں آ جائے تو پھر ہر تجربے سے کچھ سیکھنا اور اپنے کو بہتر بنانا چاہیۓ۔کیونکہ یہ اس کی بھلائی کے لیے ہی اور درجات بلند کرنے کے لیے ہی کیا جاتا ہے

اصول: ''اگر توبہ بار بار ٹوٹتی رہے تو پھر کیا کریں۔''

اگر چہ خدا اور دنیاوی قانون کی فلاسفی یہ ہے کہ سزا اسے آئندہ حکم عدولی سے رک جائے اور وہی غلطی دوبارہ نہ کرے۔''اور وہ لوگ جو کوئی فحش کام کر لیں یا اپنی جانوں پر یا نفس پر ظلم کر بیٹھیں ،تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، کیونکہ اللہ کے علاوہ اور کون گناہ معاف کر سکتا ہے۔اور جان بوجھ کر اس پر اصرار بھی نہیں کرتے۔اور اس کا انہیں خیال بھی ہے۔''(Ghafir 40:7)

مگر انسان سبق نہ سیکھے تو وہی غلطی دوبارہ کر سکتا ہے۔جیسے ٹریفک کے قانون کے مطابق اگر کوئی سرخ بتی کراس کرے گا تو چالان ہوگا جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ چند بار کراس کرنے سے لائیسنس کچھ دیر کے لیے معطل ہو جائے گا۔یہی حال اللہ کے قانون توڑنے پر ہے۔اگر گناہ کے بعد توبہ کر لی تو ذہن صاف ہو گیا۔اگر وہی غلطی یا گناہ پھر ہو

گیا تو پھر ذہن پر بوجھ بنے گا تو پھر معافی مانگ لیں۔ تو اس مثال سے یہ سمجھ لیں کہ اللہ کا سزا دینے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسان کو خود اس کے اپنے ذہن کے ذریعے ہی سزا دیتا ہے۔ خود آ کر سزا نہیں دیتا۔ اسی کو پنجابی میں یوں کہتے ہیں کہ خدا خود آ کر لاٹھی نہیں مارتا بلکہ مت (عقل) مار دیتا ہے یعنی تحت الشعور ہی وہ جگہ ہے جس کے ذریعے اللہ سب کام کرتا ہے۔ تو ہم اسی ذہن کے ذریعے ہی اللہ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں، اس سے معافی مانگ سکتے ہیں اور معافی ملنے کا یقین بھی کر سکتے ہیں۔ اور جو کچھ اس سے مانگنا چاہیں، مانگ کر اس سے حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی کام کرنا چاہیں تو اللہ سے تحت الشعور کے ذریعے مدد لے کر سر انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ سے ون ٹو ون تعلق رکھنا چاہیے اور ہم رکھ بھی سکتے ہیں اور یہی ہے بھی صحیح طریقہ۔ اللہ تو رحمان و رحیم ہے۔ اس کو اپنے روبرو سامنے بیٹھا سمجھ کر بات کر کے تو دیکھیں کہ وہ فوراً جواب دیتا ہے کہ نہیں۔

توبہ بار بار ٹوٹنے کی وجوہات یہ ہیں: ۱۔ خوف ہو لیکن احتیاط نہ ہو: ایک شخص یوں تو کہتا ہے کہ اللہ رب تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور اس کے عذاب سے خوف زدہ بھی ہوں۔ لیکن وہ گناہوں سے بچنے میں کوئی احتیاط نہیں کرتا۔ تو اسے اس قول کا کوئی نفع نہیں ہوتا۔ **۲۔** شعوری ارادہ کے بغیر نیت کرے کہ گناہ پھر نہیں کرونگا یا زبانی استغفار کرے مگر ندامت اور شرمساری نہ ہو، کوئی انسان اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش تو طلب کرتا ہو لیکن اسے اپنے کردہ گناہوں پر کوئی ندامت، پشیمانی اور تاسف نہ ہو تو یہ بھی کارِ عبث ہے۔ ظاہری اعمال کی اصلاح ہو لیکن اصلاح باطن سے محروم ہو، یعنی کوئی شخص ظاہری طور پر تو بہت سرگرداں ہو لیکن اس کے اعمال کی باطنی جہت درست نہ ہو اور رضائے الٰہی کا خواستگار نہ ہو تو یہ بھی محض اپنے نفس کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔

معاف کیوں کرنا چاہیے؟ معاف کرنا کیسے سیکھیں؟

ذہنی سکون، صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے معاف کر دینے سے یہ حاصل ہو

جاتا ہے۔ ہر لمحہ نبدلہ لینے کی سوچ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بہت سی جسمانی بیماریوں کے پیچھے غلط اور منفی سوچیں ہوتی ہیں۔ معاف کرنے سے جسمانی بیماریاں بھی ٹھیک ہو سکتی ہیں۔

Resentment, hatred, ill will, and hostility are behind a host of maladies. Forgive yourself and everybody else by pouring out love, life, joy, and good will to all those who have hurt you. Continue until such time as you meet them in your mind and you are at peace with them.

تمام ذہنی بیماریوں، خلل دماغ کے پیچھے منفی سوچیں۔ جیسے شکایت، نفرت، بد نیتی، شک، دشمنی ہوتی ہیں جس سے ہی سوشل فساد پھیلتا ہے۔ ان کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر وقت ہر ایک کو جس نے کبھی بھی آپ کو تکلیف دی تھی، ان کو معاف کرنا سیکھیں۔ دوسروں کو معاف کرنے کی طرح اپنے آپ کو بھی اپنی غلطیوں، غلط سوچوں، کو معاف کرنا سیکھیں۔ لیکن یاد رکھیں آپ اپنے آپ کو تب تک معاف نہیں کر سکیں گے جب تک دوسروں کو معاف کرنا پریکٹس کی عادت نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہم عادت کے تحت ہی عمل کرتے ہیں۔ جیسے اللہ سبحانہ تعالیٰ کو شکریہ کہنے کی عادت بارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا اور جو تھوڑی چیز کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ بڑی چیز کا بھی شکریہ ادا نہیں کرتا۔“ (کنزالعمال-6482) اور لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ شکرگزار وہ ہے جو لوگوں کا زیادہ شکرگزار ہے۔ (کنزالعمال-6483)“ یعنی آپ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ بننا ہے تو پہلے لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کی عادت ڈالو، ہر وقت تھینک یو، آپ کی مہربانی کہنا سیکھو تو پھر اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو پہچاننے اور اس کو بھی تھینک یو کہنے کی عادت ڈالنی آسان ہو جائیے گی۔ تو ہر وقت دوسروں کو معاف کرنے کی عادت ڈالیں تو تبھی اپنے کو معاف کرنے کی عادت پڑے گی۔ دوسروں کو یا اپنے آپ کو معاف نہ کرنا سوائے روحانی تکبر یا جہالت کے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ذہنی سکون بارے ایک مقولہ سنیں:

peace of mind is a beautiful gift, which we can give

only to ourselves, just by expecting nothing from anyone.

جب بھی ماضی کی تکلیف دہ یادیں ذہن میں آئیں تو آپ پرامن رہیں اپنے آپ کے بارے اچھے انسان ہونے کا سوچیں اور اپنے آپ کو بھی پسند کریں اور محبت کریں۔ تبھی اپنا خیال رکھ سکیں گے۔ اگر اپنے آپ کو بُرا، گناہ گار یا غلطیاں کرنے والا سمجھیں گے کہ غلطیاں کرتے رہتے ہو تو پھر ایسے ہی ہو جاؤ گے۔

میڈیکل کیسز میں دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ بدسلوکی، دھوکہ دہی، عزت نفس کو نقصان پہنچایا گیا ہو تو اس سے ہی ان میں نفرت اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ہر وقت جلتے، کڑھتے، انتقام لینے کے طریقے سوچتے رہنے سے ان کے ذہن میں فکری زخم پیدا ہوتے ہیں۔ اور غصہ، شکایات، الزام تراشی، غم، کینہ، دشمنی، کی وجہ سے ہی کئی بیماریاں بشمول جوڑوں کا درد، دل کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ ایسے مریضوں میں ان کے علاج میں صرف ایک ہی دوائی ہوتی ہے کہ وہ کھلے دل سے سب کو معاف کر دیں۔ یہ سوچ کر کہ وہ خود اپنے اور اپنی فیملی کے لیے زیادہ اہم ہوں۔ دوسروں کو ذہن میں رکھ کر کیوں دکھ اٹھاؤں۔ ہومیوپیتھی میں یہ فلاسفی ہے کہ سوچوں سے ہی بیماری کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان ہی علامات کو دور کر دیا جائے تو بیماری دور ہو جائے گی۔

16. Forgiveness is necessary for healing and when ye stand praying, forgive, if ye have thoughts against any . . . MARK 11:25.

بائبل کی نصیحت بھی معاف کرنے کی ہے۔ ''جب آپ نماز پڑھنے یا دعا مانگنے کے لیے کھڑے ہوں تو سب کو معاف کر کے کھڑے ہوں۔'' (بائبل۔ مارک۔۱۱؛۲۵) اس سے اندازہ لگا لیں کہ اللہ تعالیٰ ہر مذہب میں انسانوں کو معاف کرتے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی لیے دعاء مانگنے سے پہلے صدقہ خیرات یا دوسروں کو معاف کرنے کی ہدایت ہے۔

سچائی: معاف کرنا دراصل دوسروں سے محبت ہونے یا پیدا کرنے کی نشان ہوتی ہے۔ہم ہمیشہ ان کو دل سے معاف کرتے ہیں جن رشتوں،تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں آپ خود بھی اور دوسرے بھی امن اور سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔

18.Forgiveness is love in action

The essential ingredient in the art of forgiveness is the willingness to forgive.

خلوصِ دل سے معاف کرنے کا ارادہ، اور آمادگی ہی معاف کرنے کی شروعات ہوتی ہیں ۔جس سے معاف کیا جا سکتا ہے۔کسی کو معاف کر دینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان کو پسند کرنا شروع کر دیا جائے۔یا آپ کو اس سے ملنا جلنا شروع کر دینا چاہیے۔کوئی بھی کسی کو پسند کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔مگر ہم دوسروں کو انسان ہونے کے ناطے برداشت کر سکتے ہیں۔اس کی مثال نبی کریم ﷺ کی ہے کہ آپ نے اپنے چچا کے قاتل حبشی کو معاف کر دیا تھا مگر اسے کہا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔تو حبشی نے اپنی غلطی کا بدلہ چکانے اور احساس گناہ سے بچنے اور نبی کریم ﷺ کی محبت حاصل کرنے کے لیے ہی ایک جھوٹے نبی کو اسی طرح جنگ میں قتل کیا تھا جیسے اس نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا تب جا کر اسے بھی تسلی ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو معاف کیا۔

معاف کرنے سے آپ کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہوتے یا کمزوری نہیں دکھا رہے ہوتے بلکہ اپنے سے ہی بھلائی کر رہے ہوتے ہیں یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خودغرضی سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔ایسی خودغرضی آپ کا حق ہے۔

ایک مقولہ ہے: ”جو پہلے معافی مانگ لے وہ بہادر ہے، جو معاف کر دے وہ اندر سے مضبوط ہوتا ہے۔جو معافی مانگنے کے بغیر معاف کر دے وہ سب سے زیادہ خوش رہنے والا ہوتا ہے۔“

سچائی:۔دینے والا ہاتھ دینے والے سے بہتر ہوتا ہے۔

To forgive is to give something for. Give love, peace, joy, wisdom, and all theblessings of life to the others,

until there is no sting left in your mind. This is really the acid test of forgiveness.

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے تو معافی دینے کا مطلب یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کسی کو کچھ چیز دے رہے ہیں یعنی کہ تم نے مجھے برائی دی، اسکے بدلے میں، میں تمہیں محبت، پیار، خیال دوبارہ دینے کا وعدہ کرر ہا ہوں تا کہ جیسے تمہارے لیے پہلے اچھے خیالات تھے ویسے ہی پھر سے رکھوں گا۔اسی کو دل سے معاف کرنا کہتے ہیں۔اسی طرح اپنے آپ کو بھی معاف کرنا سیکھیں کہ میں نے قانون توڑنے کی غلطی کی تھی تو اب دوبارہ نہ توڑنے کا عہد کرلیا ہے اور چونکہ مجھے اپنے آپ سے بھی محبت ہے اور اپنی فیملی سے بھی محبت ہے، اس لیے میں اپنے آپ کو بھی معاف کرر ہا ہوں کیوں کہ میں ہی اپنے کو معاف کرسکتا ہوں دوسرا کوئی نہیں کرسکتا۔اس سے مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ میرا ذہن صاف ہوکراور دوسرے کاموں کے لیے پوری طرح تیار ہو جائے گا۔اور میں اپنی فیملی کے ساتھ محبت سے وقت گزار سکوں گا۔

معاف کیسے کیا جائے، اس کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

Technique of forgiveness

The following is a simple method, which works wonders in your life as you practice it: Quiet your mind, relax, and let go. Think of God and His love for you, and then affirm, "I fully and freely forgive (mention the name of the offender); I release him mentally and spiritually. I completely forgive everything connected with the matter in question. I am free, and he/she is free. It is a marvelous feeling. It is my day of general amnesty. I release anybody and everybody who has ever hurt me, and I wish for each and everyone health, happiness, peace, and all the blessings of life. I do this freely, joyously, and lovingly,

and whenever I think of the person or persons who hurt me, I say, 'I have released you, and all the blessings of life are yours.' I am free and you are free. It is wonderful!"

اس کے آسان طریقہ کی پہلے تھیوری سمجھ لیں۔ ہماری ساری سوچیں ذہن کے تحت الشعور میں ریکارڈ ہوتی رہتی ہیں۔ جب کوئی بات یا واقعہ ہوتا ہے تو وہ تحت الشعور کو ٹرگر trigger کر شعور میں لے آتا ہے تو پرانی باتوں کی یاد پھر سے سامنے آ جاتی ہے اور اس کے بدلے پھر سے اچھا یا بُرا ردِعمل شروع ہو جاتا ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ پرانی ناخوشگوار یادوں یا ردِعمل کو ہمیشہ کے لیے ذہن سے صاف کر دیا جائے۔ اس کا طریقہ بڑا سادہ ہے۔ جیسے کہ سکول میں سبق یاد کرنے کے لیے رٹا لگاتے ہیں۔ اور وہ باتیں تحت الشعوور کا ذہن ہمیشہ کے لیے یاد کر لیتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ سبق شعور میں واپس آ جاتا ہے اور اس کی روشنی میں ہم نئے فیصلے کر سکتے ہیں جیسے کہ حساب کے پہاڑے ہوتے ہیں۔ تو تحت الشعور کی پرانی ریکارڈنگ کو ختم کر کے نیا پیغام ریکارڈ کرنے کے لیے بھی رٹا لگانے کا طریقہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ذہن کو دوبارہ پروگرام کرنے کے لیے نیا پیغام بار بار یاد کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ پرانا ریکارڈ مٹ جائے اور نیا پیغام ریکارڈ ہو جائے۔

اس کے لیے آپ کسی خاموش پرسکون جگہ پر بیٹھ جائیں اور آنکھیں بند کر کے توجہ مرکوز کریں اور اپنے آپ سے اونچی آواز میں بات کریں۔ " پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں اس کے رحمان اور رحیم ہونے کا اعتراف کریں یعنی یا رحمان و یا رحیم و یا کریم چند بار کہیں اور پھر مثبت سوچ کے ساتھ کہیں کہ میں نے فلاں شخص (نام لے کر کہیں) کو پورے خلوص دل سے معاف کر دیا ہے اللہ تُو بھی اسے معاف فرما۔ میں نے اسے اپنے ذہن سے آزاد کر دیا ہے اور اس نے جو زیادتی کی ہے اسے بھول گیا ہوں اور میں اس شخص بارے برے جذبات سے آزاد ہو گیا ہوں اور وہ بھی اللہ کے ہاں آزاد ہے۔ اس سے چونکہ مجھے سکون، امن اور خوشی ملی ہے، اس لیے میں آج تک جس کسی نے

بھی مجھے تکلیف دی ہے یا نقصان پہنچایا ہے ان سب کو معاف کرتا ہوں۔ یہ عام معافی کا اعلان ہے میری طرف سے اور میں ان سب کے لیے نیک جذبات کا اظہار کرنے کے ساتھ دعاء بھی کر رہا ہوں کہ وہ خوش رہیں۔'' یہ سبق روزانہ کئی بار یاد کریں۔ آہستہ آہستہ اس شخص کی یاد آنی کم ہو جائے گی۔ عموماً چالیس دن یہ نیا سبق یاد کرنے سے پرانی ریکارڈنگ مٹ جائے گی۔''

اس کے بعد جب بھی وہ شخص یاد آئے تو کہیں کہ بھئی تمیں تو میں نے کب کا معاف کر کے آزاد کر دیا ہے۔ اس لیے تم بھی آزاد ہو اور میں بھی آزاد ہوں۔ تمہیں میری یاد میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ہر بار یہ دہرائیں تو چند دفعہ کے بعد اس کا خیال آنا بند ہو جائے کیوں کہ تحت الشعور سمجھ جائے گا اور اس میں یہ پیغام پکا ریکارڈ ہو جائے گا، یعنی پرانا سبق حذف ہو کر اسے نیا سبق یاد ہو جائے گا۔

اسلامی لحاظ سے یہ طریقہ اس آیت پر عمل ہی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (۳۴۔۴۱) ''اچھے اعمال اور برے اعمال برابر نہیں ہو سکتے۔ برائی کو اچھے عمل سے دور کرو تو جس سے دشمنی ہو وہ تمہارا دوست بن جائے گا۔''

اگر نیت ٹھیک رکھیں کہ اللہ کا حکم ہے کہ برائی کے بدلے بھلائی کرنی ہے تو پھر شوق سے معاف کر دیں گے کہ جب بھی کسی ناپسندیدہ شخص کا خیال آئے تو اس کے لیے بُرا چاہنے کے بجائے اسے دعا دیں کہ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں تمہارے لیے دعا گو ہوں وغیرہ۔

20.The great secret of true forgiveness is that once you have forgiven the person, it is unnecessary to repeat the prayer. Whenever the person comes to your mind, or the particular hurt happens to enter your mind, wish the delinquent well, and say, “Peace be to you.” Do this as often as the thought enters your mind. You will find that after a few days the thought of the person or experience will return less and less often,

until it fadesinto nothingness.

ڈاکٹر نے یہ بہت اہم بات کی ہے کہ جب آپ نے کسی شخص کو معاف کر دیا ہے تو پھر بار بار دعا مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب بھی اس شخص کا یا اس کی دی ہوئی تکلیف ذہن میں آئے تو صرف اسے نیک خواہشات کا پیغام دیں۔تو وہ خیال سے غائب ہو جائے گا۔اس طرح کئی بار کرنے سے پھر خیال آنا بند ہو جائے گا۔

یہی طریقہ اپنے آپ کو معاف کرنے کے لیے استعمال کریں تا کہ ہر وقت اپنے ذہن کو منفی سوچوں سے صاف، پرامن اور پرسکون رکھ سکیں اور کام میں پوری توجہ سے فکری کام کر سکیں۔اور لائف انجوائے کر سکیں۔

حضور اکرم ﷺ کو بھی چونکہ اللہ کا پیغام پہنچانے کا کام ہر چیز سے زیادہ اہم تھا، بجائے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلط باتیں ذہن میں رکھنے کے۔تو وہ ہمیشہ فوراً دوسروں کی غلطیاں اور زیادتیاں معاف فرما دیتے تھے۔اور ساتھ ہی فرماتے تھے کہ اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔ہمیں بھی ان کی اس سنت پر عمل کرنا سیکھنا چاہیے اور بچوں کو بھی سکھانا چاہیے کہ جب معاف کریں تو یہ بھی کہیں کہ اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔

آپ ذرا غور کریں تو روزانہ نئے اور مختلف ذہن، عادات، رویوں کے نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ان کا کام آپ کے لیے یا تو کچھ کام کرنا ہوتا ہے یا پھر اپنی باتوں رویوں سے کچھ سبق سکھانا ہوتا ہے۔ جب ان کے ساتھ تجربے سے کچھ سیکھ لیا تو ان کو بھول جائیں اور ان کو اہمیت نہ دیں۔اہم چیز آپ خود ہیں۔یا جن گھر والوں کی ذمہ داری آپ کے پاس اللہ نے دی ہے۔دوسرے لوگوں کو بس اتنی ہی اہمیت دیں جتنی ضروری ہے۔

اگر آپ کسی چیز کے لیے اللہ سے ہدایت اور رہنمائی مانگیں تو وہ جو دے دے خوشی سے لیں کہ اسی میں بہتری ہوگی۔ یہ رویہ ہو تو پھر اپنی غلطیوں پر افسوس نہیں ہوتا۔

When you pray for guidance and right action, take what comes. Realize it is good andvery good. Then there is no cause for self-pity, criticism, or hatred.

کیا ٹیسٹ یا ثبوت ہو سکتا ہے کہ واقعی آپ نے کسی کو یا اپنے آپ کو معاف کر دیا ہے؟

اگر کوئی کسی شخص بارے کوئی اچھے الفاظ کہے اور آپ کو اچھا نہ لگے تو یہ ثبوت ہو گا کہ آپ نے اسے ابھی تک دل سے معاف نہیں کیا۔ جیسے جسمانی چوٹ کی یاد آئے تو اس کے ذکر سے جسم میں درد نہیں ہوتا تو یہی انسانوں کے ساتھ ہونا چاہیے کہ کسی کی یاد سے دل میں درد نہ ہو۔ اس لیے نفسیاتی یا روحانی طور سے ایسی یاد سے نیک خواہشات کا پیغام دے کر ڈیل کریں

The acid test for forgiveness There is an acid test for gold. There is also an acid test for forgiveness. If I should tell you something wonderful about someone who has wronged you, cheated you, or defrauded you, and you sizzled at hearing the good news about this person, the roots of hatred would still be in your subconscious mind, playin havoc with you.

اصول:۔ ”دوسروں کو یا اپنے آپ کو کتنی بار معاف کرنا چاہیے؟“

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق ایک آدمی نے نبی کریم سے پوچھا کہ مجھے دن میں اپنے ملازم کو کتنی بار معاف کرنا چاہیے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ملازم یا خدمت گار کو دن میں ستر دفعہ معاف کرو۔ (سنن ترمذی۔۱۹۴۹۔حسن)

حضرت عیسیٰؑ کی بھی یہی ہدایت تھی کہ ”ستتر بار معاف کرو۔“

Matthew 18:21؛21Then Peter came to Jesus and asked, “Lord, how many times shall I forgive my brother who sins against me? Up to seven times?” 22Jesus answered, “I tell you, not just seven times, but seventy-seven times!…

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو یہی تعلیم دے کر بھیجا تھا کہ

ہر ایک کو معاف کرتے رہو۔ کیونکہ معاف کرنا اللہ تعالیٰ کی اپنی سنت ہے کیونکہ وہ مخلوقات کو اپنی فیملی کہہ کر ہر وقت معاف کرتا رہتا ہے۔ ہم کو بھی اپنے پیاروں کو ہر بار معاف کر تے رہنا چاہیے اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ہم بھی اس کی سنت پر عمل کرتے ہوئے انسانوں کو معاف کرتے رہا کریں۔

سبق

اس کتاب کی اب تک تمام بحث سے اسلامی فلاسفی جیسے مجھے سمجھ آئی ہے، وہ میں آپ سے شیئر کرر ہا ہوں جو یہ ہے۔

ا۔ انسانوں کا گھر جنت تھا اور اب بھی ہے۔ انسانوں کو نافرمانی کرنے پر جنت کی دنیا سے نکال کر زمین کی دنیا پر بھیجا جانا سزا کے طور پر ہے۔ یہ دنیا بھی چونکہ اللہ ہی کی ملکیت ہے۔ اسی لیے اس دنیا کو جیل خانہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ سزا کسی جیل میں ہی بھگتنی ہوتی ہے۔

۲۔ اس دنیا میں انسان کا مقصد پھر یہ ہونا چاہیے کہ میں نے جیل کاٹ کر کے پھر واپس اپنے گھر یعنی جنت کو جانا ہے۔ جس کے لیے اللہ نے یہ شرط رکھی ہے کہ اسے اس دنیا کے جیل خانہ میں اللہ کے قانون اور رولز کے مطابق رہنا ہے۔ اگر ٹھیک رہا تو جلد جنت کے گھر واپس چلا جائے گا۔ اگر جیل میں بھی ڈسپلن خراب رہا تو سزا بڑھ بھی سکتی ہے جو جہنم میں جا کر مزید سزا بھگتے گا۔

۳۔ یہ دنیا کھیتی قرار دی گئی ہے کہ اس میں اچھے اعمال بوتا ہے یا برے۔ کیونکہ اس اعمال کی کھیتی کا پھل یا اس کی فصل اگلے جہاں میں ملے گی۔ یہاں نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے سسٹم اتنے اچھے ہونے چاہئیں کہ دنیا جنت بن جائے، ہر چیز ٹھیک اصول پر مبنی ہو۔ سلامتی ہو، امن سکون ہو۔ جان، مال، عزت محفوظ ہو۔ ہر ایک کے حقوق ادا ہوتے ہوں۔ تا کہ ان کا پھل اگلے جہاں مل سکے اور اپنے گھر جنت جا سکے۔

۴۔ اعمال کے اچھے بُرے ہونے کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ بُرے لوگوں کو بھی یہاں کی رہائش کے لیے ضرورت کی چیزیں ملتی رہی گی جیسے اچھے لوگوں کو بھی ملتی ہیں۔اس دنیا کے لیے انسانیت کی برابری کی بنا پر سلوک کیا جاتا ہے۔

۵۔ اس لیے اس دنیا میں مرنے تک اپنے آپ کو اور اس دنیا کے سسٹمز کو بہتر سے بہترین بنانے کا موقع اللہ فراہم کرتا رہے گا کہ غلطیوں سے سیکھ کر بہتر انسان بنتے جائیں۔ وہ ڈھیل کا اصول استعمال کرتا ہے۔لوگوں کی نافرمانی پر ردعمل کے طور فوری سزا نہیں دیتا جیسے ہم فوراً سزا دیتے ہیں۔

۶۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اپنی غلط سوچوں اور ان کے نتیجے میں اعمال کی اصلاح اور معافی مانگنے کا چانس مرنے تک دیتا ہے۔ اس کو استعمال کر کے کسی بھی وقت جب احساس ہو جائے تو توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کردے گا۔

۷۔ جب انسان توبہ کرلے اور وہ برا کام پھر نہ کرے تو اسے اللہ کی بات پر یقین ہو جانا چاہیے کہ اللہ نے اسے معاف کر دیا ہے۔اور اپنے ذہن سے اس گناہ کا خیال اسی طرح مٹ جانا چاہیے جیسے کہ جسمانی چوٹ ٹھیک ہو جائے تو اس کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔اور ذہنی امن سکون آ جانا چاہئے۔

۸۔ احساس گناہ ہوتے رہنا صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہمیں اس ترتیب اور تفصیل سے اوپر والی فلاسفی کا علم نہ ہونے سے ہوتا ہے۔اس غلطی کو بار بار یاد کرنا ہی اپنی ذہنی دنیا کو جہنم بنانا ہے۔ جبکہ اللہ کا جہنم یہاں نہیں ہے آخرت میں ہے۔اللہ تعالیٰ جب معاف کر دیتا ہے تو اس کا مطلب ہی جہنم سے خلاصی ہے تو پھر ذہنی جہنم سے بھی خلاصی کر لینی چاہئے۔یہی رحم اور انصاف بھی ہے۔

۹۔ ہمارا مقصد اس دنیا کو جنت مثل بنا دینا ہے جو صرف بہترین کردار، اخلاق، حقوق العباد کی ادائیگی۔ دوسروں سے لین دین میں بہترین معاملات سے امن، سلامتی، محبت، رحمت پیدا کرنا ممکن ہوتا ہے۔اس لیے اس کتاب کے مندرجات پر ہر ایک کو خود تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہیے اور پھر عمل کریں۔ یہ

ہمیں دنیا کا حسنہ اور آخرت کا حسنہ حاصل کرنے میں مدد دے گا۔

۱۰۔ ہماری ترجیحات میں سب سے پہلے اللہ کی تمام مخلوقات انسانوں، جانوروں، پرندوں، نباتات، سب سے بہترین سلوک شامل ہونا چاہئے۔انسانوں کا خیال رکھنا ہی اللہ کا خیال رکھنا اور اس سے محبت ہے۔اللہ کی مخلوقات کا خیال رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ آپ کسی کے بچوں سے محبت کریں تو وہ آپ سے محبت نے لگتا ہے۔آپ اللہ کی عیال کا خیال رکھیں گے تو وہ آپ سے محبت کرے گا۔اور محبت کرنے والے معاف کرتے رہتے ہیں۔

☆......☆......☆

۵۷۔مفت خوری کی اسلام میں اجازت نہیں۔

ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کا آخرت میں اجر ملے گا تو اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہی اصول کیوں نہیں ہے؟

بیک گراؤنڈ:۔ راولپنڈی میں میرے جاننے والے ایک مولوی صاحب جن کے تین بچے ہیں اوران کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مسجد کے علاوہ ایک دکان پر بھی کام کرتے ہیں، کہنے لگے کہ میں فی سبیل اللہ قرآن پڑھانا چاہتا ہوں تو مجھے سمجھانا پڑا کہ قرآن پڑھانا ایک درسی اور دنیاوی عمل ہے، نہ کہ مذہبی، جیسے کہ کسی سکول میں ٹیچر کی تنخواہ ہوتی ہے ایک دو ہزار روپے فی مضمون کی ٹیوشن فیس تو آپ کو کلام پاک پڑھانے کے لیے بھی لوگ آپ کی محنت کا صلہ کیوں نہ دیں۔ آپ ان کو مفت خوری کی عادت کیوں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی کوئی غریب ہو تو نہ لیں۔

جب آخرت میں اللہ تعالیٰ ہر عمل کا حساب کرے گا اور چاہے وہ کتنا چھوٹا ہی عمل کیوں نہ ہو اس کا اجر دے گا۔ (سورہ زلزال؛99۔8,7) ۔پس جو کوئی (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔آیت۔ اللہ تعالیٰ چھوٹی سے چھوٹی نیکی پر چاہے ایٹم کے برابر ہو گا اجر دے گا۔اس سے دنیا کی زندگی میں بھی یہی سوشل اصول ہونا چاہیے اور لاگو ہونا چاہیے کہ کسی سے چھوٹا کام بھی کروائیں تو اس کی قیمت ادا ضرور کریں۔ کیونکہ اس نے آپ کے لیے وقت دیا، جسمانی محنت کی۔ ہمارے یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لو اتنا سا تو کام تھا۔اس کی اجرت کیا دینی۔

اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں بڑے واضح الفاظ میں بتایا ہے **"اور جب تمہیں**

سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو۔'' (النساء 86) سورہ رحمان: **هل جزاء الاحسان الا الاحسان**: احسان (کوئی نیکی، بھلائی، اچھے کام) کا بدلہ احسان کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔؟ اس سے یہ سوشل اصول نکلا کہ انسانی تعلقات کی بنیاد دوطرفہ برابری پر ہوتی ہے یعنی reciprocation پر مبنی ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں۔ امریکن اس کو یوں کہتے ہیں you scratch my back,I will scratch yours.۔ مغربی دنیا میں کوئی چیز فری نہیں ملتی بلکہ زندگی میں دیکھیں تو محبت بھی فری نہیں ملتی اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ چاہے پیسے کی شکل میں نہ ہو تو فرمانبرداری کی شکل میں ضرور ہوتی ہے۔ شادی پر جو کھانا کھاتے ہیں اس کی بھی ایک طرح سے قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

کلام پاک مفت پڑھانے کی غلط سوچوں کی وجہ کیا ہے؟

''ایک وقت یہ تھا کہ لوگ کسی خدمت کے معاوضے میں تنخواہ لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اس کو زہد و تقدس کے خلاف سمجھتے تھے۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح کسی واعظ کو اگر کہا جائے کہ وہ اپنی خدمتوں کو باقاعدہ انجام دیں اور پھر مشاہرہ بھی لیں تو ان کو ناگوار ہوگا لیکن نذ و نیاز کے نام سے جو رقمیں ملتی ہیں ان سے ان کو احتراز نہیں ہوتا۔ بات ایک ہی رہتی ہے۔''

حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی بہت سے لوگ اسی غلطی میں مبتلا تھے لیکن یہ امر سوشل اور انتظامی اور تمدن کے اصولوں کے خلاف تھا کیونکہ کسی کو مفت خوری کی عادت اپنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا صلہ ملنا ضروری ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ کی بڑی کوشش سے اس غلطی کو رفع کیا گیا اور تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ ایک موقع پر حضرت ابوعبیدہؓ نے جو مشہور صحابہ اور سپہ سالار تھے، حق الخدمت لینے سے انکار کر دیا تو حضرت عمرؓ نے بڑی مشکل سے راضی کیا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ اے عمرؓ! تم رسول اللہ کے اصحاب کو دنیا میں آلودہ کرنا چاہتے ہو تو انہوں نے

جواب دیا کہ میں ان بزرگوں سے مدد نہ لوں تو کس سے لوں۔ اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے تجویز دی کہ اگر ایسا ہی ہے تو تنخواہیں بیش قیمت مقرر کرو تا کہ لوگ خیانت کی طرف مائل نہ ہوں۔ حکیم بن حزامؓ نے حضرت عمرؓ کے بار بار اصرار پر بھی کبھی روزینہ یا وظیفہ لینا گوارہ نہ کیا۔ (الفاروق، شبلی۔ ص 188)

تجزیہ ۔ جن حضرات نے تنخواہ یا وظیفہ نہیں لیا تھا وہ بھی دراصل صلہ ہی لینا چاہتے تھے مگر آخرت میں۔ ہر انسان اپنے ہر اچھے عمل کا صلہ ضرور چاہتا ہے چاہے یہ صرف تعریف کے الفاظ ہی کیوں نہ ہوں۔

صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے؟ ہر دنیاوی کام میں کسی کا وقت اور محنت شامل ہے۔ اسلامی انقلاب کے دوران ایثار و قربانی کی ضرورت تھی اس لیے ہر ایک کام کا صلہ آخرت کے لیے رکھتا تھا مگر جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتوحات سے مال کی فراوانی ہوگئی تو انہوں نے بالکل درست فیصلہ کیا تھا کہ تحریک اسلامی کے ابتدائی دور کی عادات کو بدلنے کی ضرورت ہوگئی ہے اور نارمل زندگی گزاری چاہیے۔ اس لیے انہوں نے تنخواہ کا سسٹم لاگو کیا۔

ہمارے دور میں اس کی مثال یہ ہے کہ چین کے انقلاب میں ایک پوری نسل نے ایثار اور قربانی سے کام لیا مگر دوسری نسل تک معاشی ترقی اس حد تک ہو چکی تھی کہ نارمل زندگی گزارنی شروع کر دی۔

ہم پاکستانیوں کا پرابلم یہ ہے کہ ہم کو بچپن سے ہی تربیت مفت خوری کی دی جاتی ہے۔ بچوں سے کوئی کام کروالو اور تھینک یو بھی نہ کہو کہ یہ ان کا فرض ہے۔ کسی غریب سے کام کروالو اور پیسے نہ دو کہ کیا کر لے گا۔

اوپر سے لے کر نیچے عام آدمی تک جہاں جس کا بس چلتا ہے تو ہر چیز حکومت سے مفت حاصل کرنا چاہتا ہے مگر اس کے بدلے اس ملک کو کچھ نہیں دینا چاہتا۔ ہمارے یہاں سب سے زیادہ مفت خور سیاسی لوگ ہیں۔ صدیوں سے مفت خوری کر رہے ہیں، جو ہر سہولت چاہتے ہیں عزت چاہتے ہیں پروٹوکل چاہتے ہیں مگر اس کے بدلے عوام

کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہتے، عوام کے ٹیکسوں سے ہر قسم کی عیاشی کرتے ہیں۔ مگران کے ہی پیسوں سے سڑک بنا دیں تو عوام پر ہی احسان جتاتے ہیں۔

ہم جنت جانا چاہتے ہیں مگر اس کے حاصل کرنے کی قیمت، جو کہ بہترین کردار، حقوق العباد کی ادائیگی، بہترین لین دین کے معاملات ہیں، ادا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس کا آسان حل یا شارٹ کٹ ہم نے یہ ڈھونڈا ہے کہ کسی کو دین کی بات بتا دو۔ اس نے عمل کرلیا تو ہمیں مفت میں ثواب ملتا رہے گا۔

مفت خوری کی دوسری مثال دیکھیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کوئی ادارہ پیسے کے بغیر نہیں چل سکتا۔ کسی بھی کلب کے ممبر بن جائیں تو ممبر شپ کے ہر ماہ پیسے دینے ہوتے ہیں۔ مگر مسجد کی سہولت استعمال کرتے ہیں مگر اس دارے کو چلانے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق خود سے ہر مہینے مدد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کم از کم ہر نمازی کو ہر جمعہ کو تو دینے چاہئیں۔ کینیڈا کے ہسپتالوں میں جو بزرگ شہری والنٹیئر کام کرتے ہیں ان کو بھی hourarium دیا جاتا ہے جیسے کھانا یعنی ان کا والنٹیئر ورک بھی مفت خوری کی نظر نہیں کیا جاتا۔

سبق:

ہمیں چاہیے کہ شعوری طور پر فیصلہ کریں کہ ہم مفت خوری کی عادت سے جان چھڑا لیں گے۔ اس پر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اپنانا آسان ہے کیونکہ فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی آپ کا کام کرے تو کم سے کم صلہ تو فوری تعریف کر دینا بنتا ہے۔

☆......☆......☆

۵۸۔آداب کی ٹریننگ دینا اور عادات ڈالنا بھی سنت ہے

حدیث: ایوبؓ بن موسیٰ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ **"کسی اولاد والے نے اپنی اولاد کو کوئی چیز ایسی نہیں دی جو آداب سے بڑھ کر ہو۔"** (ترمذی بیہقی مشکوٰۃ)

حدیث پاک ہے (کنز العمال۔نمبر 7349) "جب تم کسی پہاڑ کے بارے سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اس کی تصدیق کرو مگر جب یہ سنو کہ کسی شخص نے اپنی عادت چھوڑ دی ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو، اس واسطے کہ وہ وہی کرے گا جو اس کی عادت ہے۔" (مسند احمد۔عن ابوالدرداؓ)

بنیادی آداب کی اہمیت

آداب ظاہری برتاؤ کے وہ رسمی طور طریقے ہیں جو ہر ایک کیلئے دلکش ہوتے ہیں۔ اس لیے سب کیلئے لازمی قرار دیئے جاتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ اچھا لگتا ہے کہ دوسرے اسے مہربانی کہہ کر چیز مانگیں تو اسے خود بھی اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اس طرح جب آداب ہر ایک کی عادت بن کر ہمہ گیر ہو جاتے ہیں تو کم از کم بیرونی سطح پر ہر ایک سب کے لیے قابل قبول بن جاتا ہے۔ اس سے باہمی برتاؤ میں قدم قدم پر باہمی اطمینان اور سکون نمودار ہوتا ہے۔ تمیز داری کے یہ رسمی طریقے جب ہر انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں تو ان کا اثر محض ظاہر تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ یہ آہستہ آہستہ تعاون اور ہمدردی کے اخلاقی جذبات اور احساسات کو چھوتے ہوئے دل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اچھے یا برے Manners ہی اخلاقیات یا اخلاقی قدروں کو جلا بخشتے ہیں یا ان کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔

آج کل آداب کا کمال اور نمونہ وہ ساری مغربی قومیں ہیں جو کسی وقت خود غیر مہذب تھیں مگر اب انہوں نے گھر سے لے کر باہر کی زندگی کو مکمل طور پر ایک سٹینڈرڈ بنا کر ہر ایک کا رویہ predictible بنا کر باہمی حسن سلوک سے انسانی میل ملاپ کو پُرلطف بنا دیا ہے۔ جہاں دل آزاری ختم اور نارمل زندگی میں تعاون عادت بن چکا ہے۔ اس ترقی کی وجہ یہ ہے کہ ان قوموں کی ترجیحات میں قومی آداب سرفہرست ہیں۔ سکولوں میں آداب تعلیم کا ناگزیر حصہ ہیں۔ بڑے بڑے ادارے قائم ہیں جو ہر زاویہ سے آداب کی تحقیق میں ہمہ تن مصروف ہیں اور ان کے کتب خانوں میں بھی آداب کے خانے نمایاں ہیں۔

ان قوموں نے اہم ترین انسانی آداب کو سب کیلئے یکساں اور آٹومیٹک کر دیا ہے۔ اس میں امیر غریب اور چھوٹے بڑے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک مزدور بھی ہر سطح کے انسان کے ساتھ مہذب انداز میں اٹھ بیٹھ سکتا ہے۔ ہمارے یہاں مہذب ہونا بھی صرف بڑے طبقات کا امتیاز گنا جاتا ہے مثلاً انگلش میڈیم میں پڑھنے والے ایک دوسرے کو برا کہنا ہو تو کہتے ہیں، یو بدتمیز اردو میڈیم۔ یعنی آداب بھی کلاس سسٹم کا حصہ بن گئے ہیں۔

ان قوموں کے لیڈران نے مہذب ہونا ہر آدمی کا حق بنا دیا ہے جو کہ مساوات کی پریکٹس سے ممکن بنتا ہے۔ یہ ان کی بلند خیالی، خلوص نیت اور Social Engineering کا کمال ہے۔ کیا حضور اکرم ﷺ نے مساوات کی پریکٹس سے اجڈ بدوؤں کو تہذیب یافتہ نہیں بنا دیا تھا جنہوں نے اسلامی تہذیب اور کلچر کی بنیاد رکھ دی تھی۔

قومی سطح پر ہم سب مساوات، شائستہ زندگی، predictible رویوں اور آداب کے لطف سے محروم ہیں۔ یہ سب عمومی تکبر کی وجہ سے ہے کہ ہم دوسروں سے تعظیم کی توقع تو رکھتے ہیں مگر خود دوسروں کو انسانی عزت دینے کی جگہ ان کو حقیر سمجھ کر ان کے احساسات کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ بدلہ نہیں لے سکتے یعنی تکبر اسے دوسروں کے

جذبات اوراحساسات سے بیگانہ بنادیتی ہے۔انسانی سرشت کا یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ وہ دوسروں سے جس احترام کا شدت سے طلبگار ہے خوداس کے دینے میں کنجوسی سے کام لیتا ہے۔ اور یہی تضاد باہمی نفرت، انتشار اور فساد کو جنم دے رہا ہے۔ اس کا تدارک صرف ایک حدیث پرعمل سے ممکن بن سکتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ویسا برتاؤ کرو جیسے تم دوسروں سے چاہتے ہو۔ یعنی اس صورت حال کا حل باہمی احترام سے ہے جو آداب سے ممکن بنایا ہے۔

ہماری صوبائی حکومتوں کے پاس تہذیب، تعلیم اور اخلاق کا کوئی ایجنڈا نہیں۔سکولوں اور مدارس میں بھی آداب کا مضمون اور تربیت غائب ہے۔آداب کی محرومی نے ہماری شخصیت ہی نہیں قومی پہچان بھی بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ایسے حالات میں ہم حکومت کا انتظار نہیں کر سکتے بلکہ سب کا فرض بنتا ہے کہ اپنی اسلامی تہذیبی بربادی کے تدارک کیلئے اپنی اپنی جگہ ممکنہ تدبیریں اور طریقے سوچیں اور آداب کو اپنے فکر وعمل میں خصوصی مقام دے کر پریکٹس کریں۔ اگر سب مل کر صرف Please, Sorry اور Thanks کے تین الفاظ پریکٹس کرنے لگیں تو تکبر ختم ہو جائے گا۔ ذرائع ابلاغ کے سب ادارے، مسجدیں، مدارس، دفاتر اگران تین آداب کو اپنے پروگراموں میں خصوصی جگہ دیں تو اس قسم کے مختصر، عام فہم اور دلنشین آدابی پروگراموں سے آداب کو کردار کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔آداب کا فروغ کسی بڑے سے بڑے قومی ایشو سے کم اہم نہیں ہے مگر بات تو اپنی اپنی ترجیحات کی ہے۔

آج کل تو حیوانوں کو بھی آداب سکھائے جارہے ہیں۔ ہماری عوام کو گنوار بن کر جینے پر مجبور کیا جارہا ہے کیونکہ لیڈروں کی جھوٹی انا کی اس سے تسکین ہوتی ہے۔ انہیں سلام کرنے والے چاہیئں وہ خود کسی نیچے والے کو سلام نہیں کہہ سکتے۔لیڈر ہی ہر دور میں بڑی محنت اور تکلیف سے انسان کے ذہنی اور درجات بلند کرتے رہے ہیں۔ ذہنوں کو اوپر اٹھانا سب سے بڑا کارنامہ اور درجہ ہے کیونکہ سوچوں سے ہی اعمال نکلتے ہیں۔ یہی رسول کریم ﷺ نے کیا تھا کہ ایک بدو بھی خلیفہ سے جواب دہی کر سکتا

تھا۔شعور وشائستگی دینا ہی سب سے بڑی سعادت ہے کیونکہ یہی انسان کی اصل پہچان ہے۔

اچھے آداب بذات خود صرف اچھائی ہی نہیں ہوتے بلکہ معاشرتی خوبصورتی کا بھی باعث ہیں جس کو دیکھ کر ہی ہر ایک اس قوم کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسے ہم مغربی دنیا کی تعریف کرتے نہیں تھکتے مگر انہیں اپنانے کے لیے تیار نہیں۔محض اچھے یا برے آداب ہی سے ایک ہی انسان خوبصورت یا بدصورت نظر آنے لگتا ہے۔مگر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی خوفناک بدصورتی سے ہمارا مکمل سمجھوتہ ہماری جمالیات حس کو بھی مشکوک بنا دیتا ہے یعنی کہ ہم ذہنی طور پر گندے لوگ ہیں۔جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو کہ ہمیں دنیاوی زندگی کا حسنہ یا خوبصورتی عطا فرما۔کیونکہ تخلیق و تعمیر میں حسن بھی اسی حس کا نام ہے۔تہذیب وتمدن، اخلاق، انسانیت اور جمہوریت کے سب کے سب داؤ پر ہیں اور آداب ان سب کی بنیاد ہیں۔حضور اکرم ﷺ ہر بات کے آداب سکھاتے تھے حتی کہ رفع حاجت کے بھی جس پر غیر مسلم حیران ہوتے تھے۔ہمیں چاہیے کہ پھر مل کر آداب پر تحقیق تو شروع کریں۔اس منزل کی طرف قدم اٹھانا سنت رسول کریم ﷺ پر عمل کرنا ہی ہے جس کا ہمیں اللہ نے حکم بھی دیا ہے۔(اخبار کے مضمون سے ماخوذ)

میں نے آداب سیکھنے کی ضرورت اور نمونے کے چند آداب دے دیئے ہیں۔ مزید تحقیق آپ خود کر سکتے ہیں۔انٹرنیٹ مواد سے بھرا پڑا ہے۔

بچے چونکہ بڑوں کی نقل کر کے سیکھتے ہیں اس لیے والدین اور بڑے بہن بھائیوں کو محنت کر کے اور توجہ سے انہیں بنیادی اخلاقیات سکھانے پڑتے ہیں۔قدرت انہیں بطور raw material والدین کے حوالے کرتی ہے۔اور بچہ پیدا ہوتے ہی سیکھنا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس کے حواس خمسہ تو کام کر رہے ہوتے ہیں۔اگرچہ بول کر وہ بتا نہیں سکتا۔اس لیے والدین کے لیے سکھانے کا عمل تبھی سے شروع ہو جانا چاہیئے۔اور اچھی باتیں ہی اسے دیکھنی اور سننی چاہئیں۔مگر ہم مسلمان اس کو وقعت نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ جب بڑا ہوگا تو پھر سکھا دیں گے یا خود ہی سیکھ لے گا۔مگر یہ بھول

جاتے ہیں کہ اگر خود دوسروں سے یا ان کی نقل کر کے سیکھے گا تو پھر ادھوری چیزیں ہی سیکھے گا۔

بچوں کی بداخلاقی، بدتہذیبی، یا بےادبی ارادتاً نہیں ہوتی۔ انہیں کسی نے بتایا ہی نہیں ہوتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ مثلاً وہ ناک میں انگلیاں دیتا رہے یا کسی کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ لنگڑا ہے یا یہ موٹی عورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ ایسا کہے تو فوراً اسے بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایسا کہنا غلط ہے اور پھر وجہ بھی بتائے کہ کیوں غلط ہے۔ اس لیے کہ تفصیل بتانے سے اسے فیصلہ کرنے کا طریقہ بھی سمجھایا جارہا ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں اگر سوال ہوگا تو بچہ ضرور پوچھ لے گا۔ جب تک وہ سمجھ نہ جائے اس کے سوالوں کے جواب صبر و تحمل سے دیں۔

عموماً والدین کو یہ سکھانے کا یا تو احساس ہی نہیں ہوتا یا وہ مسائل میں گھرے ہوتے ہیں اور بچوں کو دینے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ یا جہالت کی وجہ سے ادب یا بے ادبی کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔ بچوں کو سکھانے اور عادت بنانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں بار بار یاد دلایا جائے اور جب بھی بھول جائیں تو یاد دلایا جائے۔

انہی آداب سے کسی بھی فیملی، ملک یا مذہبی تہذیب کی پہچان ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم صرف مذہبی اعمال کے آداب کی بات کرتے رہتے ہیں اور دنیاوی آداب کو بھول چکے ہیں جن سے ہی مسلمان کی پہچان ہوتی ہے اور جن سے ہی ہم غیر مسلموں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ یہی ہماری تبلیغ بھی بن جاتی ہے ان آداب سے ہی مساوات، انسانی عزت اور وقار کی پریکٹس ممکن بنائی جاسکتی ہے

پہلے میں نے مذہبی نقطہ نظر بھی دے دیا ہے اگرچہ آداب، معاشرتی ضرورت ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات اسی کی نشان دہی کرتی ہیں۔

مذہبی نقطہ نظر

ریفرنس: ''کتاب اشرف الآداب۔ ادب کی ضرورت۔'' مولانا اقبال۔
ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ ہارون آباد بہاولنگر۔

ادب کیا ہے؟ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طریقے یا قاعدے ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ہر کام کے پسندیدہ طریقے ادب کہلاتے ہیں۔ادب تعظیم کا نام نہیں کہ یہ صرف رسمی چیز ہوتی ہے جبکہ آداب کا **اصل مقصد** کسی کو راحت آرام پہنچانے کا ہے یعنی ایسے کام کرے کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کوئی ادب سے محروم ہے وہ خیرات و برکات سے محروم ہے اور جو محروم ادب ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قرب سے بھی محروم ہے۔التصوف کلہ ادب۔تصوف پورے کا پورا ادب ہے۔

ادب کا معیار عرف یا لوکل پریکٹس پر ہے۔اور عرف زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔مختلف کلچرز میں یہ مختلف ہوتے ہیں۔(ص۲۹)

ظاہری آداب سے باطنی اثرات مرتب ہوتے ہیں اگر ظاہری چہرہ پر تکبر ہوگا تو دل میں بھی ہوگا۔ظاہر منکسرانہ ہو،تو دل میں بھی یہی ہو جاتا ہے۔

آیات سے آداب کی اہمیت اور ہدایات

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے خود ادب کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے آداب کا حکم دیا ہے۔

"اور رسول کو بلانے کو ایسا نہ سمجھو جیسے آپس میں ایکدوسرے کو بلاتے ہو۔" (نور۶۳) یعنی عزت والے شخص کو ادب سے بلاتے ہیں۔ان کو دوسروں سے **ممتاز** سمجھنا چاہیے۔

"اے ایمان والو اپنی آوازیں پیغمبر کی بات سے بلند مت کرو۔ نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے کہ آپس میں کھل کر بولا کرتے ہیں، ایسے نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔" (ص۱۰۔حجرات۔۲) اس آیت سے **معلوم** ہوا کہ بے ادبی سے عمل ضائع ہو سکتے ہیں۔ یہ ثبوت ہے کہ اسلام ادب تعظیم،سلیقہ سکھاتا ہے۔

احادیث سے ادب کی اہمیت اور آداب پر عمل کی مثالیں

(ص۱۲) حضرت عائشہ اکرموا الخبز ۔''روٹی کا ادب کیا کرو۔''

(مستدرک ص۱۳) ''جب تمہارے پاس کسی قوم کا بڑا معزز شخص آئے تو اس کی عزت کیا کرو۔''

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ''حضرت فاطمہؓ کی حیات میں حضرت علیؓ کی بہت عزت کی جاتی تھی ان کی وفات کے بعد کم ہوگئی تھی اور لوگوں کا رویہ بدل گیا تھا۔''

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ''میں عام حالت میں نبی کریمﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی قبروں پر چلی جاتی تھی مگر حضرت عمرؓ کی تدفین کے بعد ان سے شرم کی وجہ سے کپڑوں میں لپٹ کر جاتی تھی۔ یعنی تب بھی ادب کرتی تھیں۔

''ایک گستاخ نے حضور کے کہنے پر کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، پر کہا تھا میں اس سے کھا نہیں سکتا تو اس کا ہاتھ شل ہوگیا۔''

''میرے رب نے مجھے تعلیم دی اور میرے رب نے مجھے ادب سکھایا سو کیا اچھا ادب سکھایا۔'' (ص۲۷۔حدیث)

ص۳۰۔ اللہ تعالیٰ کے آداب۔ ''کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں کسی سے دوستی، یا دشمنی اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اللہ کے مقابلے دوسروں کی پرواہ نہ کرے۔ صیغہ واحد کا استعمال توحید کی وجہ سے معروف بن گیا ہے یہ بے ادبی نہیں گنی جاتی۔ مگر ادب سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

رسول اکرمﷺ کے آداب۔ نام سن کر درود پڑھنا۔ ان کی عظمت، عزت، محبت کو دل میں رکھے، تبھی اتباع سنت آسان بنے گی، احکام شریعت میں شبہات نہیں پیدا ہونگے ۔ جیسے کہ حکومت کی عزت ہو تو اس کے احکام کی بھی عزت ہوتی ہے۔ اور عمل کرتے ہیں۔

بزرگوں سے آداب کی اہمیت کی مثالیں:

ادب کے فوائد ادب سے مغفرت ہونے اور ادب نہ کرنے سے روحانی اثرات کم ہو جانے کی مثالیں:

ایک تیلن جو نماز روزہ بالکل نہیں کرتی تھی، خوب لڑا کی بھی تھی مگر اذان کے وقت اللہ کی بڑائی اور عزت کو مدنظر رکھ کر خود بھی چپ ہو جاتی تھی اور دوسروں کو بھی چپ کرا دیتی تھی کہ میرے اللہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ مرنے سے پہلے فصیح عربی میں کہنے لگی کہ دو نیک اور خوبصورت آدمی آئے ہیں ان کو جگہ دو وہ مجھے کہتے ہیں کہ اسے ہمارے نیک بندوں میں داخل کر دو اسی ایک عمل پر بخشی گئی۔

ایک صاحب کیفیت نے قبلہ کی طرف تھوک دیا تو ساری بزرگی جاتی رہی۔ دو طالب علم حفظ کرنے لگے جو وضو کر کے یاد کرتا تھا اس نے سال میں کر لیا دوسرے نے دو سال میں کیا۔

(س،۲۰) حصول علم کے لیے کثرت مطالعہ سے زیادہ ادب کی ضرورت ہے۔ (ص ۲۱) شرح صدر میں تقوی کے علاوہ بزرگوں کا ادب کا بڑا دخل ہے۔ مفتی شفیع صاحب۔ نوکر کو پیسے پھینک کر نہیں دیا، دوسرے سے روپیہ بائیں ہاتھ میں لیا ہو۔

آداب پر عمل کے لیے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی رضا اور نبی کریم ﷺ کو خوشی دینا اور مسلمانوں کی دنیا میں عزت کو بلند کرنا مقصد بنانا بڑی ضروری سوچ ہے۔ اسوۂ حسنہ کو جب بھی پڑھیں تو اس سے مزید آداب زندگی سیکھیں جو کہ ہر شعبہ زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔ اور لکھ کر شیئر کریں۔ امام غزالی، کی کتاب مراقبہ کی حقیقت کے مطابق، "**ہر عمل کے لیے نیت کی چیکنگ کے لیے تین سوال ہوں گے**۔ حدیث: آپ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ کے لیے ہر حرکت میں چاہے کتنی ہلکی ہو، تین دفتر کھولے جائیں گے۔

پہلے میں ہوگا کہ **یہ عمل کیوں کیا؟** کیا اللہ کے لیے کیا یا کہ اپنی مرضی یا پسند کے لئے۔ اللہ کی خوشنودی کی نیت کر لیں۔ آداب سیکھنے سے پہلے ایک ہی دفعہ نیت کر لینا

کافی ہے کہ یہ خالص اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ہدایات، رسول کریم ﷺ کی نصیحت پر عمل کی نیت سے سیکھ اور عمل کر رہا ہوں۔ بار بار نیت کی ضرورت نہیں

دوسرے میں ہوگا کہ **یہ کس طرح کیا؟** اگر سہواً یا جہالت، غفلت سے کیا تو نہ ثواب، نہ عذاب، کچھ حاصل نہ ہوا۔ عمل بیکار اور جدوجہد برباد ہو گئی۔ اس لیے ہر عمل کے لیے ہر حکم کی حکمت یا فلاسفی کہ کیوں کر رہے ہیں، تفصیل کا جاننا ضروری ہے۔ ہر ادب اسوۂ حسنہ کی سوشل اپلائیڈ شکل ہو

اور تیسرے میں ہوگا کہ **کس کے لیے کیا۔؟** اللہ تعالیٰ سے خلوص نیت سے اجر کی امید کے ساتھ کیا تب تو تیرا اجر اللہ کے پاس ہے۔ اور اگر اس لیے کیا ہے کہ کچھ دنیا اس کی وجہ سے مل جائے تو وہ ہم پہلے تجھے دے چکے ہیں، اگر کسی مخلوق کو دکھانے کے لیے کیا ہے تو اس سے جا کر اجر لے۔ تو میرے عذاب اور غصے کا مستحق ہوا کہ میرا رزق کھا کر دوسروں کی عزت اور خیال کرتا ہے، اور میری نعمتوں سے عیش اڑاتا ہے پھر دوسرے کے لیے عمل کے کیا معنی ہیں۔

اس لیے عمل کا ارادے کرنے کے لیے رک یا ٹھہر کر نیت چیک کر کے عمل کرنا چاہیے۔ اگر دل میں مخلوق کا خیال آ جائے تو پھر ٹھہر جائے جب نیت ٹھیک ہو جائے تب کوئی عمل کرے۔ اعمال کے اسرار اور نتائج کا اور شیطان کے مکر و فریب اور نفس کے طریقوں کا علم ہونا چاہیے اور اپنے رب کی مرضی بھی پتہ ہونی چاہئے، کیونکہ اکثر لوگ برے کاموں کو اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسی لیے علم حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے۔ تا کہ جہالت اور غفلت سے باز رہے۔ کوئی مشتبہ چیز ہو تو علم کے نور سے پتہ کرے کہ کیا صحیح ہے اور اللہ کی مدد اور پناہ مانگے کہ شیطان کے جال سے بچ جائے۔ اگر اپنی کوشش سے نہ سمجھ آئے تو کسی عالم کے علم کے نور سے اقتباس کرے مگر گمراہ کرنے والے اور دنیا کی طرف توجہ کرنے والے علماء کے پاس نہ جائے بلکہ ان سے شیطان کی طرح بھاگے۔ (صفحہ ۴۶)

آداب کی پہلی مثال

''گھر میں رہنے اورڈسپلن کے آداب سکھاناوالدین کی ذمہ داری ہے''

سکول کے علاوہ گھر ہی ایسی جگہ ہے کہ جہاں آداب کی تربیت دی جاسکتی ہے، ہرگھر کو چاہیے کہ پہلے طے کرلے کہ بچوں کو کیا کیا، کون کون سے آداب اور کیوں سکھانے ہیں۔اس لیے کردار سازی اور ڈسپلن کی پابندی سکھانا، قانون سازی اور سسٹم بنانے کی ٹریننگ، تعلیم اورتربیت گھر سے شروع کرنے ہوتے ہیں۔جن پر عمل کر کے ہی بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہوگا۔کردار میں پختگی آئے گی۔ یہ صبر آزما کام ہوتا ہے۔تبھی کامیابی معاشروں کی تقدیر بنتی ہے۔

گھر کے آئین بنانے کا رواج نہیں جو شروع ہونا چاہیے ان پر عادت کیے ڈالنے کے لیے بچوں کو بار بار یاد دلانا پڑے گا بچے جلدی بھول جاتے ہیں جب تک عادت نہ پڑ جائے یاد دلاتے رہیں۔ بڑے بچے بھی چھوٹوں کو یاد دلائیں۔والدین کو تحمل اور برداشت کے ساتھ محبت سے سکھلانا ہوگا یہ کام ایک دفعہ بتلا دینے کا نہیں۔ ہر روز، چوبیس گھنٹے، ہفتے میں سات دن اور مہینے کے تیس دن لگاتار کرنے کا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے سسٹم بنانے اور پھراورادب سکھانے کوسب سے اہم کام بتایا تھا۔والدین کو چاہیے کہ بچوں کو اپنی زندگی اور وقت کنٹرول کرنے کے لیے ذاتی رولز بنانے کی تربیت بھی دیں تاکہ انہیں خود بھی احساس ہو کہ پلان کر کے زندگی گزارنے سے ہی کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ایک گھر کے قوانین کی مثال دیکھیں۔

۱۔ گھر میں ہرکوئی نماز پڑھے گا۔

۲۔ شکریہ، یابرائے مہربانی ہرایک کہے گا، بڑے بھی مستثنی نہیں ہونگے۔

۳۔ کوئی بدذوقی بدتمیزی جیسے گالم گلوچ، مارکٹائی، لعن طعن والی بات نہیں ہوگی۔

۴۔ اپنے محسوسات، جذبات، خیالات، کوادب احترام کے ساتھ وضاحت سے بتائیں تاکہ دوسروں کو سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو۔

۵۔ جو کوئی چیز کسی جگہ سے اٹھائے گا استعمال کے بعد وہیں رکھے گا

۶۔ جو کوئی دروازہ کھڑکی، ڈبہ کھولے گا وہی بند کرے گا۔

۷۔ اگر جگہ گندی ہو جائے یا چیزیں نیچے گر جائیں تو خود ہی اٹھائے گا جگہ صاف کرے گا۔

۸۔ آپ کا کمرہ آپ کی ذمہ داری ہے اسے ہر وقت صاف رکھنا، بستر بنا ہوا ہونا خود کریں اس میں ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں لگتے

۹۔ کوئی بات کرنے لگے تو اس کی بات غور سے سنی جائے گی اور درمیان میں ٹوکا نہیں جائے گا۔

۱۰۔ اگر دو بندے بات کر رہے ہوں تو ان کو ٹوکا نہیں جائے گا اگر ضروری اور فوری پیغام دینا ہے تو معاف کیجئے کہہ کر بات بتائیں۔

۱۱۔ گھر میں ہر کوئی تلاوت قرآن کرے گا۔

۱۲۔ ہر کوئی گھر سے آتے جاتے سلام کرے گا۔

۱۳۔ صبح اٹھ کر سب ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

۱۴۔ کوئی بھی کمرے میں جا کر کچھ نہیں کھائے گا۔

۱۵۔ رات کو بارہ بجے کے بعد کوئی نہیں جاگتا رہے گا۔

۱۶۔ سمارٹ فون اور دوسری ڈیوائسز اتنے بجے سے اتنے بجے تک استعمال کرے گا۔

۱۷۔ عرب والدین کے لیے احترا ما کھڑا ہونا بوسہ دینا اور ہاتھ چومنا ضروری ہو گا۔

۱۸۔ مل کر بیٹھتے وقت فون یا دوسری ڈیوائسز منع ہونگی۔

۱۹۔ کھانے کے وقت سب کی حاضری ضروری ہو گی اور یہی وقت اپنے تجربات مشاہدات بتانے کا وقت ہو گا۔

۲۰۔ گھر کے تمام افرا گھر کی اور گھر کی تمام چیزوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہونگے

۲۱۔ ہر ایک اپنے کام خود کرے گا۔ دوسرے کو نہیں کہے گا، نہ حکم چلائے گا۔ اگر

ایمرجنسی میں کہنا پڑے تو پلیز کہہ کر درخواست کریگا

۲۲۔ والدین یا گھر میں بڑے چھوٹوں کو کام کے لیے کہہ سکتے ہیں مگر وہ بھی پلیز کہیں تو بہتر ہے۔

۲۳۔ خاندان کی ضروریات دوسری ضرویات پر مقدم ہونگی اور پہلے ان کو کیا جائے گا باقی کام بعد میں ہونگے۔

۲۴۔ کسی کے کمرے میں جانا ہو تو بند دروازے کو کھٹکھٹا کر انتظار کریں ویسے ہی کھول کر اندر نہ چلے جائیں۔

۲۵۔ باتھ روم میں کسی بھی کمرے کا دروازہ بند ہو تو کھٹکائیں اور اجازت ملنے پر جائیں۔

۲۶۔ کسی نے کچن میں کچھ بنایا ہے تو برتن اور کچن صاف کر کے جائے۔ کچھ گر جائے تو اٹھالے۔

(حوالہ؛ عامر خاکوانی کا ایک شامی عرب کے گھریلو قوانین پر دنیا نیوز کا مضمون)

دوسری مثال

مغربی ممالک نے بھی بچوں کے لیے پچیس اخلاقیات، نو سال کی عمر تک سیکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ یہ انٹرنیٹ سے لیے ہیں۔

”گھر سے ہی اچھے اخلاق آداب کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ بلکہ values and ethics اور considerate, tolerant and respectful. اور شیئر کرنا سیکھتے ہیں۔ گھر میں ہی مستقبل کی زندگی کامیابی سے گزارنے کے گر سیکھیں۔ گھر میں ہی دوسروں کو برداشت کرنا، عزت کرنا، اور دوسروں کا خیال رکھنا سیکھتے ہیں۔ اچھے اخلاق سے بچوں میں خود اعتمادی آتی ہے کہ وہ ہر صورت میں صحیح فیصلہ کر سکے گا اور یوں لوگوں میں مقبول ہو کر زندگی کامیابیاں حاصل کرے گا۔ اس لیے ہر اخلاق کی فلاسفی سمجھانا ضروری ہوتا ہے کہ کوئی چیز کسی مقصد کے بغیر نہیں کرنی چاہئے۔ کیوں اور کیسے کی

وجہ سمجھانی ضروری ہے اس سے ان کی قوت فیصلہ بڑھتی ہے اور کسی بھی نئے، مشکل حالت میں صحیح فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اس لیے اگر آپ مندرجہ ذیل آداب سب سے بڑے بچے کو سختی سے سکھا دیں تو چھوٹے خود ہی اس سے نقل سے سیکھ جائیں گے۔ آپ کو دوبارہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔

پہلا ادب: کسی سے کسی بھی کام کرنے کو کہنے سے پہلے، پلیز کہنا۔ مہربانی کر کے، کہنا، سیکھ لیں۔ یہ اس لیے کہ کسی کی مرضی ہے کہ آپ کی بات مانے یا نہ مانے۔ آپ کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔

دوسرا ادب: شکریہ کہنا۔ کسی بھی مہربانی یا خیال رکھنے پر شکریہ کہنا بہت اہم عادت ہے۔ یہ تکبر ختم کرنے کے لیے بھی اچھا نسخہ ہے۔ میرے خیال میں یہ بہت اہم عادات ہے، ان کے ساتھ ہی اگر سلام میں پہل کی عادت شامل کر لیں۔ یہ تکبر کو ختم کرنے کا بڑا ذریعہ بن جائے گی۔ اس کے لیے تھینک یو، مہربانی، شکریہ، کوئی سے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔

انا کا توڑ: شکریہ مہربانی، تھینک یو کہنے سے ذاتی اکڑ، غرور، انا جو کہ ناپسندیدہ عمل ہے کا بخوبی توڑ ہو جاتا ہے اور انسان انسان بن جاتا ہے۔ دوسروں کو انسان سمجھنے لگتا ہے۔ اپنے سے کم تر نہیں۔ مغربی ممالک بچپن سے ہی بھلائی پر شکریہ، غلطی پر سوری کہنے کی عادات ڈالواتے ہیں۔

ایک ہسپتال میں ٹیکہ لگنے کے بعد بچے نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا نہ کیا تو باپ نے کہا کہ بیٹا تم کچھ بھول رہے ہو۔ اس پر بچے نے فوراً کہا ڈاکٹر تھینک یو۔ وہ لوگ ایسے ہی ٹریننگ دیتے ہیں۔ میری چار سالہ نواسی کینیڈا سے آئی ہوئی تھی۔ ایک دن ہم کار میں تھے اور ایک دکان سے میرے بیٹے نے جو آگے بیٹھا تھا جوس لے کر آیا۔ تو میری بیٹی نے نواسی کو یاد دلایا کہ نانا ابو کا شکریہ نہیں کیا، تو وہ کہنے لگی کہ کس بات کا شکریہ کروں تو بیٹی نے کہا کہ جوس کے لئے۔ اس پر کہنے لگی کہ ابو تو نہیں لائے میں ماموں کا شکریہ کرتی ہوں،

وہ جوس لائے تھے۔اس میری بیٹی نے کہا کہ ابو نے پیسے دیئے تھے، تب جا کر اسے سمجھ آئی اوراس نے میرا شکریہ ادا کیا۔اصل میں اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کی ماں اسے شکریہ کہنے کے بتائے گئے اصول کے خلاف شکریہ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس سے اندازہ لگالیں کہ باہر کے ملکوں کے رہنے والے اخلاقی اصولوں کی کیسے تعلیم دیتے ہیں اور عادت ڈلواتے ہیں۔حتی کہ یہ بچوں کی فطرت بن جاتی ہے۔

تیسرا ادب: اگر کسی کو چھوٹی سی تکلیف بھی پہنچائیں جیسے کسی کے پاؤں پر پاؤں رکھ دینا،ٹکر یا ہاتھ لگ گیا یا کندھا ماردیا پاؤں لگ گیا یا کسی پر چیز گرا دی، کپڑے خراب کر دئے تو فوراً سوری یا معاف excuse me کیجئے کہہ کر معافی مان لیں۔ بہت ضروری ہے۔اگر آپ کسی کے ساتھ ٹکرا جائیں تو فوراً معاف کیجئے گا یاexcuse me کہیں۔اور اگر اسے چوٹ لگ گئی ہے یا گر گیا ہےتو اس کی مدد کر۔

چوتھا ادب: بڑے بات کر رہے ہوں تو ان میں دخل نہ دینا۔ پاس کھڑے ہو جائیں وہ خود ہی نوٹس کر کے پوچھیں گے کہ کیا بات ہے۔

پانچواں ادب: اگر ایمرجنسی ہو تو معاف کریں یاexcuse me کہہ کر فوراً بات بتا دیں۔

چھٹا ادب: اگر کوئی کام کرنے میں شک ہو کہ صحیح ہے یا نہیں تو بڑوں سے پوچھ لو۔ ورنہ بعد میں جھڑکیں پڑیں گی۔

ساتواں ادب: اگر آپ کو کوئی بات یا چیز ناپسند ہے تو ایسی منفی سوچیں اپنے تک رکھیں یا اپنے دوستوں تک رکھیں۔ والدین یا بڑوں کو نہ بتائیں۔

آٹھواں ادب: کسی کی جسمانی نقص پر بات نہ کریں جیسے کہ لنگڑا، موٹا، بھینگا ہو یا گنجا ہو۔ ہاں اگر اچھی بات ہو تو ضرور تعریف کریں۔

نواں ادب: اگر بڑے یا کوئی پوچھے کہ کیسے ہو تو الحمد للہ کہیں اور جواب میں ان سے بھی پوچھیں کہ وہ کیسے ہیں۔

دسواں ادب: اگر آپ کسی کے گھر میں دعوت پر گئے ہیں تو واپسی سے پہلے دوست کے والدین کا دعوت کا اور اچھا وقت گزارنے کا شکریہ ضرور کریں۔

گیارھواں ادب: کسی کے گھر جا کر دروازہ کھٹکھٹائیں یا گھنٹی بجائیں اور انتظار کریں۔ تین بار سے زیادہ گھنٹی نہ بجائیں اگر کوئی نہ آئے۔ اور یا تو پیغام لکھ کر چھوڑ دیں یا واپس چلے جائیں۔

بارھواں ادب: اگر کسی کے گھر کال کریں اور کوئی دوسرا یا والدین میں سے کوئی اٹھائے تو پہلے سلام کریں اور پھر کہیں کہ میں نے فلاں سے بات کرنی ہے۔

تیرھواں ادب: اگر کوئی تحفہ ملے تو تھینک یو ضرور کہیں۔ بلکہ اس کے بعد اور بھی کچھ کہہ سکتے ہیں جیسے کہ بہت اچھا ہے۔ آپ نے میرا بہت خیال کیا۔ وغیرہ

چودھوں ادب: بڑوں کے سامنے غلط یا برے لفظ استعمال نہ کریں۔ وہ برا منائیں گے۔

پندرھواں ادب: لوگوں کو غلط، برے یا غلیظ لفظوں سے مت پکاریں۔

سولھواں ادب: کسی کا مزاق نہ اڑائیں یا تنگ کریں۔ اس سے دوسروں پر برا اثر پڑتا ہے کہ آپ کمزور ہیں۔ یا ظالم یا زیادتی کر رہے ہیں کیونکہ کسی کے ساتھ زیادتی کرنا اچھا نہیں لگتا یا سمجھا جاتا۔ دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں،۔ مسلمان کا ماٹو ہی یہ حدیث ہونی چاہیے کہ۔ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے کرو، اگر یہ عادت ہو تو آپ کا کوئی فیصلہ یا بات غلط نہیں ہوگی۔

سترھواں ادب: اگر کھیل برا بھی لگ رہا ہو تو چپ کر دیکھتے رہو اور ایسے لگے کہ تم

انجوائے کر رہے ہو۔ کیونکہ کھیلنے والے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کرر ہے ہیں۔

اٹھارھواں ادب: اگر آپ کو کھانسی آ جائے یا چھینک تو اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیں۔ نہ ہی دوسروں کے سامنے ناک میں انگلیاں ڈالیں؛ اس کے لیے علیحدہ ہو کر ناک صاف کریں۔

انیسواں ادب: اگر آپ دروازے سے گزر رہے ہیں اور کوئی آپ کے پیچھے آ رہا ہے تو دروازے کو پکڑے رہیں تا کہ وہ گزر جائے ورنہ دروازہ ان کو لگے گا۔ اگر کوئی آپ کے لیے دروازہ پکڑے رہے تو گزرتے ہوئے اسے تھینک یو ضرور کہیں کیونکہ یہ اس کی ڈیوٹی نہیں تھی بلکہ اس نے ااپ کیعزت بھی کی اور خیال بھی رکھا۔

بیسواں ادب: اگر کوئی ہمسایہ، ٹیچر، بڑا کوئی کام کر رہا ہو، جیسے ٹائر بدل رہا ہو، یا گروسری اٹھا کر گھر کے اندر لے جا رہا ہو، تو ان کو مدد کرنے کی آفر کریں۔ اگر وہ ہاں کہیں تو ان کے ساتھ مل کر کام کریں۔

اکیسواں ادب: اگر کوئی بڑا کسی کام کے لیے کہے جیسے پانی لا دو یا فلاں چیز پکڑا دو، یا ٹیبل پر برتن رکھ دو تو خوشی خوشی کریں اور منہ نہ بنائیں۔ اس سے آپ ضرور نئی بات سیکھیں گے۔

بائیسواں ادب: کھانے کے برتن استعمال کرنا سیکھیں۔ اگر پتہ نہ ہو تو پوچھ لیں۔ پوچھنے اور سیکھنے میں بالکل کوئی شرم مانع نہیں ہونی چاہیئے۔ یا دیکھیں کہ بڑے کیسے استعمال کر رہے ہیں آپ بھی ویسے ہی کر لیں گے تو غلطی نہیں ہوگی۔ ہم زیادہ چیزیں نقل کے ذریعے ہی سیکھتے ہیں؛۔

تیئیسواں ادب: اگر کوئی آپ کی مدد کرے تو اس کا شکریہ ادا کریں تو وہ پھر بھی آپ کی مدد کرے گا۔ اگر شکریہ نہ کیا تو وہ برا منائے گا اور آئیندہ کبھی

آپ کی مدد نہیں کرے گا۔

چوبیسواں ادب: نیپکن ضرور استعمال کریں ضرورت ہو تو منہ صاف کر لیں؛۔

پچیسواں ادب: عزت اور محبت کا سلوک کرنا سیکھیں بڑوں، چھوٹوں، سب کے ساتھ۔

محمد اظہار الحق صاحب کے کالم سے چند پوائنٹ لکھے ہیں کہ ہمارا مسلمانوں کا مسئلہ کیا ہے کہ ہم شکریہ ادا کرنے یا مسکراہٹ بکھیرنے میں جھجک کیوں محسوس کرتے ہیں اس پر خرچ بھی کچھ نہیں آتا۔ اس قدر تنگ دل کیوں ہیں؟ اگر کوئی مسجد میں دروازہ کھول کر پکڑ رکھے تو شکریہ ادا نہیں کریں گے اور ویسے گزریں گے جیسے کہ دروازہ پکڑنے والا ان کا نوکر یا مزارع ہو۔ سڑک پر کار میں کوئی راستہ دے راستہ تو ہاتھ اٹھا کر شکریہ ادا کر دیں۔ پارکنگ میں صحیح پارکنگ کریں، کسی کے پیچھے گاڑی پارک نہ کریں کہ وہ نکل ہی نہ سکے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ کسی کے پیچھے ایسے پارکنگ کریں گے کہ وہ نکل نہ سکے شکایت کریں تو آپ سے معذرت نہیں کریں گے بلکہ بیچ کی طرح بے شرمی سے کار میں بیٹھ کر چلے جائیں گے یا کہیں گے کہ کیا ہوا ہے ایک منٹ انتظار نہیں کر سکتے۔ ایک چیز خرید رہا ہے تو دوسرا اپنے آرڈر دینے لگے گا دکاندار بھی اسے انتظار کی جگہ اس کا ایک آئٹم دے کر دونوں کو پھنسا لے گا۔ فون کرتے پہلے اپنا تعارف کروائیں۔ فون پر کال بیک کرنے کا کہہ کر کال نہیں کرتے۔ کسی مطلوبہ انفارمیشن مہیا کرنے کے لیے کہہ کر کال نہیں کرتے۔ سیڑھیوں پر یا فٹ پاتھ پر، دو دوست مل کر بغل گیر ہونے باتیں کرنے لگیں گے راستہ روک لیں گے۔ راستہ دینے کے لیے کہیں تو خوفناک نظروں سے دیکھیں گے۔ پارکنگ کی جگہ چھوڑ کر دکان کے سامنے کار پارک کریں گے۔ بس چلے تو کار دکان کے اندر تک لے جائیں۔

یہ نہیں کہ ہم میں کوئی پیدائشی نقص یا manufacturing fault ہے گوروں کے ملک میں ٹھیک رہتے ہیں پاکستان پہنچتے ہی بگڑ کر اپنی اصلی حالت یا موڈ میں آ جاتے ہیں۔ اور یوں ہماری زندگیاں جنگلیوں کی طرح گزر رہی ہیں۔ کوئی حال پوچھے

توشکریہ کے بعد اس کا حال پوچھیں۔دوست کے گھر کھانا کھائیں تو اس کے ماں باپ کا بھی شکریہ ادا کریں۔فون پر اپنا نام بتا کر درخواست کریں کہ میں فلاں سے بات کرسکتا ہوں۔ای میل یا ایس ایم ایس کے پیغام کے بعد شکریہ کر کے وصولی کنفرم کریں۔مذاق کرتے کسی کی عزت نفس مجروح نہ کریں۔(محمد اظہار الحق سے شکریہ کے ساتھ)

میرا تجربہ:

اپنے سے چھوٹوں، کمزوروں کے ساتھ ہمیشہ تہذیب سے برتاؤ کریں۔کیونکہ وہ بدتمیزی کا جواب نہیں دے سکتے۔یہ 1964 کی بات ہے۔جب میرے پہلے سکواڈرن کمانڈر، سکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی شہید کو دیکھا کہ ہمیشہ بیروں اور بیٹ مین کو آپ کر کے پکارتے تھے جبکہ افسروں سے بے تکلفی سے بات کرتے تھے ایک دن ان سے پوچھا تو بتایا کہ بچپن میں ایک دن میں نے گھر میں نوکر کے بیٹے کو گالی دی تو والد نے کہا کہ اس سے معافی مانگو تو میں نے جواب دیا کہ نوکر کا بیٹا ہے، کیوں مانگوں تو والد نے ایک چانٹا رسید کیا اور کہا کہ اس نے گالی کا جواب اسی لیے نہیں دیا کہ وہ ہمارے نوکر کا بیٹا ہے، ورنہ وہ تم سے طاقتور ہے۔کوئی اور ہوتا تو تمہیں مار مار کر دنبہ بنا دیتا۔جو جواب نہ دے سکے اس کی عزت کرنا سیکھو۔رفیقی صاحب نے معافی مانگ لی اور ساری عمر کے لیے سبق بھی سیکھ لیا۔

گھر میں ہر ایک کی بشمول چھوٹے بچے کی بھی عزت ہونی چاہیے ہر ایک عزت کی پہچان رکھتا ہے عزت کا سلوک کریں۔اس کی خلوت privacy کی بھی عزت کریں۔

گھر میں دوسروں کی چیز استعمال کرنی ہو تو اجازت لیں۔ہر بچے کو بھی اپنی ملکیت پیاری ہوتی ہے اور وہ برا بھی مناتا ہے اگر اس کی ملکیت میں مداخلت کی جائے۔کھلونا اس سے مان کر دوسرے بچے کو دیں اور استعمال کے بعد شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں۔

جمعہ کے دن بچوں کو نماز کے لیے ساتھ ضرور لے جائیں۔ان کو ساتھ ساتھ مسجد کے آداب بھی بتائیں اور دین کی باتیں بھی۔ان کے سوالوں کے جواب بھی دیں۔جاننے والوں کو سلام کرنا ضرور سکھلائیں۔بچوں پر سختی کی بجائے آرام سے اور بار بار بتا کر استقامت کرنا بہتر ہے بچوں کو سکھلانے میں انجوائے کریں اور ان کے سیکھنے پر خوش۔کھیل اور چیلنج سمجھ کر محبت سے سکھائین یہی آپ کا مستقبل ہے۔یہ سب آداب ادھر ادھر سے اکٹھے کیے ہیں۔مزید تحقیق آپ خود کر لیں۔

آداب سیکھنے اور پریکٹس کرنے کے دنیاوی فوائد

صرف ایک فائدے سے اندازہ لگا لیں۔مڈل ایسٹ میں عرب عام طور پر پاکستانیوں کی بجائے انڈین ہندو، فلپائینی، بنگلا دیشی، سری لنکن ورکرز کو ملازمت میں ترجیح دیتے ہیں کیونکہ یہ سب انٹرنیشنل آداب سے واقف ہوتے ہیں اور پریکٹس کرتے ہیں۔پاکستانیوں کو پہلے تو آداب کا پتہ ہی نہیں ہوتا۔اگر ہوتا ہے تو پریکٹس نہ ہونے سے ان میں وہ نفاست نہیں ہوتی جو چاہیئے۔ان آداب سے لڑائی جھگڑے سے بھی نجات مل جاتی ہے۔بلکہ میں نے تو دیکھا ہے کئی پاکستانی سٹورز یا ہوٹل کے مالکان بھی ہم وطنوں کی جگہ دوسروں کو ترجیح بھی آداب نہ جاننے کی وجہ سے دیتے ہیں۔آداب کے علاوہ یہ بڑی جلدی مذہب یا علاقے کی بنیاد پر پارٹی بازی شروع کر دیتے ہیں جس سے آپس میں جھگڑے شروع کر دیتے ہیں۔جونہی پیسے ملنے لگیں تو چوہدراہٹ سر پر سوار ہو جاتی ہے اور مالک سے بھی جھگڑا مول لینے سے باز نہیں آتے۔مجھے ایک سعودی نے بتایا کہ پاکستان ورکر کو تیسری چوتھی تنخواہ جیل میں جا کر دینی پڑتی ہے۔یہ بھی ورک کے آداب نہ جاننے کی وجہ سے ہی ہوتا ہے کہ work ethics میں صرف کام سے کام رکھنا ہوتا ہے جو پیسے دے رہا ہے کبھی کبھار اس کی غلط اور ناجائز بات بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔باس ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔

سبق :

ہمیں تھینک یو اور سوری کہنے کی فطری عادت ہونی چاہئے کیونکہ یہ حقوق العباد سے تعلق رکھتی ہیں اور اس جہاں میں ہی حساب کلیئر کر کے جانا چاہیے۔

جزاک اللہ کہنا بہتر ہے مگر مذہبی حلقوں میں تھینک یو اور سوری کہنے کی عادت کو قابل قبول بنانا بہت ضروری ہے کہ یہ انگریزی الفاظ بھی اسوۂ حسنہ کی پیروی بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام زبانیں سمجھتا ہے۔

سلام میں پہل اور مسکرا کر کریں۔ یہ تینوں عادت تکبر سے بچالیں گی۔

بیرون ملک جانے والوں کو آداب کے انٹرنیشنل سٹینڈرڈ کے آداب سیکھنے چاہئیں۔اس کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں بھی آداب کو رواج دیں تو ایک دوسرے سے تعقات خوش گوار ہو جائیں گے۔ برداشت کی عادت بھی پڑ جائے گی تو امن،سکون اور سلامتی پیدا ہو گی۔

☆......☆......☆

۵۹۔ قبرستان کو ظاہری طور پر خوبصورت بنانا بھی سنت ہے

آپ ﷺ کے مطابق مسلمانوں کے قبرستان کیسے ہونے چاہئیں؟

جب غزوہ بدر کے شہیدوں کی میتیں قبروں میں اتاری جا رہی تھیں تو آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ قبروں کو ایک صف میں قرار دیں اور کوشش کریں کہ قبروں کی ظاہری حالت اچھی اور خوبصورت ہو تو مسلمانوں میں سے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر قبریں ظاہری طور پر اچھی اور خوبصورت نہ ہوں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے مرنے والے کو دکھ پہنچے گا۔؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ مرنے والوں کو دکھ نہیں پہنچے گا بلکہ زندہ رہنے والوں کا دل دکھے گا کیونکہ ایک کھنڈر اور ویران قبر کا نظارہ انسان کے لیے غم انگیز منظروں میں سے ایک ہے۔ (ریفرنس: سیارہ ڈائجسٹ۔ عکس سیرت نمبر۔ (صفحہ: 321)

اس سے اندازہ لگالیں کہ ہم آپ ﷺ کی کسی بات پر بھی عمل نہیں کرتے جب کہ گورے آپ ﷺ کی ہر بات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے قبرستانوں اور ہمارے قبرستانوں سے مقابلہ کر کے دیکھنے سے ہمارے سر شرم سے جھک جانے چاہئیں تو کیا ہم اس مضمون کو پڑھ کر ہمیں قبرستانوں کو خوبصورت بنانے کو اپنے کلچر کا حصہ نہیں بنالینا چاہیے۔ ہمارے قبرستانوں کے خراب ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے زندگی منظّم کرنے لیے لیڈر شپ اور کنٹرول سسٹم نہیں بنایا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ کی واضح ہدایات موجود ہیں جو اگلے باب میں دی گئی ہیں۔ اس لیے ہم خود سوچ کر پلان کر کے چیزیں نہیں کرتے بلکہ گورکن پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ سوچ رکھنے والا آدمی نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک محدود کام کرنے والا ہے۔

۶۰۔سفر میں امیر بنانا سنت ہے۔

حدیث:۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

''جب سفر میں تین آدمی ہوں تو ان کو آپس میں سے اپنا امیر بنا لینا چاہیے۔

(ابوداؤد حدیث نمبر 608۔ریفرنس،ص79)

یہ حدیث بہت اہم ہے، یہ دراصل زندگی کو نظم و ضبط سکھاتی ہے تنظیم دینے، لیڈرشپ کی ٹریننگ، اتحاد و اتفاق و یک جہتی پیدا کرنے کے اصول بیان کرتی ہے۔فیصلے کرنے، دوسروں کی ذمہ داری اٹھانے، دوسروں کا خیال رکھنے کی ٹریننگ کی بہترین مثال ہے۔

فوج نے انہی اصولوں کو اپنا لیا ہے۔ ہر ایک کو کسی بھی جگہ پتہ ہوتا ہے کہ کس نے لیڈر بننا ہے اور فیصلے کرنے ہیں۔سینیارٹی کا سب کو پتہ ہوتا ہے۔ایک مارا جائے تو سب کو پتہ ہوتا ہے کہ خود بخود لیڈرشپ کون سنبھال کر تمام فیصلے کرے گا۔تا کہ فوجی یونٹ کی یک جہتی قائم رہے۔اس کے فیصلے ماننے کا ہر ایک پابند ہوتا ہے۔سینئر نے ہر نئی حالت میں خود ہی لیڈر کا رول اپنا لینا ہوتا ہے۔

تبلیغی جماعت اس اصول پر سختی سے عمل کرتی ہے وہ تو دو آدمی ہوں تو بھی ایک کو امیر بنا لیتے ہے تا کہ ہر جگہ وہی بات کرے گا۔دوسرا اس کی نصرت کرے گا۔

ہم دراصل دو اہم نظریات بھول گئے ہیں۔نظریہ توحید یہ کہتا ہے کہ ہر جگہ صرف ایک فیصلے کرنے والا چاہیے، ایک سے زیادہ خدا ہوئے تو کائنات میں فساد ہونے سے تباہی پھیل جائے گی۔ ہمارے ملک میں یہی ہو رہا ہے کہ سیاسی لوگ ہر ادارے میں دخل اندازی کر کے فساد پھیلا رہے ہیں۔

دوسرا نظریہ ختم نبوت ہے۔ اب نیا نبی نہیں آ سکتا تو پھر قرآنی ہدایت کے مطابق تمام پالیسی فیصلے اور کام مشاورت سے ہونگے۔ مشاورت کے لیے ہر لیول پر ایک ادارکی ضرورت ہوگی کیونکہ مشارت کے بعد ایک فائنل فیصلہ کرنے والا اوراس پر عمل کروانے والا ہونا چاہئے۔ یعنی ہر لیول پر لیڈر رہونا ضروری ہے جو اتھارٹی اور ذمہ دار ہی کے لیےکسی اوپر والےکو جواب دہ بھی ہو۔

بدقسمتی سے ہم نے ادارے بنا کر زندگی منظّم نہیں کی جبکہ تمام مغربی مما لک نے چارسو سال پہلے بھی ہر گاؤں کے لیول پر اجتماعی مشاورت سے فیصلے کرنے کے لیے ٹاؤن/ ویلیج ہال بنائے تھے جن میں ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں بیٹھتی تھیں اور سامنے ڈائس پر صدر، سیکریٹری بیٹھتا تھا جو کہ جمہوری طریقے سے چندسال کے لیے ویلج کونسل کے لیے چنے جاتے تھے۔ گاؤں کے کسی مسئلے کا حل اجتماعی دانش، مشاورت سے کثرت رائے سے چنا جاتا تھا جو آسان اور کم لاگت کا ہو۔ یہیں سے جمہوری تنظیم بھی بنتی تھی اور جمہوریت کی ٹریننگ بھی ہوتی تھی۔

اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر ہر گاؤں اپنی ویلج کونسل بنا کر اجتماعی فیصلے کی تنظیم بنالیں جو سب سے پہلے یونیورسل تعلیم اپنی مدد آپ کے تحت کر لے اور دوسرے مرحلے میں گاؤں کی سڑکوں، گلیوں نالیوں، نکاسی آب اور ریگولر صفائی کا نظام ڈسٹرکٹ کونسل کی مدد سے انجینئرنگ ڈیزائن کروا کر اپنی مدد اپ یا حکومت کی مالی امداد لے کر مکمل کرلیں تو یہ مغربی مما لک کے برابر آ سکتے ہیں۔

شہروں میں یہ ہر محلّہ پہلے ہر گلی کی تنظیم اور لیڈرشِ بنا لیے تو پھر محلّہ لیول پر تنظیم ہوتو ہمارے شہر بھی لوکل لیول پر مسائل حل کر لیں گے۔ تو شہر بھی خوبصورت بن سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

اختتامیہ

میری تمام کتابیں پاکستان کی نشاۃِ ثانیہ کے جذبے کے تحت لکھی جاتی ہیں کیونکہ مغرب بھی نشاۃ ثانیہ کے ذریعے ہی تاریک دور سے کلچرل اور علمی ترقی یافتہ ہونے کے بعد ہی سائینس اور ٹیکنالوجی میں ورلڈ لیڈر بنا۔ renaissance کے دوران لوگوں کی سوچیں صرف ایک آئیڈیا سے شروع ہوئی تھیں کہ ہم اپنی موجودہ تکلیف دہ زندگیوں کو کیسے بہتر بنا سکتے ہیں یعنی نشاۃ ثانیہ ایک کلچرل موومنٹ تھی۔ یہ آرٹ، علم، اور بہت سی دوسری باتوں سے شروع ہوئی تھیں جس میں پریس کی ایجاد سے تیزی آئی تھی۔ ہمیں اپنے سے اور لیڈروں سے یہ سوال کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی کہ ہماری زندگیاں بہتر کیوں نہیں ہے اور اس کا جواب بھی ڈھونڈنا ہوگا۔ سیاسی اور مذہبی لیڈروں کے ذہنوں میں ایسے سوالات کا ڈر پیدا کرنا ہوگا تب حالات بہتر ہونگے۔

اسی طرح ایک آدمی کی نشاۃِ ثانیہ کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ہر آدمی میں کتنے مختلف علوم میں مہارت ہے۔اس لیے ہمیں بھی ہر پاکستانی کی مختلف علوم میں مہارت اور پاکستانیوں کے کلچر اور علمی بڑھوتری اوران کی زندگیوں یا اسلامی کلچر کی نشاۃ ثانیہ کی بات کرنی ہوگی۔ کیونکہ اسلامی کلچر بہترین کردار، اخلاق، آداب، انسانیت، بنیادی انسانی حقوق العباد، عیال اللہ کے لیے رحمت بننا اور بہترین معاملات پر مشتمل ہے۔یہی اسلامی نظام کا بھی بڑا حصہ ہے، باقی صرف اسلامی قوانین کا نفاذ رہ جاتا ہے۔ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ سسٹم ہمیشہ باکردار لوگ چلا سکتے ہیں تو اس ضرورت کے تحت بھی پہلے ہمیں انسان سازی کرنی ہوگی جیسے نبی کریم ﷺ نے مکہ کے تیرہ سالوں میں صحابہ کی جماعت تیار کی تھی۔

ہمارے علماء خود کہتے ہیں کہ مغرب میں اسلام نظر آتا ہے مگر مسلمان نہیں جبکہ

پاکستان میں مسلمان ملتے ہیں اسلام نہیں۔ ان کے اس فرمان کو بنیاد بنا کر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ اگر ہم مغرب کے ہر شعبہ زندگی کے انتظامی سسٹم ہو بہو اپنا لیں تو ہم مکمل اسلامی ملک بن جائیں گے۔ اس لیے ہمیں مذہبی تعصب چھوڑ دینا چاہیے اور پاکستان کلچر کو اسلامی کلچر میں تبدیل کرنے کے لئے، جاپان، چین، کوریا، سنگاپور کی مثالوں کی طرح، ہمیں بھی تمام مغربی سسٹم مکمل طور پر اپنا لینے چاہئیں۔ جس سے اسلام نظام کے لیے مطلوبہ کلچر صرف چند سال میں خود بخود درائج ہو جائے گا۔ اس کی مثال آپ ابوظہبی، دبئی، قطر میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے تمام سسٹم یورپ کی کاپی ہیں اور گورے ہی چلاتے بھی ہیں اور ہم ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اگر ہم مغربی کلچر کی نقل میں لوگوں کی سوچ بدل کر سچ بولنے لگیں اور انسانی ہمدردی کرنے لگیں تو ہم اپنے کلچر کو اسلامی کلچر بنا دینگے۔ اسلامی کلچر کے بنیادی عناصر اخلاقیات، آداب، حقوق العباد یا بنیادی انسانی حقوق، بہترین معاملات مغربی مما لک کے کلچر میں شامل ہیں اور انہوں نے ان سب کو کمال ترقی دی ہے۔ علامہ اقبال اسی لیے کہہ گئے ہیں کہ ان سے سیکھنے کو ایسے سمجھیں کہ آپ اپنے ہی سسٹم کو ترقی یافتہ حالت میں واپس لے رہے ہیں۔ ان سے سیکھنے سے، آسان اور فوری فوائد حاصل ہونگے۔

اس تبدیلی کے لیے ہمیں ہم وطنوں میں اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کے شوق کی اجتماعی سوچ پیدا کرنے سے شروع کرنا ہی ہوگا۔ چونکہ تعلیم وتربیت کے دو حصے ہوتے ہیں ایک انسان سازی، دوسرا پیشہ ورانہ تعلیم۔ تو سب سے پہلے مغربی اور جاپانی تعلیمی سسٹم کے ماڈل کو اپنا لیں کہ بچوں کو پہلے تین سال صرف انسان سازی یعنی زندگی گزارے کے اصول، مساوات، انصاف، سچ بولنا اور دنیاوی اور اسلامی آداب سکھائے اور پریکٹس کرائے جائیں۔ پیشہ ورانہ علم کی ابتدا اس کے بعد کی جائے۔

سوچوں سے ہی اعمال نکلتے ہیں، اس لیے ہمیں دو بنیادی نظریاتی سوچیں ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم صدیوں سے اپنے زوال کے مرض کی صحیح تشخیص ہی نہیں کر سکے، تو پھر صحیح علاج کیسے ہوگا۔ اسوۂ حسنہ کی سٹڈی کریں تو نبی کریم ﷺ جوانی

سے ہی معاشرے کی ابتر سوشل، مالی، معاشی حالت، ظلم وستم، بے انصافیوں، عدم مساوات کو دیکھ کر ہی سوچنا شروع ہو گئے تھے۔ تجارتی سفروں سے بیرونی دنیا کی بہتر حالت دیکھنے، ان سے موازنہ کرنے اور پھر غار حرا میں غور وفکر اور عبرت پذیری سے ہی انہوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ معاشرے کی نقصان دہ سوچوں کی وجہ سے ہی زندگی عذاب بن جاتی ہے، اس لیے غلط اور نقصان سوچوں اور عادات کو اپنے زمانے کی ترقی یافتہ، صحیح اور فائدہ مند سوچوں اور عادات میں بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرے کے انسانوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی کوشش کو ہی نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے بھی عربوں کی اور انسانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تھی کہ ان کی زندگی بہترین سسٹم کے تحت گزرنے لگیں

آرم سٹرانگ نے بالکل صحیح تشخیص کی ہے کہ "محمد ﷺ کوئی مذہبی عقیدہ نافذ نہیں کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کے دل ودماغ تبدیل کر رہے تھے۔ یعنی کلچر تبدیل کر رہے تھے" اور یہ کہ "محمد ﷺ زمان ومکان کی قید سے آزاد شخصیت کا نام ہے۔ جتنی ضرورت ساتویں صدی کی دنیا کو محمد ﷺ کی تھی، اتنی ہی ضرورت محمد ﷺ کی آج کی دنیا کو بھی ہے۔" اس لیے آج بھی ہمیں لوگوں کی سوچیں بدلنے کے لیے اسوۂ حسنہ کے مکی دور کی نقل سے ہی شروع کرنا ہوگا۔ پہلے انسان سازی سے سوچیں ٹھیک کرنی ہونگی تو سوشل زندگی خود ہی ٹھیک ہو جائے گی اور اسلامی نظام خود ہی پریکٹس میں آ جائے جائے گا۔ اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ بھی ہو جائے گی۔

میری سوچ کے مطابق ہمیں تین نظریات کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلا نظریہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اسلامی نظام کی بات کرتے رہے ہیں جس کا مطلب پہلے اپنے ملک پر سیاسی قبضہ کر کے فقہ نافذ کرنا ہوتا ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے سیاسی اسلام کہتے ہیں۔ اس کی کوششیں ہر اسلامی ملک میں فیل ہو چکی ہیں۔ اور کچھ ملکوں نے تجربے سے سیکھ لیا ہے کہ نظام بدلنے سے لوگ ٹھیک نہیں ہوتے بلکہ لوگ ٹھیک ہونے سے، وہ خود ہی وقت کے مطابق نیا نظام تشکیل بھی دیتے ہیں اور کامیابی سے چلاتے بھی

ہیں۔اس لیے انہوں نے سیاست اور مذہب کو علیحدہ کر دیا ہے کیونکہ اس سے مذہب کی شہرت کو زیادہ نقصان پہنچا ہے اور نئی نسلیں دین سے بھی اور علماء کرام سے بھی دور ہو رہی ہیں۔

دوسرا غلط نظریہ یہ ہے کہ ہم ہر وقت بڑے لیول یا macro level پر مسلم اُمہ کی نشاۃ ثانیہ کی بات کرتے ہیں جبکہ اسوۂ حسنہ کے مطابق پہلے لوکل علاقے کے لوگوں کی اصلاح کر کے بہترین کردار والے انسان تیار کئے جانے چاہئیں جو پھر دوسرے علاقوں کی سوچیں بدلیں۔اس لیے ہمیں سب سے پہلے صرف اپنے گھر، پاکستان کی عوام کی سوچوں کو ٹھیک کرنے سے ہی شروع کرنا ہوگا، جو انتہائی غلط ہو چکی ہیں۔اور ہم دور جاہلیت کی پریکٹیکل مثال پیش کر رہے ہیں۔

تیسرا غلط نظریہ یہ رہا ہے کہ ہم نے اس دنیا کا جنت نظیر نہیں بنانے کی کبھی بات نہیں کہ جبکہ یہ دنیا ہی آخرت کی جنت حاصل کرنے کے لیے کھیتی قرار دی گئی ہے جس میں ہم نے انسانیت کی خدمت اور اخلاق اور کردار کے بہترین اعمال بونے ہیں۔اس کے برعکس ہم دنیا کی زندگی کو اہمیت نے دینے کی بات کرتے رہے ہیں۔ہم نے اسی دنیا میں طاقتور بن کر عزت سے رہنا ہے جیسے صحابہ کرام نے کر کے دکھایا تھا اس لیے ہمیں بھی آج کی دنیا کے طاقتور بننے کے اسباب علم۔صنعت،معیشت،تجارت، دفاع سب میں فوری طور نشاۃ ثانیہ کرتے ترقی کرنی ہے۔یہ سب اجتماعی کام ہیں۔ پہلے ہی ستر سال ضائع کر دیئے ہیں۔

ہمیں پاکستان کی فوری اور تیز نشاۃ ثانیہ کے لئے، دوسرے ترقی یافتہ ملکوں سے ہی سیکھنا ہوگا۔جیسے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کیسے ہوئی، مشرقی مما لک میں جاپان کی مثال کی اس نے کیسے تیس چالیس سال میں ہی مغربی مما لک کے مقابلے کی سیاسی، صنعتی، معاشی اور فوجی طاقت بن گیا تھا۔ ہمارے دور کی زندہ مثالوں، چین، جنوبی کوریا، ترکی، ملائیشیا سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ان سب میں ایک چیز مشترک پائیں گے اور وہ ہے کہ پہلے انسانوں کے کردار سازی کر کے سوچیں ٹھیک کی جائے تب وہ سوشل، صنعتی، تعلیمی۔ معاشی، تبدیلی لاسکیں گے ورنہ نہیں۔

اس لیے اس کتاب کے ذریعے میری زندگی کا مقصد پاکستان کی نشاۃ ثانیہ کی سوچ پیدا کرنا اور دعوت دینا، دماغوں کو ٹر گر کرنا ہے۔ جو اسوۂ حسنہ کی سنت پر عمل کرنا ہی بنتا ہے۔ اور پھر ہم ہی رول ماڈل بن کر نشاۃِ ثانیہ کا پیغام دوسرے اسلامی ملکوں تک پہنچانے اور قائل کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور شاید لیڈر شپ بھی سنبھال سکیں۔ اس لیے میں اسوۂ حسنہ کو ہمیشہ سوشل زاویئے سے دیکھتا ہوں اور سٹڈی کرتا ہوں مذہی لحاظ سے نہیں کرتا۔ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی زندگی کا زیادہ حصہ تو نئ سٹیٹ کے تمام دنیاوی معاملات کو منظّم کرنے اور تعلیم دینے میں گزرا تھا۔ اس لیے انسانی زندگی کا اہم ترین حصہ معاشرتی حصہ اور کلچر ہی ہوتا ہے۔

مولانا وحید الدین اس کی نشان دہی کر چکے ہیں کہ ہم نے صدیوں سے آپ ﷺ کی زندگی سے معاشرتی زندگی کے اصول نکالنے اور ان کو اپنی زندگیوں میں سمونے کا کام سیکھا ہی نہیں ہے۔ اسی لیے ہم پاکستانی، حقیقت پسند قوم نہیں بن سکے اور صرف جذباتی لوگ بن گئے ہیں۔ ہم سے یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ ہم ہر بات کو صرف مذہبی زاوئے سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں پھر سے مذہبی مخلوق بننے کی بجائے انسانی اور سوشل مخلوق بن کر اسلامی کلچر کو زندہ کرنا ہے جس کی جھلک میں نے اسوہ رسول کریم کی سنتوں کو معاشرتی کلچر میں پریکٹس کرنے کو تعارف کرا کر شروع کیا ہے۔

ترقی کے لیے ملک میں پائیدار امن کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے معاشرے کے تمام افراد کا آپس میں محبت کا تعلق اور رشتہ ہونا چاہیے۔ اس لیے سیاسی ،معاشرتی تنظیم نو کے لیے مسلمان ممالک کو میثاق مدینہ کے اسوۂ حسنہ کی طرف ہی لوٹ کر سیکھنے کی ضروت ہے ہے جس کو ہم سنت گنتے ہی نہیں۔ جبکہ اسکو امریکہ کے لاء کالجز میں ''دنیا کے پہلی تحریری آئین'' کے طور پڑھایا جاتا ہے۔ اس لا کالج کی سٹڈی سے صرف ایک سبق جو مغرب نے سیکھا ہے، ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

What solutions do each of the documents propose for living in ـpeace together?

یعنی میثاق مدینہ سے مختلف قبائل، کثیر المذاہب، کثیر الکلچر معاشرے میں بشمول یہود، پرامن بقاء باہمی اور پیار سے رہنے کے حل تجویز کیئے گئے تھے۔ ہم میثاق مدینہ سے یہاں بھی پائیدار معاشرتی، مذہبی امن قائم کرسکتے ہیں جس کے لیے نئی سوشل تنظیم کی ضرورت ہوگی جو صنعتی معاشرے کے اصولوں پر مبنی ہو۔ یہ اسوۂ حسنہ کے دوسرے حصے میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

ہر بندہ سپیشل بندہ ہوتا ہے۔ اسے اپنی زندگی کے تجربات، اسباق، نتائج کو، جن کو کوئی اور کوئی duplicate نہیں کرسکتا، دوسروں تک منتقل کرنے چاہئیں، تبھی ہم ترقی کرسکیں گے۔ اسے ہی اجتماعی دانش کہتے ہیں۔ مغربی ممالک اس کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو لکھنے کی عادت اپنانی چاہئے۔ یہ نہ سوچیں کہ میں نہیں لکھ سکتا۔ آپ بس لکھنا شروع کریں۔ آہستہ آہستہ بہتر ہوتے جائیں گے۔ جب بہتر ہوجائیں تو تب چھاپنے کی طرف بھی آئیں اور دوسروں سے شیئر کریں۔

ہمیں اجتماعی دانش سے سیکھنے اور فائیدہ اٹھانے کی عادت بناتے اس میں خواتین کو بھی شامل کرنا ہوگا۔ خواتین کو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے مردوں سے زیادہ اہم پیدا کیا ہے۔ ان کے ذمہ اگلی نسلوں کی تیاری ہوتی ہے۔ ماں کی گود سے ہی نئی نسل تیار ہوتی ہے جو نظریات وہ بچپن میں دیتی ہیں وہ ساری عمر ساتھ رہتے ہیں۔ آداب سکھانا بھی خواتین کی ذمہ داری ہے، کریکٹر بلڈنگ بھی انہی کا شعبہ ہے۔ تہذیب، رسومات، کلچر، زندگی میں خوبصورتی کی سمجھ صرف انہی کو دی گئی ہے۔ اس لیے ان کا زندگی میں حصہ لینا بہت اہم ہے۔ ماضی میں ہم نے ان کو کم عقل قرار دے کر فیصلے کرنے سے نکال دینے کی کوشش کی ہے مگر یہ سچ اور حقیقت ہے کہ ہر گھر میں زیادہ فیصلے عورت ہی کرتی ہے، تو پھر بے عقل کیسے ہوئی۔ عورتیں آبادی کا نصف ہیں تو کیا آدھی آبادی کی اجتماعی دانش سے فائیدہ نہ اٹھانا قومی نقصان نہیں ہوگا۔

اس کتاب کا مقصد آئیڈیا پھیلانا اور قارئین کی رائے کے بعد دوسرے حصوں کو بہتر بنا کر لکھنا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی فیڈ بیک سے ضرور

نوازیں۔ ایک ٹیلیفون کال، ایک ای میل سے رائے اور نقائص سے آگاہ کریں اور تجاویز ضرور دیں۔ یاد رہے تو مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں۔

یہ کتاب پسند آئے تو دوسروں سے شیئر کریں۔ گورے کہتے ہیں sharinig is caring۔ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ نعمت کا شکر یہ یہ بھی ہے کہ اسے پھیلایا جائے۔ یقین کریں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ یا renaissance میں ہم عام مسلمانوں ہی کا بہت اہم اور میجر رول بنتا ہے۔ کیونکہ کام کو سرانجام دینا ہم عام مسلمان ہی کا کام ہوتا ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔

''اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر بھولیں یا خطا کریں۔ اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تو نے اگلوں پر، اے رب! ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے جس کی طاقت نہیں ہم کو، اور درگزر فرما ہم سے، اور بخش ہم کو، اور رحم کر ہم پر: تو ہمارا آقا اور مولی ہے اور مدد کر ہماری قوم کافر پر۔''

(بقرہ۔286)

وما توفیقی الا باللہ العظیم

راولپنڈی

امتیاز علی

☆......☆......☆

ضمیمہ جات

تحت الشعور کیسے کام کرتا ہے؟

میں نے تحت الشعوری ذہن بارے ابتدائی معلومات دینی ضروری سمجھی ہیں کیونکہ اسی سے عادات، عقائید بنتے ہیں۔ مگر سیرت کے دوسرے حصے میں اس پر سیر حاصل بحث کی جائے گی کیونکہ مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہم فطرت اور قدرت کی سچائیاں ماننا بند کر دیا ہے۔ جبکہ ترقی صرف سچائیاں مان لینے سے ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آدمی کے ذہن کے دو حصے ہیں ایک شعوری اور دوسرا تحت الشعوری۔ یہ مشترکہ ورکشاپ اور سٹور کی طرح ہے جس میں ایک ہی مستری کام کرتا ہو۔ ورکشاپ میں روشنی ہے یعنی شعوری ذہن میں جو کہ حواس خمسہ سے فیڈ لیتا ہے اور فیصلے کرتا ہے جبکہ سٹور میں اندھیرا ہوتا ہے، تحت الشعور میں کیونکہ اس سٹور میں مستری نے جو جو چیزیں سالوں پ سے رکھ رہا ہے، ان کے بارے میں بھول بھی گیا ہے کہ اندر کیا کیا پڑا ہے۔ مگر رہتی وہ محفوظ ہیں اور جب ضرورت پڑے تو اندر جا کر باہر روشنی میں لے آ سکتا ہے۔

The duality of mind You have only one mind, but your mind possesses two distinctive characteristics. The line of demarcation between the two is well known to all thinking men and women today.The two functions of your mind are essentially unlike.Each is endowed with separate and distinct attributes and powers. The

nomenclature generally used to distinguish the two functions of your mind is as follows: The objective and subjective mind, the consciousand subconscious mind, the waking and sleeping mind, the surface self and the deep self, the voluntary mind and the involuntary mind, the male and the female, and many other terms. You will find the terms “conscious” and “subconscious” used to represent the dual nature of your mind throughout this book.

شعوری حصہ

شعور سوچنے، دلائل، حساب، logic, calculations کچھ کرنے کا کام کرتا ہے جب آپ جاگ کر یہ کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ کمپیوٹر کے software کی طرح ہوتا ہے

تحت الشعوری حصہ ریڑھ کی ہڈی کے اوپر Medula Obogata ہوتا ہے جو تحت الشعور کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ جسم کے خود کار حصے کے سوچ بورڈ switch board کا کام دیتا ہے۔ یہ حصہ ذہن کے شعوری حصے کو روزانہ کے افعال سوچ سمجھ کر کرنے سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور اسے دوسرے کام سوچنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اور دن کے روزانہ کے کام شعوری حصے کو بغیر سوچ کے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور یہ کام کاج صرف اسی صورت شعوری سوچ کے ساتھ کئے جاتے ہیں جب تحت الشعور کے فعل میں خرابی ہو۔۔ جو چیز بھی ابھی شعور میں نہیں وہ دوسرے حصے میں سٹور ہو جاتا ہے، جس میں اعتقاد، ماضی کے تجربات، یادیں، تصویریں یا شکلیں جو دیکھی ہیں، زندگی کے واقعات جن سے گزرے ہیں، تمام پیشے یا سکلز جو سیکھی ہیں۔ سب اس میں ہوتی ہیں۔ یہ کمپیوٹر کی hard disk کی طرح ہوتا ہے۔ کہ کمپیوٹر کا پروگرام خراب یا کرپٹ بھی ہو جائے تو ہارڈ ڈسک میں آپ کا سارا کام محفوظ ہوتا ہے اس سے نکال سکتے ہیں۔

تحت الشعور کے ذریعے ہی جسم کام کرتا ہے۔ اور روزانہ کے کام عادات

کے تحت کرتا ہے یہ جسم کے تمام اعمال جیسے کھانا، سانس لینا، ہاضمہ دل کی حرکت وغیرہ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اگر آپ سانس کچھ دیر کے لیے کنٹرول کرنا چاہیں گے تو یہ شعوری حصہ کرے گا مگر جونہی آپ شعوری کنٹرول کرنا بند کریں گے تو دوسرا حصہ ٹیک اوور کر لے گا۔

ان دونوں حصوں کا کام سمجھنے کے لیے یہ مثال اچھی ہے جب آپ شروع میں ڈرائیونگ سیکھتے ہیں تو آپ صرف شعوری حصے کو استعمال کر کے ڈرائیونگ پر توجہ دے سکتے ہیں اور ساتھ ہی موبائل فون استعمال نہیں کر سکتے یا ادھر ادھر بھی نہیں دیکھ سکتے صرف سیدھے دیکھتے ہیں۔ مگر جب بار بار کی پریکٹس ست ایکسپرٹ ہو جاتے ہیں تو یہ کام تحت الشعور میں ریکارڈ ہو جاتا ہے اور پھر تحت الشعور ہوائی جہاز کے آٹو پائلٹ کی طرح بن جاتا ہے، ڈرائیونگ کا کام کو دسنبھال لیتا ہے اور شعوری ذہن کو آزاد کر دیتا ہے اور ڈرائیونگ کے ساتھ آپ باتیں بھی کر سکتے ہیں اور فون بھی استعمال کر سکتے ہیں ادھر ادھر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یعنی ڈرائیونگ کی عادت اب تحت الشعور نے ٹیک اوور کر لی ہے۔ اور شعوری حصہ نئے کام کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔

جب آپ زخمی ہو جاتے ہیں تو تحت الشعور کا ذہن زخمی ہوتے ہی ٹرگر ہو کر خود بخود ہی جسم کا خون روکنے کا سسٹم شروع کر دیتا ہے۔ کھال بھی نیچے سے نئی بننی شروع ہو جاتی ہے۔ آپ کو سوچنا بھی نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر جب پٹی کرتا ہے تو صرف انفیمشن روکنے کے لیے کرتا ہے، باقی کام ذہن ہی کرتا ہے۔ جب کسی کو دیکھ کر آپ کے جذبات ایک بھڑک اٹھتے ہیں یا غصہ ہو جاتے ہیں تو یہ آٹومیٹک کام تحت الشعور ہی ٹرگر ایکشن کے طور پر کرتا ہے مگر ٹرگر ایکشن شعوری ذہن کرتا ہے۔ یا لیکچر دیتے ڈر یا گھبراہٹ بھی ذہن کے اسی حصے سے ٹرگر ہوتی ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے۔ کہ کریکٹر بھی تحت الشعور کے ذریعے ہی بنتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم تحت الشعور کو براہ راست کنٹرول کر کے کریکٹر کو ترتیب دے سکیں۔ اگر یہ ممکن ہوا تو پھر یہ سب سے حیرت انگیز چیز ہوگی۔

انا، یا، ذہنی چوٹ سے بچانے کے لیے تحت الشعور کا دفاعی نظام

جسمانی چوٹ کی طرح، جب ذہنی یا جذباتی طور پر زخمی ہوتے ہیں یا نقصان پہنچتا ہے تو بھی جسم کا دفاعی نظام حرکت میں آ جاتا ہے۔جس کو انا کا دفاعی نظام کہتے ہیں۔ یہ بھی تحت الشعور کا ہی نظام ہے

آپ ذہن کو کمپیوٹر سمجھ لیں۔اس میں تمام انفارمیشن بطور پروگرام اس میں سٹور ہوئی ہوتی ہے۔مثلاً ڈرائیونگ انفارمیشن بطور سافٹ وئر موجود ہے۔ ایسے ہی جذبات کے بھی سافٹ ویر موجود ہیں۔اگر کسی نے آپ کو تنگ کیا تھا اور آپ غصہ ہوئے تھے تو یہ بھی سافٹ وئر کے طور تحت الشعور میں محفوظ پڑا ہوگا۔اور جب بھی آئندہ کوئی تنگ کرے گا تو آپ اسی طرح ہی غصہ ہو جائینگے جیسے کہ پہلی بار ہوئے تھے۔ برداشت نہیں کریں گے۔ یہ کیسے کام کرتا ہے دیکھئے کہ تحت الشعور کا ذہن کیسے ردعمل کر کے ذہنی چوٹ بچاتا ہے۔

پہلا طریقہ: **سچ یا حقیقت ماننے سے انکار کر دینا۔** مثلاً کسی کی وفات کو نہ ماننا یا ڈاکٹر پر الزام رکھ دینا یا خطرے کا ماننے سے انکار کرنا یا کسی نا خوشگوار واقع کو نہ ماننا۔اس طریقے میں خرابی یہ ہے کہ جب تک آپ سچ یا حقیقت مانیں گے نہیں، تو آپ اس کو بھول نہیں سکیں گے یا اس کا علاج نہیں کر سکیں گے۔

دوسرا طریقہ: **Displacement یا منتقل کر دینا۔** اس میں آپ اپنے جذبات کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دیتے ہیں، جو جواب نہ دے سکے، جیسے باس پر غصے نہیں ہو سکتے تو اس کی جگہ گھر آ کر بچے پر غصہ ہو جانا۔آپ کو چاہیے کہ اپنے دشمن کی پہچان کریں اور اس کا غصہ معصوم لوگوں پر نہ اتاریں۔

تیسرا طریقہ: **Repression**۔یعنی ناپسندیدہ واقع کو بھولنے کی کوشش میں

یاد داشت کھو بیٹھنا۔ یہ دراصل آپ کے تحت الشعور نے کیا ہوتا ہے تا کہ آپ کو نقصان نہ پہنچے۔

چوتھا طریقہ: **Projection**۔آپ ناپسندیدہ بات کا الزام دوسرے پر پھینک دیتے ہیں۔مثلاً کہ آپ کے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ ٹیچر کا تعصب تھا۔

پانچواں طریقہ: **Rationalization**۔غلطی کو صحیح ثابت کرنا، اپنے غلط کام کی توجیہ دے کر صحیح ثابت کرنا۔مثلاً ہم نے اپنے کرائے دار کو بجلی چوری پر پکڑ لیا تو کہنے لگا کہ حکومت ہمارے ٹیکسوں کو صحیح نہیں استعمال کر رہی اور ہمیں اس کے بدلے کچھ نہیں ملتا تو ہم صحیح کر رہے ہیں یا سٹوڈنٹ کہے کہ امتحان میں نقل اس لیے ماری کہ سب یہی کر رہے ہیں۔

چھٹا طریقہ: **Suppression**۔ناپسندیدہ واقع یا فیصلے کو کرنے کی بجائے دبا دینا یا بھولنے کی کوشش کرنا یا اس کے بارے سوچنے سے اجتناب؛۔ضز بات کو دبا دینے سے بہت برا اثر پڑتا ہے اور اس سے ڈیپریشن ہو جاتا ہے اور موڈ بدلتے رہتے ہیں۔ایکدم سے خوش ایکدم ناراض۔ڈیپریشن دراصل مسائل کے حل کو التوا میں ڈالنا اور ان کو جمع ہوتے رہنے دینا ہی ڈیپریشن کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔جو لوگ مسائل کا کوئی بھی عارجی حل بھی فوراً تلاش کر لیں تو وہ کوش رہتے ہیں۔جو ان کو جمع کرتے ہین تو پھر تحت الشعور ان کا حل ڈیپریشن کی سورت میں نکالتا ہے

ساتواں طریقہ: **Sublimation**۔اپنی وہ خوہشات جو سوشل لحاظ سے ناپسندیدہ ہوتی ہیں ان کو پسندیدہ افعال میں بدل دینا۔ جیسے

مار کٹائی کی خواہش پورا کرنے کے لیے باکسر بن جانا۔

آٹھواں طریقہ: **Regression**۔ **بچپنا دکھانا**۔ مثلاً مسائل حل کرنے کی بجائے رونے لگ جانا۔

نواں طریقہ: **Identification**۔ اپنی وقعت بڑھانے کے لیے کہنا کہ فلاں چوہدری میرا دوست ہے یا ہمارا فیملی فرینڈ ہے۔

دسواں طریقہ: **Undoing**۔ معافی مانگ لینا یا غلطی کی تلافی کرنا۔

گیارھواں طریقہ: **Fantasy**۔ خیال یا تصور میں وہ کرنا جو اصل میں نہیں کر سکتے۔ جیسے باس کو کیال میں مارنا جو اصل میں ممکن نہیں۔

بارھواں طریقہ: **ReactionFormation**۔ اپنی خوہش کے برعکس کام کرنا جیسے دشمن کو گرمجوشی سے ملنا یہ دکھانے کے لیے کہ مین تمہین دوست سمجھتا ہوں۔

تیرھواں طریقہ: **Humor**۔ بات کو مذاق میں لینا یا کرنا یا سیریس بات کو ہلکا لینا؛۔ کسی ناپسندیدہ واقع کو لطیفہ بنا کر یا ہنس کر ٹال دینا۔

چودھواں طریقہ: **Compensation**۔ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ لینا مثلاً کہنا کہ میں ڈرتا نہیں جبکہ فلم میں ڈر لگ رہا ہو۔

پندھرواں طریقہ: **Affiliation**۔ کسی دوسرے سے مسئلہ کے حل کے لیے مدد مانگنا۔

سولھواں طریقہ: **Dissociation**۔ حقیقت کو تسلیم نہ کرنا۔

ان سب طریقوں میں سے بعض مددگار ہوتے ہیں جبکہ کچھ نہیں ہوتے۔ دیکھیں کہ آپ کون سا طریقہ استعمال کر رہے ہیں اگر وہ کام کر رہا ہے تب تو ٹھیک ورنہ کوئی اور طریقہ استعمال کریں۔

جذبات کیا ہیں؟

جذبات دراصل ایک پیغام دے رہے ہوتے ہیں مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ میں تکلیف میں ہوں یا میں مر رہا ہوں یا میں اب اس کام کو ہینڈل نہیں کر سکتا تو دراصل آپ کا تحت الشعوری ذہن آپ کو مدد کے لیے پکار رہا ہوتا ہے۔ کہ کچھ کرو۔ کیونکہ اس کے علاوہ اسے سمجھ نہیں آ رہی ہوتی کہ وہ کیا کرے۔ اس لیے وہ آپ کو تنگ کر رہا ہوتا ہے کہ آپ کچھ کریں۔ یہ مثالیں دیکھ کر سمجھ لیں کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔

اندھیرے کا خوف ہو تو کہے گا، یہ جگہ محفوظ نہیں یہاں سے نکل جانا چاہئے، احساس تنہائی، یا معاشرتی طور پر غیر محفوظ ہونے کا احساس ہو تو کہتا ہے۔ مجھے لوگ چاہئیں دوستی بڑھانی چاہئے۔ کسی سے نفرت ہو تو کہے گا۔ فلاں شخص مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے مجھے اس کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ ڈیپریشن ہو تو کہے گا:۔ مجھے مزا نہیں آ رہا، کہیں اور چلتے ہیں یا گھر چلیں۔ محبت ہو تو کہے گا۔ فلاں بندہ ضروری ہے دیکھ لیں کہ وہ میرے پاس رہے۔ پریشانی ہو تو کہے گا:۔ میرے خیال میں یہ میں ہینڈل نہیں کر سکتا۔ پلان بناؤ۔ مجھے اعتماد کی ضرورت ہے۔

ایسے ہی تمام جذبات دراصل تحت الشعور کی طرف سے پیغام ہی ہوتے ہیں اور جونہی کسی جذباتی حالت کا حل نکلتا ہے یا نکلتا نظر آتا ہے تو وہ حالت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ بھوک کی حالت میں جونہی پہلا نوالا منہ میں جاتا ہے تو بھوک آدھی کم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک کے پیغام کا کھانے کی موجودگی حل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی صرف موجودگی ہی اس کی سختی کم کر دیتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی پریشانی کا ممکنہ حل آپ لکھ لیں تو آدھی پریشانی فوراً ختم ہو جاتی ہے یا آپ ڈاکٹر کو یا دوست کو جب پریشانی کا ذکر کریں تو آدھی پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے جو شخص مسئلہ آتے ہی اس کے حل میں لگ جائے تو اسے پریشانی یا ڈیپریشن نہیں ہوتا، جو دیر کرتے ہیں یا آنکھیں بند کرتے ہیں یا تحت الشعور میں پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں ہی ڈیپریشن ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ذہن ہی کا حل ہوتا ہے کہ کچھ کرو۔ سچ کا سامنا کرنا اور قبول اور برداشت کر لینا ہی حل

ہوتا ہے۔ اگر کوئی آپ کو مدد کے لیے پکارے تو آپ یقیناً اس کی مدد کریں گے۔ اسی طرح اگر پکارنے والا آپ کا ہی اپنا ذہن ہو تو اس کی پکار کو بھی سنیں اور اس کی بھی مدد کریں، اور جو کچھ بھی ممکن ہو کریں۔ اور اس کی ضرورت کو پورا کریں۔

کسی کو نہ بھولنے کی وجہ۔ لوگ کسی برے تجربات کو نہ بھولنے کی اصل وجہ ، جیسے کسی مرے ہوئے پیارے کو بھولتے نہیں، یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کے بارے غلط نظریات تحت الشعور میں سٹور کر کے رکھتے ہیں۔ مثلاً کہ باپ دادا کی رسوم یا پرم پرا کو نبھانا ہمارا فرض بنتا ہے۔ حالانکہ انہیں زندگی کے نئے حقائق کے قبول کرنا چاہیے اور نئے فیصلے کرنے چاہئیں یا بزرگوں بارے یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ پرفیکٹ تھے، یا میری روح ہیں۔ ان جیسے عقائد سے چھٹکارا پا کر ہی آپ نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ضرورت سے زیادہ محبت یا کسی کے ساتھ غیر حقیقت پسندانہ تعلق کی گہرائی نہ رکھیں کیونکہ ان کے بغیر بھی آپ زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ اور وہ اپنا رول ادا کر کے واپس اللہ کے پاس جا سکتے ہیں اور آپ نے اپنا رول ابھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ جو زیادہ اہم بات ہے اور آپ نے ہی بزرگوں کا کارناموں کو نئی جہت دینی ہے۔

دونوں ذہنوں کی ٹیم کو استعمال کر کے ہی بہترین کام لیا جا سکتا ہے۔ شعور کچھ کام کر کے اسے تحت کے حوالے کر دے جبکہ تحت فیڈ بیک کے طور پر جذبات کی انفارمیشن شعور کو بھیجتا رہے۔ جذبات دراصل پیغامات کے علاوہ کچھ نہیں جو کہ وہ شعور کو انفارم کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ دونوں کے بارے جان کر آپ اپنی مہارت یا سکلز بہتر بنا سکیں گے اور آپ کا جذبات پر کنٹرول بھی ہو جائے گا۔ جو کہ ہر لیڈر اور کامیاب آدمی کے لیے ضروری ہے۔ یعنی مائینڈ سیٹ mindset چینج کرنے کی ضرورت ہے۔

(ریفرنس ڈاکٹر فاروق کی ویب سائٹ 2knowmyself.com)

تحت الشعور ہماری زندگیوں کے نوے فیصد کو کنٹرول کرتا ہے

ڈاکٹر بروس لپٹن، سٹینفورڈ میڈیکل سنٹر کے مطابق تحت الشعور ہماری زندگیوں کے نوے فیصد کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور اس کے اندر کے خیالات ہی ہر بات کنٹرول کرتے ہیں کہ آپ کتنے خوش ہونگے، کتنے کامیاب یا تعلقات کتنے اچھے ہونگے۔ اگر آپ نے تحت الشعور کی پروگرامنگ غلط کی ہے اور اس میں کامیابی کی امید کی جگہ ناکامی کا ڈر ڈالا ہے تو آپ چاہیں کتنا علم حاصل کر لیں، کتنی محنت کر لیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے تحت لشعور کے پروگرام کو تبدیل کر کے آپ زندگی میں تبدیلی لانے اور کامیابی کی طرف پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ بہت آسان بھی۔

اسی بات کو مذہب کے لحاظ سے دیکھیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں۔ اگر وہ اچھی امید لگائے گا تو اسے وہی ملے گا۔ اگر برا سوچے گا تو وہی ملے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو سختی چاہتا ہے اس پر سختی ہے۔ اللہ کلام پاک میں فرماتا ہے کہ میں تمہارے لیے آسانی چاہتا ہوں سختی نہیں۔ جب وہ آسانی دے تو وہ استعمال نہ کرنا اس کی حکم عدولی ہے اور اس کی ناراضگی کا باعث ہوگا، یہ خدا کی بندوں کے لیے محبت اور رحمت کی بے عزتی اور ناقدری ہوگی۔ اس لیے خدا کو ہمیشہ نرمی سے سمجھو اور اس کے سامنے نرم رہو۔ ایک بدو نے اللہ سے پوچھا کہ قیامت کے دن حساب کون لے گا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بدو خوشی سے جھوم اٹھا اور بولا کہ پھر تو ہم بخشے گئے۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کیسے تو کہنے لگا کہ اللہ کریم ہے اور کریم جب قابو پالیتا ہے تو معاف کر دیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور جب تک وہ نظر آتا رہا تو آپ فرماتے رہے کہ اس نے اللہ کو پہچان لیا۔

مراقبہ کیا ہے؟

یہ اپنے تحت الشعور کی پرامنگ کا طریقہ ہوتا ہے۔ ہم نے مراقبہ کو صرف مذہبی

سمجھ لیا ہے جبکہ یہ دراصل اپنے تحت الشعور کی پرامنگ ہے جو کہ self suggestion کے ذریعے، اپنے آپ سے بات کرکے۔ روزانہ یا دن میں بار بار یاد دہانی کر کے کرتے ہیں۔ جس سے پرانی پروگرامنگ ختم کر دیتے ہیں۔ اس سے دراصل ہم اپنے ارادے اور پلان اور نتائج جو حاصل کرنا چاہتے ہیں تحت الشعور کے حوالے کر دیتے ہیں جو پھر ان کو عمل شکل دینے کے لیے چل پڑتا ہے۔ اور کائنات کی تمام قوتوں کو استعمال کر کے ممکن بنا دیتا ہے۔ جیسے کہ ہم کسی کا سوچتے ہیں تو وہ پیغام اس تک پہنچا دیتا ہے اور اس کے دل میں بھی آپ کا خیال ڈال دیتا ہے۔

تقدیر کیا ہے؟

اللہ ایک سے دوسرے کو آزماتا ہے، کوئی بھی تعلق ہمیشہ قائم نہیں رہتا ہر کوئی کچھ سکھانے کے لیے آتا ہے آپ کا اس پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا کہ وہ آپ کے ساتھ کیسا کرے گا مگر آپ اس کا ردعمل کنٹرول کر سکتے ہیں اور او وہ اپنا کام کر کے رخصت ہو جائے گا اس سے کیا سیکھتے ہیں یہ زیادہ اہم ہے۔ یہاں بھی تحت الشعور آ جاتا ہے۔ اگر ردعمل نہ کرنے کی تحت الشعور کی پروگرامن کی ہوئی ہے تو کوئی کتنا بھی غصہ دلائے آپ غصہ نہیں ہونگے۔ نبی کریم ﷺ اسی لیے کبھی غصہ نہیں ہوتے تھے۔

عقائد اور عادات کیسے بنتے ہیں اور کیسے بدلے جا سکتے ہیں؟

نظریات، عقائد، عادات، رسومات مذہبی بھی ہو سکتے ہیں سیاسی بھی،، ذاتی، خاندانی، ملکی، ورک پلیس کے بھی وغیرہ میں ہوتے ہیں صرف مذہب میں نہیں ہوتے۔ سچ بات تو سچ ہوتی ہی ہے مگر ایک ہی غلط یا منفی بات کو بار بار کہنے، سننے سوچنے سے تحت الشعوری ذہن یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے اور اس کو سچ مان کر تحت شعور اس کو بطور اصول یا عقیدہ عادت رسم، نظریہ ریکارڈ کر لیتا ہے اور پھر جب بھی کوئی بات شعور اس کو بھیجتا ہے تو اس نتیجہ سے مقابلہ کر کے ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی کہی بات سچ ہے یا غلط۔ مثلاً اگر کوئی فرد سوچتا رہے کہ میں فیل ہو گیا ہوں تو وہ اس کا عقیدہ بن جائے گا اور کا ہر بار

مشکل پیش آئی تو ذہن بتائے گا کہ تم کامیاب نہیں ہوسکو گے۔ اپنی سوچ کے علاوہ، دوسرے لوگ، کتاب، میڈیا، لیکچر خطاب، بھی غلط خیالات آپ کے ذہن میں ڈال سکتے ہیں، مثلاً کہ تم کوئی چیز ٹھیک نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر آپ کے ذہن میں کوئی عقیدہ ہے تو اس کے مخالف بات ایک دو بار سن کر وہ عقیدہ بدلے گا تو نہیں مگر ذہن میں شک پڑ جاتا ہے یا عقیدہ کمزور ہونا شروع ہو جائے گا۔ سیاست دان، مذہبی رہنما، بزنس کے اشتہار یہی کرتے ہیں کہ بار بار اپنی بات کی یاددہانی کر کے برین واش کرتے رہتے ہیں اور آپ کو سوچنے اور اس کے صحیح یا غلط ہونے کی مہلت نہیں دیتے۔ ہر طرف میڈیا، نیوز پیپر، ٹی وی ڈرامے، فلمیں، ۔ انٹرنیٹ، افواہیں، حکومت کی کرکردگی، معاشرے کی اخلاقی منفی صورحال کی خبروں سے اب، لوگوں کو منفی تاثر ہی ملتا ہے، مستقبل تاریک نظر آتا ہے، ۔ امیدیں کم ہوگئی ہیں۔ اگر اس منفیت کو ہم مثبت خیالات سے کینسل نہ کریں تو ذہنی مریض بننا شروع ہو جاتے ہیں۔

جیسے نظریات، عقائد عادات رسومات وغیرہ بنتے ہیں، ان بدلنے کے لیے بھی وہی طریقہ استعمال کرتے ہیں جن سے یہ بنے تھے۔ یعنی ان کو بدلنے کے لیے پہلے کی ریکارڈنگ کو حذف کر کے ان کی جگہ مثبت سچائی کو بار بار دہرانا ہوتا ہے جس سے تحت الشعور پرانی ریکارڈنگ ختم کر کے نئے بات کو سچ مان کر ریکارڈ کر لیتا ہے۔ اس تبدیلی کے لیے عموما چالیس دن چاہیے ہوتے ہیں مگر زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔

جب آپ کچھ سوچ لیں کہ میں نے کیا کرنا ہے تو پھر اس کو ہزار بار دہرائیں کہ کیا کرنا چاہتا ہوں اور میں کرسکتا ہوں تو بند دروازے اور نئے راستے، نئے مواقع کھلنے شراع ہو جائیں گے اور جو مقاصد، بڑائی عزت چاہتے ہیں مل جائے گی۔

He who lives his ideals is creating a life that actually is ideal.There is nothing in your life that you cannot modify, change or improve when you learn to regulate your thought.

ہمارے زیادہ تر سوچیں، غلط ہوگئی ہیں نظریات، عقائد، کرپٹ کر دیئے ہیں،

عادات اور رسومات نقصان دہ ہیں۔ یہ سب سیاسی، مذہبی، معاشرتی لیڈر، چوہدری مل کر اپنے مفادات کے تحت کرتے ہیں، مگر عوام کے ہمدرد بن کر۔ میری بات کی سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ کسی ایک پیغمبر کی شریعت کو اس کے علماء ہی کرپٹ کرتے ہیں جن کو ٹھیک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو لگاتار پیغمبر بھیجنے پڑتے رہے ہیں۔ کلام پاک انسانیت کے چار استحصال کنندگان کی نشان دہی کرتا ہے۔ فرعون یعنی بادشاہ حکمران، دوسرے ہامان، وزراء، ایم این اے ایم پی اے بیوروکریسی، تیسرے قارون، مال دار اشرافیہ، لینڈ لارڈ، بزنس مین انڈسٹریلسٹ، بینکر وغیرہ اور چوتھے آذر، یعنی مذہبی رہنماء علما اور مشائخ، پیر سجادہ نشین۔ یہ سب ایک دوسرے کو سپورٹ کرتے ہیں۔ ہماری موجودہ صورت حال میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اپ خود سوچ کر نتیجہ نکال لیں کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں کہ نہیں۔

ان سب کے دیئے نظریات کو قرآن سنت، انسانی فطرت کے اصولوں۔ کائینات کے اصولوں سے مقابلہ کر کے سچ کی تلاش ہر ایک کا ذاتی کام ہے جس کے لیے سوچ بچار، علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو مراقبہ کہتے ہیں یعنی گہری سوچ deep thinking اور اس کے نتیجے میں تحت الشعور کی نئی پرگرامنگ کی جاتی ہے۔

خیالات کیا ہیں۔ ان کو کو کیسے کنٹرول کیا جائے اور اپنے ذہن کے مالک کیسے بن سکتے ہیں۔

ہر آدمی کی شخصیت اس کے خیالوں، سوچ کی پیداوار، آئینہ دار اور جسمانی شکل ہوتی ہے اس لیے کہتے ہیں کہ اپنے خیالات پر نظر رکھیں کہ وہ الفاظ بن جاتے ہیں۔ الفاظ پر نظر رکھیں وہ افعال بن جاتے ہیں۔ افعال پر نظر رکھیں کہ وہ عادات بن جاتی ہیں۔ عادات پر نظر رکھیں کہ وہ کردار کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور کردار پر نظر رکھیں کہ وہ قسمت بن جاتی ہے۔ ہماری قسمت باہر سے کنٹرول نہیں ہوتی بلکہ ہم خود بناتے ہیں یعنی جو سوچتے اور کرتے ہیں۔ سوچ اور خیال کی قوت لامحدود ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ایک گھنٹے کی سوچ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر قرار دی ہے۔ کائنات انرجی ہے

اور خیال بھی انرجی کی لہر ہے۔ جس کو جب کائنات میں چھوڑا جاتا ہے تو کائنات اس کو جسمانی شکل دینے کے لیے دوڑ پڑتی ہے۔ خیال ہی کائنات کو ٹرگر کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ بنانے کے بعد سب کو اس کے حج کی دعوت دینے کے لیے کھڑے ہو کر صرف ایک اونچی آواز دی تھی جو کہ کائنات میں پھیل گئی تھی اور اب بھی گھوم رہی ہے۔

The Power of thought is incredible.The most potent form of energy is thought because thought-waves are cosmic waves penetrating all time and space.

ہمارے ذہن میں خیالات بغیر ہمارے سوچے بھی آتے رہتے ہیں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ ان میں سے بعض ہم قبول کر کے اس پر عمل شروع کر دیتے ہیں، کچھ کو توجہ ہی نہیں دیتے۔ ان کا انتخاب ہی سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ اچھے خیالات پر فوری عمل کر لو۔ خیالات کی ایک بری عادت ہے کہ جب آئے اور آپ اس کو توجہ نہ دیں تو پھر دوبارہ نہیں آتا۔ تنہائی اور کچھ نہ کرنے والے خالی ذہن بارے کہتے idle mind is devils workshop تنہائی میں عموماً برے اور شیطانی اور جنسی خیالات کی بھرمار ہوتی ہے۔ اچھے برے خیالات میں سے اپنی مرضی سے شعوری طور پر چننے اور ان کو کنٹرول کرنے کا ایک طریقہ میں نے پڑھا تھا وہ شیئر کر رہا ہوں۔ مراقبہ یا meditation technique کا ایک طریقہ، no thank you، نہیں شکریہ، کہنا ہے۔ جس سے آپ ذہن میں آنے والے ان خیالات کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ جو بار بار تنگ کر کے آپ کی توجہ کم کر دیتے ہیں مگر زندگی بہتر بنانے میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اس طریقہ میں دس حصے ہیں۔

۱۔ ایک ٹائمر لے کر اسے آٹھ منٹ پر سیٹ کریں۔ ۲۔ کسی کرسی، کشن پر کمر بالکل سیدھی کر کے آرام سے بیٹھ جائیں، ۳۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ۴۔ چند لمبے لمبے سانس لیں اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیں ۵۔ ٹا یک کلاک شروع کریں ۶۔ سانس آنے جانے پر توجہ دیں تو تھوڑی دیر بعد ہر قسم کے خیالات شعوری ذہن میں آنے شروع ہو

جائیں گے۔ ۷۔ چونکہ آپ نے تو سانس پر توجہ مرکوز رکھنی ہے تو ذہن میں ہی خیال کو کہیں، کہ نہیں شکریہ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ اور سانس کی طرف لوٹ جائیں۔ ۸۔ کچھ دیر بعد ایک اور خیال ظاہر ہوگا اور آپ کی توجہ چاہے گا۔ ۹۔ تو پھر اس کے ساتھ بھی پہلے خیال جیسا سلوک کریں کہ نہیں شکریہ، تو وہ ذہن سے غائب ہو جائے گا۔ ۱۰۔ ہر خیال کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں حتیٰ کہ ۸ منٹ بعد الارم بج جائے۔ ۱۱۔ روزانہ کوئی کام کرتے کوئی خیال آ کر کام سے توجہ ہٹائے تو اسے کہیں، نہیں شکریہ، تو غائب ہو جائے گا۔ شروع میں شاید مشکل لگے مگر چند دن کی پریکٹس کے بعد عادت پڑ جائے گی

practice is the key to mastery.

☆......☆......☆

ہر ایک شعوری اور غیر شعوری فعل عمل کرتے ہیں

ریفرنس۔''انسانی فطرت'' ہربرٹ کیسن

انسانی شخصیت کی پراسراریت، دراصل تحت الشعوری شخصیت ہونے کی وجہ سے ہے اور آپ خود اپنی شخصیت کو اس وقت تک نہیں پہچان سکتے۔ جب تک آپ تحت الشعور کی نفسیات کو نہ سمجھ لیں۔ اس موضوع پر روحانیت اور روحانی طاقت پر ریسرچ کرنے والوں نے کافی گڑ بڑ مچائی ہوئی تھی مگر اب تک جو باتیں واضح ہوئی ہیں۔ ان کو جاننا ضروری ہے۔ تا کہ انسانی فطرت کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ ضروری بات جو سمجھ لینی چاہیے، یہ ہے کہ ہم مکمل طور پر شعوری طور پر جاگ نہیں رہے ہوتے۔ اور نہ ہی اپنے آپ کے بارے میں پورا شعور رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں اپنی صلاحیتوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ مختلف مواقع ملنے پر ہی آپ کو اپنی قابلیت کا شعور ہوتا ہے۔ ورنہ آپ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے لاعلم ہی رہتے ہیں۔ اس کے لیے خود شناسی کے ذریعے کافی حد تک جانا جا سکتا ہے۔ اسی لیے خود شناسی سے خدا شناسی ممکن بنتی ہے۔

ایک آدمی کی شہرت دراصل اس کے ظاہر کے حصے سے ہوتی ہے جبکہ اس کا اصل کیریکٹر دراصل تحت الشعور میں پنہاں ہوتا ہے۔ جب ہم کسی مشہور آدمی کی فطرت میں ایک دم کمی پاتے ہیں تو وہ دراصل تحت الشعور کے حصے میں خرابی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے زمین کے اوپر پتلا سا حصہ شعوری ہوتا ہے اور اس کے نیچے ابلتا ہوا لاوا ہوتا ہے اسی طرح آدمی کی ذات کے تحت الشعوری حصے میں جذبات کا لاوا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار لاوا ابل کر زمین سے نکل آتا ہے اور تباہی مچا دیتا ہے تو آدمی کے جذبات کا لاوا بھی جب ابل پڑتا ہے تو نیک اور اچھا بھلا آدمی بڑا جرم یا بڑا گناہ کر بیٹھتا ہے۔ اور کیسے ایک عام سا آدمی ایک لمحہ میں بہادری کے جوہر دکھلا لیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک ہر کام میں

شعوری ذہن سے کام نہیں لیتا اور نہ ہی سوچ سمجھ سے کام لیتا ہے بلکہ اس کا ذہن بعض اندرونی خفیہ جذبات کے زیر اثر پاگل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب بہت سارے موضوعات جذبات اور رائے کو ترجیح دیتے ہیں بہ نسبت حقیقت کے۔ مذہب ایک ایسا موضوع ہے۔

ہر آدمی کے ذہن میں خواہشات، جذبات اور خیالات کی جنگ جاری رہتی ہے۔اور بہت کم اس کو کنٹرول کر کے پنی جذباتی اور ذہنی قوتوں کو متوازن بنا لیتے ہیں۔ ذہن میں دراصل ہر وقت ایک جذبہ دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں لگا ہوتا ہے۔ اور ایک "Complex" دوسرے سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ اسی میں ماضی کی طرف رجحان ہوتا ہے۔اور مستقبل کی خوش آیندہ امیدیں بھی کھینچتی ہیں۔اس میں آپ جیسا آدمی بننا چاہتے ہیں اس کی خواہش ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہی حالات کی مجبوری ہوتی ہے۔اسی میں نیک اور بد دونوں میں لڑائی جاری رہتی ہے۔

ان سب خواہشات، جذبات احساسات کے ساتھ ہی عقل بھی اپنا اثر دکھا کر بنیادی جذبوں کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس طرح جسم کے اندر کے غدود harmones بھی مختلف کیمیائی تبدیلیاں لاتے ہیں۔اوران کے زیر اثر مختلف احساسات یا جذبات جسم کو اندر ہی اندر متاثر کرتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہوتا کہ یہ سب بھی ذہن پر کیسے اثر انداز ہو رہے ہوتے ء ہیں۔ان سب کے زیر اثر ذہن میں دراصل ہر وقت جنگ جاری رہتی ہے۔اور کبھی پتہ نہیں ہوتا کہ ذہن کا کون سا حصہ کنٹرول حاصل کر لے گا۔تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب اور حل یہی ہے کہ تحت الشعور کو ہر وقت مثبت اور سچ پر مبنی سوچ سے پروگرام کر کے قابل اعتماد بنایا جائے۔تا کہ اندر سے کنٹرول کرنے والا حصہ ہی اصل اتھارٹی بن جائے۔ کنٹرول کرنے سے ہی سب کچھ حاصل ہوتا ہے، بجائے انتشار اور افراتفری کے۔اپنے ذہن کو کنٹرول میں رکھیں۔اپنے موڈ کو ختم کر دیں اوراس کی جگہ جو آپ خود شعوری طور کرنا چاہیں،صرف وہی ہو۔اس کے لیے پنے غصے کو قابو میں لائیں۔اپنے ہر شخص، مذہب، سیاست بلکہ ہر چیز بارے اپنے خیالات،نظریات، اعتقادات کو چیلنج کریں۔اور حقیقت کو سمجھیں۔اور دائمی

سچائیوں پر جائیں تو تحت الشعور کبھی لاوے کو ابلنے نہیں دے گا۔۔Descarts،
فرانسیسی ماہر نے 1637ء میں عقائد کو ٹسٹ کرنے کے لیے چار اصول بنائے تھے۔ وہی
اصول ہم اپنی زندگی میں ہر کام کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے سائنسی طریقہ
نے جنم لیا۔ وہ یہ ہیں۔ (1) کسی چیز کو بھی صحیح نہ مانا جائے جب تک مجھے اس کے سچ
ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔ اور اس سلسلے میں میں اپنی رائے کو بالکل وقعت نہ دوں۔
(2) ہر مشکل کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا جائے جتنا ممکن ہو سکے۔ (3) خیالات کے
سلسلے کو ترتیب سے شروع کیا جائے کہ آسان سے مشکل کی طرف بتدریج بڑھا جائے۔
(4) ہر تحقیق میں حساب کتاب اتنا بڑا ہو کہ کچھ رہ نہ جائے۔

تو اس دنیا میں اگر ہم نے ترقی کرنی ہے تو تمام پرانے علوم، کتابوں اور عقائد، رسومات، عادات، نظریات کو چیلنج کرنا پڑے گا۔ اور ان کی جگہ سچ اور حقیقت کی تلاش کرنی پڑے گی۔ ہمیں اپنی رائے کو اس کی اصل جگہ دینی چاہیے اور صرف سچ پر اعتبار کرنا چاہیے۔

> ''پاگل پنا دراصل بعض پریشان کن یا حل نہ ہونے والے مسائل یا خیالات کے اکھٹے ہونے سے ہوتا ہے۔ جو کہ جذبات کے تحت ایک دوسرے سے یکجا کر دیئے جاتے ہیں۔ اور یہی خیالات پختہ ہو کر دوسرے خیالات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اسی سے "Complex" بنتا ہے۔ انہی خیالات سے انسان دوسروں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اور پھر دماغی بیماری بن جاتا ہے۔ ہر مذہب اور ان کے مسالک میں یہی بیماری ہوتی ہے کہ ہم صرف ہم صحیح ہیں اور باقی غلط۔ اور غلط کو ہمارے کنٹرول میں رہنا چاہیئے۔

منافقانہ رویوں کے نقصانات

ہنسی مذاق کی اہمیت کو سمجھیں کوئی بھی ہنسنے والا پاگل نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ ہنسنے کھیلنے والا ہی پاگل پنے سے نکل آتا ہے۔ زندگی کو کھیل سمجھ کر گزارنے والے ہی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس کو بوجھ سمجھنے والا تو روتا ہی رہے گا۔ حالانکہ جتنی زندگی

ہے وہ تو بہر حال گزر کر رہے گی۔ اپنے ذہنوں کو اپنے رازوں کے چھپانے اور اپنے آپ کو منافقانہ رویئے سے بچایئے۔ نہ ہی ذہن کو ہر وقت چوری پر مجبور کی جیئے۔ ہم اپنے ذہنوں کو سازشوں سے پاک رکھ سکتے ہیں۔ ہم اپنے ذہن کی تاریکیوں کو روشنی سے اجالا کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے ذہنوں کے بوجھ کو بات چیت کر کے ہلکا کر سکتے ہیں۔ اکثر جب ہم ڈاکٹر کو جا کر اپنی تکلیف بتاتے ہیں اور وہ ہمیں دوائی دیتا ہے اور ہم ٹھیک ہو جاتے ہیں تو دراصل دوائی کی بجائے ہمارا صرف بتانا ہی تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ اس سے آپ سچ بولنے، سچ سننے اور سچ کو تسلیم کرنے کی اہمیت سمجھ لیں۔ سچ بولنے والے کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ انہیں ایک سچائی کا پتہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے اور حالات پھر ٹھیک ہوتے رہتے ہیں اس لیے وہ زندگی کی پریشانی کو دل کی پریشانی نہیں بناتے۔ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کوئی آدمی بھی سو فیصد نارمل نہیں ہوتا نہ ہی متوازن ہوتا ہے۔ آپ اپنے ذہن کو مکمل طور پر متوازن نہیں بنا سکتے۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ اچھے خیالات ڈال سکتے ہیں (اسی لیے ہر وقت مثبت اور اچھے خیالات سوچتے رہنے سے تحت لشعو اچھا سوچے گا۔ حدیث کے مطابق اچھے خیالات پر بھی ایک نیکی مل جاتی ہے۔ یعنی خیالات اچھے رکھنے کے لیے اس سے بہتر motivation نہیں ہو سکتی)۔ آپ ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے آپ کافی حد تک اپنی روح کے کپتان بن سکتے ہیں۔ مثلاً جنگ میں توپ کے گولے کے پھٹنے سے سینکڑوں سپاہی یا تو اندھے یا بہرے ہو جاتے ہیں، یادیں گم ہو گئیں۔ ان کے جسم اور ذہن بالکل ٹھیک حالت میں ہوتے ہیں، صرف ڈر سے بچنے کے لیے ذہن یہ کرتا ہے۔ ڈر نکلنے سے کہ اب کوئی اور گولہ نہیں پھٹے گا تو ان میں سے اکثر بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب زندگی کے دوسرے معاملات سے برا اثر پڑتا ہے تو ذہن میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ اور یہی شیل شاک والا اثر پیدا ہو کر ذہنی یا نفسیاتی بیماری ہوتی ہے۔ اور انسانی ذہن میں جیسے موچ آ جاتی ہے۔ جوں ہی یہ موچ ختم ہوتی ہے۔ وہ دوبارہ کام شروع کر دیتا ہے۔ نفسیاتی ماہر ڈاکٹر سچ بتا کر ہل چل ختم کر دیتا ہے۔ زیادہ مذہبی لوگ بھی ہر وقت گناہ کے ڈر سے غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔

جیسے کہ جوتے میں ایک چھوٹا سا کنکر پاؤں کو لگا تار تکلیف دیتا ہے۔ اسی طرح ذہن میں ایک فکر والا خیال ذہن کو تکلیف دیتا رہتا ہے تو انسان کے ذہن میں کسی فکر، سوچ، غصے سے موچ آ جاتی ہے اور وہ بھی غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ جب آپ اس خیال کو حقیقت اور سچ کا سامنا کرائیں گے تو تکلیف دور ہو جائے گی۔ تو یہ نتیجہ نکلا کہ کسی خیال کو تنگ نہ کرنے دیں بلکہ اسے سچ بتائیں کہ کچھ نہیں کر سکتے تو مدد کے لیے دعا مانگیں۔

ذہن کا ایک اصول ہے کہ ''ذہن کو حقیقت اور سچ پر عبور ہو جانا چاہیے'' جوں جوں خیالات ذہن میں آتے جاتے ہیں، ذہن کو ان کو سمجھ کر اپنی اپنی جگہ رکھتے جانا چاہیے یا رد کر دینا چاہیے۔ جب کوئی خیال انسانی ذہن پر حاوی ہو جائے۔ تو پھر اس خیال سے ڈر لگنے سے شیل شاک کی ذہنی بیماری ہو جائے گی۔ جب آپ کسی دوست یا ڈاکٹر سے بات کر کے اس کی صلاح مشورہ سے اس خیال کی حقیقت سمجھ لیں گے یا یہ کہ صرف آپ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ہو رہا ہے تو وہ ذہن سے اتر جائے گا۔ سچ پا کر فکر سے آزاد ہو جائے گا۔ اسی لیے جو آدمی بھی اپنی فکروں، گناہوں، محرومیوں پر علیحدہ اور اکیلے بیٹھ کر سوچے گا۔ یا خیالی گناہوں کے بارے میں سوچے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی فکریں فوراً شیئر کریں تو ذہن بیمار نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو رحمان تصور کریں تو توبہ سے گناہ ذہن سے نکل جائے گا۔

امیر آدمیوں کی عورتیں عام طور پر کام نہ ہونے سے بور ہو جاتی ہیں۔ ان کے ذہن کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے سے قاصر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کے بارے میں سوچنے لگتی ہیں۔ ایسی عورتیں پہلے خودغرض ہو جاتی ہیں۔ پھر اپنے آپ میں گم ہو جاتی ہیں۔ اور آخر کار غیر متوازن۔

اسی طرح جو لوگ زندگی میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ جیسے غریب آدمی کے ذہن میں شکست کا احساس ہوتا ہے۔ یہ خیال بہت ہی سخت، اور ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی شکست کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ اور توپ کے گولے کے ڈر والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ زیادہ تر ماضی کے تلخ تجربات کا اثر ہوتا ہے۔ ایسا تجربہ انکے ذہن پر سوار ہو جاتا ہے۔ اور ذہن بھولتا نہیں۔ جب ذہن اس پر کنٹرول نہیں کر پاتا

تو اس سے ڈرنے لگتا ہے۔ تو کنٹرول نہ کر سکنا اس کی پریشانی بن جاتی ہے۔ نہ کہ اصل خیال۔ مراقبے یا meditation سے خیال کو دل سے نکال دیا جاتا ہے کچھ وقت کے لیے تو انسان پرسکون ہو جاتا ہے۔ مراقبے کا مطلب سوچ بچار اور دلائل سے تحت الشعور کو سمجھانا اور قائل کرنا ہوتا ہے۔

زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہو۔ جب تک بہتی رہتی ہے تب تک وہ صاف شفاف رہتی ہے۔ جوں ہی راستے میں کوئی رکاوٹ آ جائے تو پانی کی طرح رک جاتی ہے اور رکا ہوا پانی ہمیشہ گدلا اور بدبودار ہو جاتا ہے۔ جب کوئی خواہش تکمیل کو نہیں پہنچتیں تو زندگی کی روانی رک جاتی ہے اور گدلا پن آ جاتا ہے۔ اور ذہن میں بدبو آنے لگتی ہے۔ اور وہ کسی شکست خوردہ دشمن کی طرح تتر بتر ہونے لگتا ہے۔ اس لیے زندگی کو رکنے نہ دیں۔ ہر روز ایک نئی زندگی، نئے جوش اور ولولے سے شروع کریں اور اللہ پر بھروسہ کریں کہ یہ دن پہلے سے بہتر ہوگا، " اسی لیے جاگنے کے بعد دعا مانگنے کی نبوی نصیحت ہے جو کہ دراصل دن کی پروگرامنگ ہوتی ہے۔ کہ میں اس دن کو آخری دن سمجھ کر جوش و خروش سے گزاروں گا۔ یعنی مسلمان کو صرف آج کے دن میں بہترین کام کرنے کی نیت کرنی چاہیے۔

عام طور پر ایسی ذہنی حالت میں زیادہ تر لوگوں میں مجرمانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ رکاوٹ کو دور کرنے کی بجائے رکاوٹ کے گرد سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے جھوٹ، فراڈ، سازش یا کسی بھی منفی سوچ کا سہارا لیتے ہیں۔ اسی کو going around the rules یا حیلہ بہانہ کہتے ہیں جو کہ صحیح رویہ نہیں ہوتا اس کی جگہ منافقانہ مائینڈ سیٹ بن جائے گا۔ ایسے لوگوں کے ذہن حقیقت کی دنیا سے نکل کر اپنی ہی خیالی پیدا کردہ دنیا میں آ جاتے ہیں اور اسی میں مصروف رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی درست ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ایک جرم کی بجائے اس کا نعم البدل پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا میں جرائم شکست اور پاگل پنے کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ ان کا علاج صرف اور صرف سچ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اور لوگ ہمیشہ سب سے بڑی سچائی کی طرف لوٹتے ہیں

اوراللہ تعالیٰ ہی سچائی ہے ۔اس کی طرف رجوع ہی یہ ہمت دیتا ہے کی سچ قبول کیا جائے۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کو عام لوگ ابھی تک نہیں سمجھ سکتے۔ عالم لوگ بھی تحت الشعور کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب نہیں کر سکے۔لیکن کم از کم اس حقیقت تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ کہ کوئی ایسی حقیقت ہے جس کا نام سچ کی روح ہے۔'' یہی سچ ہمیں شکست کے باوجود دوبارہ محنت پر ابھارتا ہے۔ اور ماضی کو بھلا دیتا ہے۔ اوراس کی حقیقت سمجھ کر دوبارہ کوشش کرنے کی سمجھ دیتا ہے۔ یہی سچ ہمیں ناگہانی خوفوں سے نجات دلاتا ہے۔ یہی سچ ہمیں حسد، انتقام، سستی، کاہلی اور خودغرضی سے نکال لاتا ہے۔ یہی سچ ہمیں ہر وہ خیال جو ہمارے ذہن میں داخل ہوتا ہے پر کنٹرول دیتا ہے۔ یہی سچ اور سوچ ہمیں اصل خوشیاں، کریکٹر اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ اسی لیے مومن کے لیے سچ اپنانا بہت اہم اور ضروری ہوتا ہے۔ یہی نبی کریم ﷺ کی بنیادی صفت تھی جس پر انھوں نے نبوت کی دلیل اور سچائی کا ثبوت دیا تھا جس کے پاس لوگوں کے کوئی جواب نہ تھا۔ دل کی باتیں دلیلوں سے حل نہیں کی جاسکتیں جیسے کہ عورت کو سو دلیلیں دیں اس کو رد کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ دل نہیں مانتا۔ اللہ کو بھی سمجھنے کے لیے مراقبے سے دل سے پہچاننا پڑتا ہے اسی لیے اللہ کہتا ہے کہ وہ صرف مومن کے دل میں سما سکتا ہے۔

'' دنیا اور انسانوں کی غلط اور نقصان دہ عقائد، آراء، وہم، خوف پر یقین کرنا بند کر دیں اور ان کی جگہ ان دائمی سچائیوں پر یقین کریں جو کبھی نہیں بدلتیں تو آپ آگے اور اوپر کی طرف، خدا کی طرف چلنا شروع ہو جائیں گے، جب آپ اپنے خیالات پر کنٹرول حاصل کر لیں تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو تحت الشعور حل نہیں کر سکتا۔ اس طرح دراصل آپ خدا تعالیٰ کے فطرت کے اصولوں پر شعوری طور پر کوآپریٹ کر رہے ہوتے ہیں جو کہ ہر جگہ موجود ہے اور سب سے طاقتور ہے۔''

مثلاً چند سچائیاں یہ ہیں:۔ سچ نمبر ایک جس پر ایمان ہونا چاہیے یہ ہے کہ اللہ موجود ہے اور ہر چیز کا اللہ مالک ہے اور اسکے کنٹرول میں ہے وہ دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور نہ دینا چاہے تو کوئی دے نہیں دے سکتا نہ آپ کو ملے گی۔ سچ نمبر دو:۔ رزق، صحت ،عزت، پیسہ، سکون، محبت، سلامتی، ہدایت، جنت، اولاد، ہر چیز اس کے

پاس ہے۔وہی دے سکتا ہے۔ سچ نمبر تین ؛۔اس لیے آپ کا کام محنت کرنا ہے اس کا نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے سچ نمبر چار؛۔دعاء مانگنا آپ کا کام ہے۔قبولیت کا ٹائم اس کے پاس ہے۔ اس طرح تمام سچائیوں کی لسٹ بنالیں۔

بات ذہن کے ہر وقت سکون کی حالت میں رکھنے اور رہنے کی ہے،اگر وہ فری ہے اور سکون کی حالت میں ہے جیسے کہ پروردگار خود کہتا ہے کہ دل کا چین اللہ کی یاد میں ہے تو آپ ہر وقت اللہ کے ساتھ منسلک ہیں اس کی کمپنی میں ہیں تو جونہی کچھ چاہیں گے اللہ کی ذات آپ کو عنایت کر دے گی۔اسی کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ میں بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرتا ہوں۔اگر وہ اچھا گمان کرتا ہے تو میں اس کو اچھائی دیتا ہوں اگر وہ اچھا گمان نہیں رکھتا تو اس کو اچھائی نہیں ملتی۔

ہم نے سچائی کی بات کی ہے تو مکمل سچائی میں ایک بہت مشکل بھی آ جاتی ہے کہ بعض حالتوں میں ذہن اصل سچائی کی جگہ جھوٹ کو بھی سچا لیتا ہے۔اس کی وجہ تحت الشعور کا ڈیزائیں ہے۔سچ یا جھوٹ کا فیصلہ شعوری ذہن کرتا ہے جو سوچ سکتا ہے۔وہ جو بھی سچ سمجھے اس کو تحت الشور کے حوالے کرتا ہے تو شعور اس کو اسی طرح سچ سمجھ لیتا ہے۔ جیسے ہم پاکستانی منافقت سے سمجھتے ہیں کہ ہم لائق ترین افراد ہیں۔تو ہمارا تحت الشعور اس کو ہی سچ سمجھ لیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ورنہ ہم ستر سال سے صحیح فیصلے کرتے ہوئے ترقی یافتہ ملک ہوتے۔اس کی وجہ نیچے بیان ہوئی ہے۔

Illusion-of-truth effect

سچائی کا فریب نظر یا وہم۔اس کے مطابق بار بار سننے والی ایکغلط بات کو بھی سچ سمجھ کر اعتبار کر لیتا ہے بجائے کبھی کبھار سنی سچی بات کے۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی اور مذہبی رہنماء اور اشرہار بڑے اعتماد سے جھوٹ بولتے رہتے ہیں جو پھر سچ سمجھ لیے جاتے ہیں۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اسلام کے سارے نظریات غلط کر دئے ہیں، مثبت اور جارحانہ کی جگہ منفی اور مدافعانہ کر دئے ہیں۔

☆......☆......☆

عادات کے قدرتی اصول

ذاتی سوچ، نظریات، عادات کو اختیار کرنے کے حق کا ہر ایک کا ہے۔ جن کو اپنانے سے وہ اپنی پسند اور خواہش کے مطابق زندگی میں مقام و مرتبہ حاصل کر سکے۔

خودکاری کیا ہے۔ Automaticity کسی بات کو شعوری ذہن کی مدد کے بغیر کرنے کو خودکاری کہتے ہیں۔ یہ سیکھنے، بار بار پریکٹس کر رتے رہنے سے آتی ہے۔ جیسے کار چلاتے ہم موبائل بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ یا ورکشاپ میں کام کرتے باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس کو procedural memory بھی کہتے ہیں۔

وہ طریقہ جس سے ہم نئی عادت، نئے رویہ، نئے اخلاق کو اختیار کرتے خودکار بنا سکتے ہیں، اس کو عادت بنانا کہتے ہیں۔ پرانی عادت توڑنی مشکل ہوتی ہے کیونکہ جب ہم کوئی چیز بار بار کرتے ہیں تو پھر ہمارے ذہن کے سیل میں ریکارڈ ہو جاتا ہے مگر ان کی جگہ نئی عادت بنانے کے لیے پہلی ریکارڈنگ کو ختم کر کے نئی ریئکارڈنگ کرنی ہوتی ہے جو کہ نئی عادت کا حکم بار بار تحت الشعور کو دینے سے ممکن بن جاتا ہے۔ اس کا اصول یہ ہے

As behaviors are repeated in a consistent context, there is an incremental increase in the link between the context and the action. This increases the automaticity of the behavior in that context

فطرت ہر قوت، عنصر اور چیز میں توازن قائم رکھتی ہے۔ فطرت ہر نظام کو ایک ایسے ترتیب سے چلاتی ہے جو کہ بدلتے نہیں۔ اور نہ ہی آدمی کی کوشش سے اِن کے کام کرنے کے طریقے بدل سکتے ہیں۔ چاند ستارے، سورج اور دوسرے سیارے، موسموں کا تغیر ایک خاص اصول کے سسٹم اور نظام میں بندھے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ عادت کے خلاف نہیں حرکت کر سکتے۔ اور اپنی عادات کو اپنانے سے یہ ایک دوسرے سے فاصلہ و ربط، اور تعلق کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ورنہ اِن میں سے اگر ایک عادت بھی اپنی عادت سے گریز کرے تو یہ نظام آناً فاناً چوپٹ ہو جائے۔ اِس طرح عادت ہی وہ قوت

ہے جس کے ذریعے انسان بھی دوسرے انسانوں سے رابطہ قائم رکھ سکتا ہے۔ اور اِن عادات میں اِن خصلتوں میں پختگی اور ہمیشگی پائی جاتی ہے اور یہی وہ نظام عادت ہے جس کے ذریعے آدمی کی سوچ کو جسمانی شکل اختیار دی جاسکتی ہے۔ یہ حقیقتیں ایسی ہیں جو کہ ثابت کی جاسکتی ہیں اور وہ لمحہ یقیناً بہت ہی قیمتی ہوگا جس میں کسی انسان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ درحقیقت آدمی کو اللہ تعالیٰ کے سسٹم یا نظام میں ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے وہ ذات کام لیتی ہے۔ اور اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے انسان کے اعمال کے ذریعے۔ ایک انسان کی رہنمائی کے لیے ہے جس کے سمجھنے سے وہ اِس قابل ہو جائے کہ وہ کائنات کی اَن دیکھی مگر موجود قوتوں سے نہ صرف روابط قائم کر سکے بلکہ اِن کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ کام کر سکے۔ تاکہ وہ زندگی کے پہلو کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اِن کی مدد کر سکے۔ اِس انکشاف یا ادراک سے ہی وہ مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو کہ انسان کو ہر کام میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

کائنات کی اِس عمارت سے ہی اِس دنیا میں ترتیب اور خوبصورتی ہے۔ ہر ایک چیز اپنے سے پہلے پیدا شدہ بیج سے ہی اپنی ہی قسم میں پیدا ہوتی ہے۔ اِس طرح انسان کے اپنے خیالات کے مطابق ہی اِن کا پھل نکلتا ہے۔ جیسے کہ دوسرے بیجوں سے اِن کا درخت یا پھل نکلتا ہے۔ عادت کے ذریعے ہی ہر جاندار چیز اپنے ماحول میں رچ بس سکتی ہے۔ اور اپنے ماحول کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ اِس لیے کامیابی کو جنم دیتی ہے اور ناکامی ناکامی کو کھینچتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ایک ناکام شخص انتہائی کامیاب شخص بن سکتا ہے بشرط یہ کہ وہ کامیاب لوگوں کی صحبت میں بیٹھے اور اُن سے میل جول رکھے۔ اور اُن لوگوں سے ملے جو کامیاب ہونے کی ہمیشہ خواہش کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ یہ اِس لیے ہے کہ عادت کی قوت کامیاب آدمی سے ناکام آدمی تک منتقل ہو جاتی ہے۔ جب بھی دو ذہن ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو اُن سے ایک تیسرا ذہن تیار ہوتا ہے جو کہ اُن میں سے طاقتور سے متاثر ہوتا ہے۔ تمام کامیاب لوگ اِس بات کو مانیں گے کہ وہ کسی مثبت اندازِ فکر والے آدمی سے مل کر ہی متاثر ہوئے۔ اور انھوں نے یہ اثر قبول کر کے اپنے آپ کو بدل لیا

عادت وہ قوت ہے جو مستحکم قائم شدہ عادات کے ذریعے کام کرتی ہے اور اشرف المخلوقات کے علاوہ ہر مخلوق اسی عادت کی قوت کے تحت جس کو ہم ''فطرت'' کا نام دیتے ہیں، زندہ رہتی ہے اور اپنی اپنی نسلوں کو قائم رکھتی ہے۔ اور زمین پر دیئے گئے فرض کو اسی قوت کے تحت سرانجام دیتی ہے۔ صرف آدمی، اشرف المخلوقات، ہی کو عادات کے اختیار کرنے، اپنی مرضی کے مطابق عادات اپنانے یا نہ اپنانے اور ان کو تبدیل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور یہ عادات وہ اپنے ذہن میں قوت سے مستحکم بناتا ہے۔ اور یہی وہ اختیار ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ نے دے کر اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔

آدمی خود ہی اپنے آپ پر منفی سوچوں پر مبنی اپنی عادات کے ذریعے ہی خوف، شک وشبہ، حسد، لالچ، غربت وغیرہ کی پابندیاں یا حدود مقرر کر لیتا ہے۔۔ اور پھر یہی عادت کی قوت اِن تمام خوفوں کو جسمانی شکل دے دیتی ہے۔ یا پھر اگر وہ امیری، دولت یا کثرت یا علم کو ذہن کی عادت بنا لیں تو پھر فطرت یا پروردگا وہی اِس کو عطا کر دیتا ہے۔ اِس طریقہ سے ہر شخص کافی حد تک زمین پر اپنی قسمت کو بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ یعنی اپنے خیالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے اختیار کو استعمال کر کے۔ جب یہ خیالات ایک ڈھنگ کے ہو جاتے ہیں۔ ایک رخ، سمت متعین کر لیتے ہیں تو پھر عادت کی قوت اِن پر حاوی ہو جاتی ہے اور اِن کو اپنی عادات بنا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اُن سے زیادہ طاقتور خیالات اُن کو بدل کر دوسری عادات نہ بنا دیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو بڑے لوگ کسی حقیقی بلندی تک کارہائے نمایاں انجام دے کر پہنچتے ہیں۔ کبھی کبھار ہی بغیر کسی بڑی ٹریجیڈی اور بغیر کسی بڑی تکلیف، ناکامی یا مایوسی کے ایسا کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایسی تکلیف مصیبت امتحان سے گزرتے ہیں جو کہ اُن کی گہرائیوں تک جاتی ہے اور اِس حالت تک لے جاتی ہے۔ جس کو آدمی شکست یا ناکامی کا نام دے سکتا ہے۔ وہ اِس حالت سے ابھر کر پھر وہ ترقی کرتے ہیں جس دوسرے دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تکالیف، ناکامیاں اِس عادت کی قوت کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ جو اِس کو اِس ناکامی یا تکلیف تک لے گئی

تھیں۔اِس طرح قدرت اِن عادات کوتوڑ کر اِس کونئی عادات کواختیار کرنے کا موقع عطا کرتی ہیں۔مشکل کیوں آتی ہے؟۔دراصل انسان کوتبدیل کرنے کے لیے آتی ہے۔جیسے کپڑے کو پانی لگا کر استری کرنے سے سلوٹیں جلدی نکلتی ہیں،مشکل انسان کو نرم دل کر دیتی ہے اور اللہ کی طرف لے آتی ہے۔**اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہوا ہے کہ قوموں پر جب تنگی آتی ہے تو اس لیے کہ شائد وہ نصیحت پکڑیں۔**

7-94. And We sent no Prophet unto any town (and they denied him), but
We seized its people with suffering from extreme poverty (or loss in wealth) and loss of health and calamities, so that they might humiliate themselves (and repent to Allah).

عموماً جنگیں آدمیوں اور قوموں کے درمیان تعلقات کے بگاڑ سے ہوتی ہیں۔یہ بگاڑ عموماً لوگوں کے منفی خیالات کی وجہ سے ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ بڑھ کر اجتماعی بن جاتے ہیں۔اِس لیے کسی بھی قوم کے جذبات کی روح دراصل اُس کے باشندوں کی حاوی سوچ کی عادات کا مجموعہ ہوتی ہے۔یہی حالت عام آدمیوں کی ہوتی ہے۔کیونکہ اُن کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔اور ہر فرد کی روح اُس کی سوچ پر حاوی عادات کے مطابق ہوتی ہیں۔یعنی جو حاوی سوچ ہوگی منفی یا مثبت۔کامیابی یا ناکامی کی سوچ کی عادت کے نتائج اُسی کے مطابق ہی ہوں گے۔عام لوگ کسی نہ کسی طرح اپنے اندر کی جنگ میں مشغول رہتے ہیں۔وہ عموماً اپنی متصادم سوچوں اور جذبات کے ساتھ جنگ میں مشغول رہتے ہیں۔وہ اپنے خاندان کے ساتھ تعلقات میں بھی جنگ ہی جاری رکھتے ہیں اور اپنے پیشے اور سماجی تعلقات میں بھی کھچے کھچے سے رہتے ہیں۔یا وہاں بھی لڑائی جھگڑے میں مبتلا رہتے ہیں۔

یہ عظیم اصول آپ کو اپنی اندرونی روحانی جنگ سے محفوظ کر دے گا جو کہ آپ کے اندر ہر وقت جاری رہتی ہے۔اور آپ کی سوچ اور جذبات یا ضمیر اور خواہشات کی آمیزش اور لڑائی کے خوفناک اثرات سے بچا کر اُن میں مطابقت کر دے گی۔کائناتی

عادت کی قوت کسی فرد کو یہ تجویز نہیں کرتی کہ فلاں عادت کو اپناؤ فلاں کو نہ اپناؤ یا فلاں عادت مثبت ہوگی یا منفی۔ بلکہ ہر فرد کی سوچوں کے مطابق کام کرتی ہے۔اور اِن کو مستحکم عادت کی شکل دے دیتی ہے۔

دعاءعبادت کا مغز کیوں ہے؟

دعائیں دراصل مثبت، فائیدہ مند چیزوں کی خواہش ہوتی ہے یا پھر منفی یا نقصان دہ چیزوں سے پناہ مانگنے پر مشتمل ہوتی ہیں۔قرآنی یا نبوی دعاؤں میں ان اچھی پسندیدہ چیزوں اور ناپسند عادت یا اعمال یا چیزوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔دعاء یا خواہش کو حاصل کرنے کے لیے ارادی،کوشش کا پروگرام بھی شامل ہونا چاہئے۔صرف یہی طریقہ ہے جس سے ہم ترقی کر کے دنیا اور اس کے ذریعے آخرت ٹھیک کر سکتے ہیں۔یہی دراصل اصلی اور بڑی کامیابی ہوگی۔جب ہم کسی بڑے کے پاس جاتے ہیں تو عموماً کچھ مانگنے کے لیے ہی جاتے ہیں، بڑا آدمی بھی جب سلام دعا ہو چکے تو عموماً یہی پوچھتا ہے کہ خیر خیریت ہے؟ یعنی کس کام کے لیے آئے ہو۔ یہ پوچھنے کا طریقہ ہوتا ہے۔اس لیے جب ہر عبادت کے وقت ہم اللہ کے حضور اس موقع سے فائیدہ اٹھا ن کر مانگ لیں۔ مانگنے پر کوئی حد مقرر نہیں بلکہ اگر نہ مانگیں تو اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوتی ہیں۔تو ناراض کرنے کی بجائے بہت مانگو

”لمبا سانس لینا زندگی میں سکون اور خوشی دلا سکتا ہے“ (چینی مراقبہ یعنی زین فلاسفی)

خوش رہنے کا اصول: لائٹ لونگ کا اصول۔آپ کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اچھا یا برا اس کی فکر نہ کریں اس پر آپ کا کوئی کنٹرول نہیں۔نہ ہی کسی سے کوئی امید لگائیں اور نہ ہی کسی کو جج کریں۔ یہ تقدیر کا معاملہ ہے۔اور زندگی کو اہمیت دیں واقعات اور چیزوں کو نہیں ؛ جب بھی توجہ ادھر ادھر بھٹک رہی ہوا سے واپس لانے اور سکون دلانے ہوں تو لمبے سانس لیں۔ اگر آپ کو ٹینشن ہے،شکست خوردہ محسوس کرتے ہیں۔ ماضی کی پریشانی ہے تو لمبے لمبے سانس لیں یہ آپ کو سکون دے گا اور ٹینشن ختم کر دے گا اور حال

میں واپس لے آئے گا۔ اگر آپ کی ہمت ٹوٹ گئی ہے اور زندگی، کام، مقصد بھول گئے ہیں تو لمبا سانس لیں تو یہ آپ کو یاد کرادیگا کہ زندگی کتنی قیمتی ہے۔ اور ہر سانس اللہ کا تحفہ ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے۔ زندگی کا لطف اٹھائیں۔ اگر بہت سے کام کرنے ہیں، اگر آپ بہت تیزی میں ہیں تو سانس لیں یہ آپ کو آہستہ کر کے زندگی انجوائے کرنے کی طرف لے آئے گا۔ اس لیے ہر سانس کے ساتھ زندگی کو انجوائے کریں۔ یہ وقت یا سانس پھر واپس نہیں آئے گا۔ .Be at peace with being still۔

آج کل کی دنیا میں جسم کی مصروفیت نہ بھی ہو تب بھی ذہن ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ دفتر، گھر، باتیں، ٹی وی، فلمیں، حرکت اور مصروفیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ کمپیوٹر نے تو تمام دوسری مصروفیات چھین لی ہیں۔ یہ چھوڑیں تو ٹی وی سے ذہن ہر وقت مصروف رہتا ہے، ریسٹ ملتا ہی نہیں اور یہ سب کچھ فضول کر کے لیے بھاری قیمت ادا کر کے سکون غائب ہو گیا ہے اور بھاگ دوڑ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ سب بے مقصد تھی کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ آج کل مائنڈ سیٹ ہر وقت کی مصروفیت کا ہے۔ آپ کی بھاگ دوڑ سے یا تو کچھ نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو اہم نہیں ہوتا۔ ایک ہفتے کو چیک کریں تو اس بات کی سچائی کا پتہ لگ جائے گا کہ مشین کی طرح ایسی زندگی گزر رہی ہے؟ اس سے چھٹکارے کے لیے ہر دن بغیر کچھ کیئے سکون میں چند ساعتیں گزاریں۔ ہر ہفتے وقت بڑھا دیں۔ سکون اور بغیر حرکت کیئے۔ کام کے دوران لمبے سانس لیں، تھوڑا سکون لیں۔ رفتار کم کریں۔ خوشی ڈھونڈیں۔ سکون ہی خزانہ ہے یہ سب کو مل سکتا ہے۔

آج کل ہر خیال میں ماضی کی یاد، مستقبل کی فکریں، مختلف دھیان بانٹنے والی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر جب ہم کوئی کام کرنے لگ جائیں تو تمام تمام پریشانیاں، حسد، غصہ غائب ہو جاتا ہے تو اس سے ایک حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ جو کر رہے ہو اس پر توجہ مرکوز رکھو۔ جب چل رہے ہو تو صرف چلو۔ جب کھا رہے ہو تو صرف کھاؤ اور کچھ نہیں کرو۔ برتن دھو رہے ہوں، یا فروٹ کھا رہے ہیں، ٹپ کر رہے ہیں تو اس پر توجہ دیں۔ زاویہ کے اشفاق احمد یہی کہتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے کام کرو یہ چھوٹے نہیں ہوتے۔

انہیں سے نور آئے گا بڑے کاموں سے نہیں اسی لیے نبی کریم ﷺ ہر چھوٹا کام کر لیتے تھے۔سکون کے لیے چند لمحے رک کر لمبے سانس لیں تو تمام خیال غائب ہو جائیں گے۔

اگر ہم خوش رہنا چاہتے ہیں تو شکایتی ٹٹو نہ بنیں اور ہر وقت دوسروں پر تنقید، شکایت کرتے رہیں۔جیسے کہ ٹریفک جیم، موسم کی شکایت، سیڈوچ میں نمک کم ہے وغیرہ آپ سو چیزیں ڈھونڈ لیں گے۔اپنے سے بھی شکایت کہ ہمارے پاس پیسے یا وقت کم ہے میں سمارٹ نہیں وغیرہ۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو آپ بدل نہیں سکتے کیونکہ آپ کا اس پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا تو پھر شکایت کیسی۔آپ فیصلہ کریں کہ آپ نے خوش رہنا ہے یا شکایت کو ترجیح دینی۔خوش رہنے کے لیے دو چیزیں کریں۔کہ جب بھی تنقید یا شکایت کرنے لگیں تو رک جائیں اور سوچیں کہ اس کو کنٹرول کرنے کے لیے آپ کچھ کر سکتے ہیں تو فوراً کریں۔اگر نہیں کر سکتے تو شکایت کرنا چھوڑ دیں۔اس کی جگہ شکریہ ادا کرنا یا احسان مندی کا اظہار کرنا ہی وہ طریقہ ہے جس سے آپ شکایتوں کے انبار لگانے سے بچ جائیں گے۔اگر دس فیصد بھی ہر بار دس فیصد بھی کم شکایت یا تنقید کریں تو پراگرس ہو رہی ہے۔اتمام کامیاب لوگ سکون میں رہتے ہیں۔جلدی میں نہیں ہوتے۔۔سکون کی حالت میں آپ اپنے خیالات کو سن سکتے ہیں۔آپ اپنے ذہن کی گہرائی میں جا سکتے ہیں اور توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔کچھ نہ کچھ فائدہ مند چیز کرتے رہیں تو دنیا آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھے گی۔فضول سوچ کر وقت ضائع نہ کریں آپ دیکھیں گے کہ دنیا آپ کو تنگ کرنا بند کر دے گی اور اس کی وقعت کم ہو جائے گی۔

جب مذہب زندگی میں پریکٹس ہوتا ہو، تو مذہبی طبقہ موجود نہیں رہ سکتا کیونکہ اس کی ضرورت نہیں رہتی جیسے مغربی ممالک میں ہے۔جب مذہبی طبقہ طاقتور ہو تو ان کی قہرمانی اور تنگ نظری سے دین کی اصل روح فنا ہو جاتی ہے اور وہ اللہ اور بندے کے درمیان رول یا کردار کا مطالبہ کرتے ہیں۔جس سے فکر و نظر کا انتشار پھیلتا ہے اور سکون غائب ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

ضمیمہ

امریکہ کے لاء کالج میں میثاقِ مدینہ پر سبق کی پلاننگ

The Constitution of Madinah and the Mayflower Compact - A Comparison

(Primary Source readings)

Overview: This lesson introduces students to the Constitution of Madinah, written in 622 CE and draws parallels with the Mayflower Compact of 1620 CE. Although these two documents are separated by a thousand years of history, they both represent religious communities establishing a charter for self-governance following an experience ofpersecution and migration to a new land.

Objectives: Students should be able to:describe the historical setting of the Constitution of Madinah and the Mayflower Compact.compare the purposes of the Constitution of Madinah and the Mayflower Compact.

Procedure:

1-Have students read about the Constitution of Madinah and the Mayflower Compact (Handouts 3:1a & 3:1b respectively) in groups. Then, on Handout 3:1c, have students use a two-column chart to answer the followinga)--questions concerning each document in the handout. b)--Who were the participants in the agreement? Describe them. c)--What was the

situation that brought about the need to create a pact?
d)--What solutions do each of the documents propose for living in peace together?

2--Have students compare their answers to the questions on both sides of the two-column sheet. Then, on a separate piece of paper, have students list similarities between the two documents and the situations that engendered them.

documents and the historical situations that brought them into being.3--Then have each student present their observations and create a master list of similarities between the two

مسلح افواج کے افسران کا عہدنامہ/حلف نامہ

Constitution Article 244 – Oath of Members of Armed Forces

In the name of Allah, the most Beneficent, the most Merciful.I, __________, do solemnly swear that I will bear true faith and allegiance to Pakistan and uphold the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan which embodies the will of the people, that I will not engage myself in any political activities whatsoever and that I will honestly and faithfully serve Pakistan in the Pakistan Army (or Navy or Air Force) as required by and under the law.[May Allah Almighty help and guide me (A'meen).]

صدرِ پاکستان کا حلف نامہ

Oath of the President of Pakistan, according to the Article 42 of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan.(In the name of Allah, the most Beneficent, the most Merciful.)

I, ____________, do solemnly swear that I am a Muslim and believe in the Unity and Oneness of Almighty Allah, the Books of Allah, the Holy Quran being the last of them, the Prophethood of Muhammad (peace be upon him) as the last of the Prophets and that there can be no Prophet after him, the Day of Judgment, and all the requirements and teachings of the Holy Quran and Sunnah:

That I will bear true faith and allegiance to Pakistan:

That, as President of Pakistan, I will discharge my duties, and perform my functions, honestly, to the best of my ability, faithfully in accordance with the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan and the law, and always in the interest of the sovereignty, integrity, solidarity, well- being and prosperity of Pakistan:

That I will not allow my personal interest to influence my official conduct or my official decisions:

That I will preserve, protect and defend the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan:

That, in all circumstances, I will do right to all manner of people, according to law, without fear or favor, affection or ill- will:And that I will not directly or indirectly communicate or reveal to any person any matter whichshall be brought under my consideration or shall become known to me as President of Pakistan, except as may be required for the due discharge of my duties as President.May Allah Almighty help and guide me (A'meen)

ریفرنس، حوالہ جات

۱۔ کلامِ پاک

۲۔ مطالعہ سیرت۔مولانا وحیدالدین خان، الرسالہ، دہلی (انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔)

۳۔ سیارہ ڈائجسٹ۔عکس سیرت نمبر۔کتاب۔" محمدﷺ ایسے پیغمبر ہیں جنہیں پہچاننے کی از سرنو کوشش کرنی چاہیئے۔مصنف:۔ مسٹر کونسٹن ورجیل چورجیو پبلشر:۔240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔(یہ کتاب انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔)

۴۔ حضرت بلالؓ۔ایم اے ایل گریک، کوارٹٹ بکس Quartet Book،۔لندن، (انٹرنیٹ پر دستیاب ہے)

۵۔ پیغمبر اعظم و آخر۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر۔فیروز سنز

۶۔ انسان کامل۔ڈاکٹر خالد علوی۔الفیصل لاہور

۶۔ فقہ الزکوٰۃ۔ڈاکٹر قرضاوی۔البدر پبلی کیشنز۔راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ یہ کتاب انگریزی میں انٹرنیٹ پر موجود ہے۔

مصنف کی دوسری کتابیں

اردو کتابیں (طبع شدہ)

۱۔ تحریری وصیت نامہ

۲۔ اصحاب فیل

۳۔ صدقۃ الفطر

۴۔ کتاب الزکوۃ پلاٹوں اور عماتوں کے کرایوں پر زکوۃ

۵۔ انسانی فطرت

باقی کتابیں اس ویب سائٹ www.askallah.com.pk پڑھ سکتے ہیں

اردو بکس: انٹرنیٹ پر ای بکس

۶۔ سیرت النبی پہلا حصہ
۷۔ سیرت النبی دوسرا حصہ
۸۔ سیرت النبی تیسرا حصہ
۹۔ سیرت رحمت للعالمین، اخلاقیات
۱۰۔ چالیس احادیث کا چناؤ
۱۱۔ کتاب الزکوۃ حصہ اول فلاسفی اور مقاصد
۱۲۔ درہم اور دینار سونے چاندی کا نصاب
۱۳۔ کتاب الزکوۃ جانوروں پر زکوہ
۱۴۔ کتاب الزکوۃ۔ زرعی نصاب
۱۵۔ کتاب الزکوہ۔ غنی کا تعین کیسے کریں گے
۱۶۔ کتاب الزکوۃ چھٹا حصہ
۱۷۔ کتاب الزکوۃ ساتواں حصہ
۱۸۔ کیا پاکستان میں اسلامی نظام آ سکتا ہے
۱۹۔ والدین کی اطاعت کا حکم ہے یا حسن سلوک کا
۲۰۔ کتاب زندگی
۲۱۔ ہجری کیلنڈر نہ ہونا مسئلہ ہے رویت ہلال مسئلہ نہیں
۲۲۔ سورہ طلاق آیت نمبر تین کی غلط تفسیر کی تصحیح
۲۳۔ تعلیم نسواں والدین کی ذمہ داری ہے کسی اور کی نہیں
۲۴۔ وراثت کے احکام
۲۵۔ اونچے عرض البلد پر روزہ رکھنے کی مشکلات اور ان کا حل
۲۶۔ کتاب زندگی حصہ دوم
۲۷۔ فیصلے کرنے کے اصول
۲۸۔ دیت
۲۹۔ حلالہ کی لعنتی پریکٹس اور اس کا حل
۳۰۔ خدا شناسی خود شناسی
۳۱۔ تصوف عام آدمی کے لیے

۳۲۔ مضامین پہلا حصہ
۳۳۔ مضامین دوسرا حصہ
۳۴۔ مضامین تیسرا حصہ
۳۵۔ مضامین چوتھا حصہ
۳۶۔ کیا کم عمر لڑکیوں کی شادی جائز ہے۔
۳۷۔ کیا کم سن لڑکی جماع کے قابل ہو سکتی ہے۔

ENGLISH BOOKS

1- Mary and Jesus Christ
2- Zakat on Livestock
3- Slat Prayer
4- Quran -Understanding made easy ; 9 volumes
5- Fasting at High Latitudes
6- Satan
7- All Prophets Were Muslims
8- Allah- Who is He- How can we recognize Him
9. Hazrat Ibrahim
10- Prophet Adam
11- Creation of Heavens and Earth
12- Day of Judgement
13- Holy Prophet Muhammad
14- Jews and Christians